فہرست مضامین سرمایۂ اُردو

حصۂ نظم

تذکرۂ مصنّفین

(۱) نثر نگار

(۲) شعرا

حصّۂ نثر

از باغ و بہار میر امّن دہلوی

خواجہ سگ پرست کی کہانی

خواجہ نے کہا۔ اے بادشاہ! یہ مرد جو داہنی طرف ہے۔ غلام کا بڑا بھائی ہے۔ اور جو بائیں کو کھڑا ہے۔ منجھلا برادر ہے۔ مَیں ان دونوں سے چھوٹا ہوں۔ میرا باپ ملک فارس میں سوداگر تھا۔ جب مَیں چودہ برس کا ہوا قبلہ گاہ نے رحلت کی۔ جب تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی۔ اور پھول اُٹھ چکے۔ ایک روز ان دونوں بھائیوں نے مجھے کہا۔ کہ اب باپ کا مال جو کچھ ہے تقسیم کر لیں۔ جس کا دل جو چاہے سو کرے۔ مَیں نے سُن کر کہا۔ اے بھائیو! یہ کیا بات ہے؟ مَیں تمہارا غلام ہوں۔ بھائی چارے کا دعویٰ نہیں رکھتا۔ ایک باپ مر گیا۔ تُم دونوں میرے پدر کی جگہ میرے سر پر قائم ہو۔ ایک نان خشک چاہتا ہوں جس میں زندگی بسر کروں۔ اور تمہاری خدمت میں حاضر رہوں۔ مجھے حصّے بخرے سے کیا کام ہے؟ تمہارے آگے کے جھوٹے سے اپنا پیٹ بھر لُونگا۔ اور تمہارے پاس رہونگا۔ مَیں لڑکا ہوں۔ کچھ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ مجھ سے کیا ہو سکے گا۔ ابھی تُم مجھے تربیت کرو۔

یہ سُن کر جواب دیا کہ تو چاہتا ہے۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی خراب اور محتاج کرے۔ مَیں چپکا ایک گوشے میں جا کر رونے لگا۔ پھر دل کو سمجھایا کہ بھائی آخر بزرگ ہیں۔ میری تعلیم کی خاطر چشم نمائی کرتے ہیں۔ کہ کچھ سیکھے۔ اسی فکر میں سو گیا۔ صبح کو ایک پیادہ قاضی کا آیا اور مجھے دارالشرع میں لے گیا۔ وہاں دیکھا تو یہی دونوں بھائی حاضر ہیں۔ قاضی نے کہا۔ کیوں اپنے باپ کا ورثہ بانٹ چونٹ نہیں لیتا؟ مَیں نے گھر میں جو کہا تھا۔ وہاں بھی جواب دیا۔ بھائیوں نے کہا۔ اگر یہ بات اپنے دل سے کہتا ہے تو ہمیں لا دعویٰ لکھ دے کہ باپ کے مال و اسباب

سے مجھے کچھ علاقہ نہیں۔ تب بھی مَیں نے یہی سمجھا کہ یہ دونوں میرے بزرگ ہیں
میری نصیحت کے واسطے کہتے ہیں کہ باپ کا مال لے کر بیجا تصرّف نہ کرے۔
بہرجب ان کی مرضی کے فارغ خطی بہ مُہر قاضی میں نے لکھ دی۔ یہ راضی ہوئے۔
مَیں گھر آیا۔ دوسرے دن مجھ سے کہنے لگے۔ اے بھائی! یہ مکان جس میں تو
رہتا ہے ہمیں درکار ہے۔ تُو اپنی بود و باش کی خاطر اور جگہ لے کر جا رہ۔ تب
میں نے دریافت کیا کہ یہ باپ کی حویلی میں بھی رہنے سے خوش نہیں۔ لاچار
ارادہ اُٹھ جانے کا کیا۔ جہاں پناہ! جب میرا باپ جیتا تھا۔ تو جس وقت سفر سے
آتا۔ ہر ایک ملک کا تحفہ بطریق سوغات کے لاتا اور مجھے دیتا۔ اس واسطے کہ
چھوٹے بیٹے کو ہر کوئی زیادہ پیار کرتا ہے۔ مَیں نے ان کو بیچ بیچ کر تھوڑی سی
اپنی بچ کی پونجی بہم پہنچائی تھی۔ اسی سے کچھ خرید فروخت کرتا۔ ایک بار لونڈی
میری خاطر ترکستان سے میرا باپ لایا۔ ایک دفعہ گھوڑے لے کر آیا۔ ان میں سے
ایک بچھیرا ناکندہ کہ ہونہار تھا۔ وہ بھی مجھے دیا۔ میں اپنے پاس سے دانہ گھاس
اس کا کرتا تھا۔

آخر ان کی بے مروّتی دیکھ کر ایک حویلی خرید کی۔ وہاں جا رہا۔ یہ کتّا
میرے ساتھ چلا آیا۔ واسطے ضروریات کے اسباب خانہ داری کا جمع کیا
دو غلام خدمت کی خاطر مول لئے اور باقی پونجی سے ایک دُکان بزّازی
کر کے خدا کے توکّل پر بیٹھا اپنی قسمت پر راضی تھا۔ اگرچہ بھائیوں نے بدی
کی۔ پر خدا جو مہربان ہوا۔ تین برس کے عرصے میں ایسی دُکان جمی کہ میں
صاحب اعتبار ہوا۔ سب سرکاروں میں جو تحفہ چاہتا۔ میری ہی دُکان سے جاتا۔
اس میں بہت سے روپے کمائے۔ اور نہایت فراغت سے گذرنے لگی۔

اتفاقاً جُمعے کے روز مَیں اپنے گھر بیٹھا تھا کہ ایک غلام میرا سودا
سلف کو بازار گیا تھا۔ بعد ایک دم کے روتا ہوا آیا۔ میں نے سبب پوچھا
تجھے کیا ہوا؟ خفا ہو کر بولا کہ تمہیں کیا کام ہے؟ تم خوشی مناؤ۔ لیکن
قیامت میں کیا جواب دو گے؟ میں نے کہا۔ اے حبشی! ایسی کیا بلا تجھ پر
نازل ہوئی؟ اس نے کہا یہ غضب ہے کہ تمہارے بڑے بھائیوں کی چوک سے
پڑا ہے میں ایک یہودی نے مشکیں باندھی ہیں۔ اور قمچیاں مارتا ہے۔ اور
سنتا ہے کہ اگر میرے روپے نہ دو گے تو مارتے مارتے مار ہی ڈالوں گا۔

بھلا ب نو ہوگا۔ پس تمہارے بھائیوں کی یہ نوبت اور تم بے فکر ہو۔ یہ
با۔ ں ہے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ یہ بات غلام سے سُنتے ہی لہو نے جوش
ہو ننگے پاؤں بازار کی طرف دَوڑا۔۔ اور غلاموں کو کہا۔ جلد روپے لے کر
آؤ۔ نہیں وہاں گیا۔ دیکھا تو جو کچھ غلام نے کہا تھا سچ ہے۔ ان پر مار
پڑ ، ہے۔ حاکم کے پیادوں کو کہا۔ واسطے خُدا کے ذرا رہ جاؤ۔ میں
سے پُوچھوں کہ ایسی کیا تقصیر کی ہے۔ جس کے بدلے یہ تعزیر کی ہے؟
یہ کہ کر میں یہودی کے نزدیک گیا۔ اور کہا۔ آج روزِ آدینہ ہے۔
کیوں ضربِ شلّاق کر رہا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ اگر حمایت کرتے
ہو پُوری کرو۔ ان کے عوض روپے حوالے کرو۔ نہیں تو اپنے گھر کی
۔ میں نے کہا۔ کیسے روپے؟ دست آویز نکال میں روپے گن دیتا
ن نے کہا۔ تمسک حاکم کے پاس دے آیا ہوں اس میں میرے
م دو بدرے روپے لے کر آئے۔ ہزار روپے میں نے یہودی
د اور بھائیوں کو چھڑایا۔ اِن کی یہ صُورت ہو رہی تھی کہ بدن سے
بھوکے پیاسے۔ اپنے ہمراہ گھر میں لایا۔ اور وونہیں حمّام میں
ن پوشاک پہنائی۔ کھانا کھلایا۔ ہرگز ان سے یہ نہ کہا کہ اتنا مال
باپ نے کیا کیا؟ شاید شرمندہ ہوں ؛
ے بادشاہ! یہ دونوں موجود ہیں۔ پُوچھئے! سچ کہتا ہوں یا کوئی
بات جھوٹ بھی ہے؟ خیر۔ جب کئی دِن میں مار کی کوفت سے بحال
ہُ۔ ایک روز میں نے کہا۔ اے بھائیو! اب اس شہر میں تم بے اعتبار
ہو۔ بہتر یہ ہے کہ چند روز سفر کرو۔ یہ سُن کر چُپ ہو رہے۔
ر معلوم کیا کہ راضی ہیں۔ سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بار پرتل
ر اور سواری کی فکر کر کے بیس ہزار روپے کی جنس تجارت کی
ایک قافلہ سوداگروں کا بخارا کو جاتا تھا۔ اُن کے ساتھ کر دیا؛
بعد ایک سال کے وہ کاروان پھر آیا۔ ان کی خیر خبر کچھ نہ پائی۔
ایک آشنا سے قسمیں دے کر پُوچھا۔ اُس نے کہا۔ جب بخارا میں
کے۔ ایک نے جُوئے خانے میں اپنا تمام مال ہار دیا۔ اب وہاں کی
جاروب کشی کرتا ہے۔ اور پھڑ کو لیپتا پوتتا ہے۔ جُواری جو جمع ہوتے ہیں

ہے۔۔

ہیں۔ اُن کی خدمت کرتا ہے۔ وے بطریق خیرات کے کچھ دیتے ہیں۔ وہاں گرگا بنا پڑا رہتا ہے۔ اور دوسرا بوزہ فروش کی لڑکی پر عاشق ہو اپنا سارا مال صرف کیا۔ اب وہ بوزے خانے کی ٹہل کیا کرتا ہے۔ قاصد کے آدمی اس لئے نہیں کہتے کہ تو شرمندہ ہوگا ؛

یہ احوال اس شخص سے سُن کر میری عجب حالت ہوئی۔ مارے [illegible] کے نیند بھوک جاتی رہی۔ زاد راہ لے کر قصد بخارا کا کیا جب وہاں پہنچا۔ دونوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے مکان میں لایا۔ غسل کروا کر نئی پوشاک پہنائی۔ اور ان کی خجالت کے ڈر سے ایک بات مُنہ پر نہ رکھی۔ پھر مال سوداگری کا ان کے واسطے خریدا۔ اور ارادہ گھر کا کیا۔ جب نزدیک نیشاپور کے آیا۔ ایک گاؤں میں بمع مال و اسباب ان کو چھوڑ کر گھر میں آیا۔ اس لئے کہ میرے آنے کی کسو کو خبر نہ ہو۔ بعد دو دن کے مشہور کیا کہ میرے بھائی سفر سے آئے ہیں۔ کل ان کے استقبال کی خاطر جاؤں گا۔ صبح کو کہ جاؤں۔ ایک گرہست اسی موضع کا میرے پاس آیا اور فریاد کرنے لگا میں اس کی آواز سُن کر باہر نکلا۔ اُسے روتا دیکھ کر پوچھا کہ کیوں زاری کرتا ہے؟ وہ بولا۔ تمہارے بھائیوں کے سبب سے ہمارے گھر لوٹے گئے کاشکے! اُن کو تم وہاں نہ چھوڑ آتے ؛

میں نے پوچھا کیا مصیبت گذری؟ بولا کہ رات کو ڈاکا آیا۔ اُن کا مال و اسباب لوٹا اور ہمارے گھر بھی لوٹ لئے گئے۔ میں نے افسوس کیا اور پوچھا کہ اب وے دونوں کہاں ہیں؟ کہا شہر کے باہر ننگے ننگے خراب خستہ بیٹھے ہیں۔ وونہیں دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ لے کر گیا۔ پہنا کر گھر میں لایا۔ لوگ سُن کر اُن کو دیکھنے کو آتے تھے اور یہ مارے شرمندگی کے باہر نہ نکلتے تھے۔ تین مہینے اسی طرح گذرے۔ تب میں نے اپنے دل میں غور کی کہ کب تک یہ کونے میں دبکے بیٹھے رہیں گے تو ان کو اپنے ساتھ سفر میں لے جاؤں ؛

بھائیوں سے کہا۔ اگر فرمائیے۔ تو یہ فدوی آپ کے ساتھ چلے خاموش رہے۔ پھر لوازمہ سفر کا اور جنس سوداگری کی تیار کرکے چلا ان کو ساتھ لیا جس وقت مال کی زکوٰۃ دے کر اسباب کشتی پر چڑھایا

اور لنگر اُٹھایا۔ ناؤ چلی۔ یہ کُتّا کنارے پر سو رہا تھا۔ جب چونکا اور جہاز کو منجھدھار میں دیکھا۔ حیران ہو کر بھونکا۔ اور دریا میں کود پڑا۔ اور پیرنے لگا۔ مَیں نے ایک پنسوئی دَوڑا دی۔ بارے سگ کو لے کر کشتی پر پہنچایا۔ ایک مہینا خیر و عافیت سے دریا میں گذرا۔ کہیں منجھلا بھائی دن بڑے بھائی سے کہنے لگا۔ چھوٹے بھائی کی منّت اُٹھانے سے ... شرمندگی حاصل ہوئی۔ اس کا تدارک کیا کریں؟ بڑے نے جواب دیا کہ ایک صلاح دل میں ٹھیرائی ہے۔ اگر بن آوے تو بڑی بات ہے۔ آخر دونوں نے مصلحت کر کے تجویز کی کہ اسے مار ڈالیں۔ اور سارے مال و اسباب پر قابض و متصرّف ہوں ؛

ایک دن مَیں جہاز کی کوٹھڑی میں سوتا تھا کہ منجھلا بھائی آیا اور جلدی سے مجھے جگایا۔ میں ہڑبڑا کر چونکا اور باہر نکلا۔ یہ کُتّا بھی میرے ساتھ ہو لیا۔ دیکھوں تو بڑا بھائی جہاز کی باڑ پر ہاتھ ٹیکے نہوڑا ہوا تماشا دریا کا دیکھ رہا ہے۔ اور مجھے پکارتا ہے۔ مَیں نے پاس جا کر کہا۔ خیر تو ہے؟ بولا۔ عجب طرح کا تماشا ہو رہا ہے کہ دریائی آدمی موتی کی سیپیاں اور مونگے کے درخت ہاتھ میں لئے ہوئے ناچتے ہیں۔ اگر اور کوئی ایسی بات خلاف قیاس کہتا۔ تو مَیں نہ مانتا۔ بڑے بھائی کے کہنے کو راست جانا۔ دیکھنے کو سر جھکایا۔ ہر چند نگاہ کی۔ کچھ نظر نہ آیا۔ اور وہ یہی کہتا رہا۔ اب دیکھا؟ لیکن کچھ ہو تو دیکھوں۔ اس میں مجھے غافل پا کر منجھلے نے اچانک پیچھے آکر ایسا دھکیلا کہ بے اختیار پانی میں گر پڑا۔ اور وے رونے دھونے لگے کہ دوڑیو! ہمارا بھائی دریا میں ڈوبا ؛

اتنے میں ناؤ بڑھ گئی اور دریا کی لہر مجھے کہیں سے کہیں لے گئی۔ غوطے پر غوطے کھاتا رہا۔ اور موجوں میں چلا جاتا تھا۔ آخر تھک گیا۔ خدا کو یاد کرتا تھا۔ کچھ بس نہ چلتا تھا۔ ایک بارگی کسی چیز پر ہاتھ پڑا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو یہی کُتّا ہے۔ شاید جس دم مجھے دریا میں ڈالا میرے ساتھ یہ بھی کودا اور پیرتا ہوا میرے ساتھ لپٹا چلا جاتا تھا۔ مَیں نے اُس کی دُم پکڑ لی۔ اس نے ... کو میری زندگی کا سبب کیا۔ سات دن اور رات یہی صورت گذری۔ آٹھویں دن کنارے جا لگے۔ طاقت مطلق نہ تھی۔ لیٹے لیٹے کروٹیں لے کر جوں توں اپنے تئیں خشکی میں ڈالا۔ ایک دن بیہوش پڑا تھا۔ دوسرے ..

کُتّے کی آواز کان میں گئی۔ ہوش میں آیا۔ خُدا کا شُکر بجا لایا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور سے سواد شہر کا نظر آیا۔ لیکن قوّت کہاں کہ ارادہ کروں۔ لاچار دو قدم چلتا پھر بیٹھتا۔ اسی حالت سے شام تک کوس بھر راہ کاٹی۔ بیچ میں ایک پہاڑ ملا۔ رات کو وہاں گر رہا۔ صبح کو شہر میں داخل ہوا۔ جب بازار میں گیا۔ نانبائی اور حلوائیوں کی دُکانیں نظر آئیں۔ دل ترسنے لگا۔ نہ پاس پیسا جو خرید کروں۔ نہ جی چاہے کہ مُفت مانگوں۔ اسی طرح اپنے دل کو تسلّی دیتا ہوا کہ اگلی دُکان سے لُونگا۔ چلا جاتا تھا۔ آخر طاقت نہ رہی اور پیٹ میں آگ لگی۔ نزدیک تھا کہ روح بدن سے نکلے۔ ناگاہ دو جوانوں کو دیکھا کہ لباس عجم کا پہنے اور ہاتھ پکڑے چلے آتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر خوش ہوا کہ یہ اپنے مُلک کے انسان ہیں۔ شاید آشنا صُورت ہوں۔ ان سے اپنا احوال کہوں گا۔ جب نزدیک آئے تو میرے دونوں برادرِ حقیقی تھے۔ دیکھ کر نہبت شاد ہُوا۔ شُکر خدا کا کیا کہ خدا نے آبرو رکھ لی۔ غیر کے آگے ہاتھ نہ پسارا۔ نزدیک جا کر سلام کیا اور بڑے بھائی کا ہاتھ چُوما۔ اُنہوں نے مجھے دیکھتے ہی غل و شور کیا۔ منجھلے بھائی نے طمانچہ مارا کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔ بڑے بھائی کا دامن پکڑا کہ شاید یہ حمایت کریگا۔ اس نے بھی لات ماری۔ غرض دونوں نے مجھے خوب غور و خام کیا۔ اور حضرت یوسف کے بھائیوں کا سا کام کیا۔ ہر چند میں نے خدا کے واسطے دیئے اور گِھگیایا۔ ہرگز رحم نہ کھایا۔ ایک خلقت اکٹّھی ہوئی۔ سب نے پُوچھا اس کا کیا گناہ ہے؟ تب بھائیوں نے کہا کہ یہ کم بخت ہمارے بھائی کا نوکر تھا۔ سو اُس کو دریا میں ڈال دیا۔ اور مال اسباب لے لیا۔ ہم مُدّت سے تلاش میں تھے۔ آج اس صورت سے نظر آیا۔ اور مجھ سے پوچھتے تھے کہ اے ظالم! یہ کیا تیرے جی میں آیا کہ ہمارے بھائی کو مار کھپایا؟ کیا اُس نے تیری تقصیر کی تھی؟ یا تجھ سے کیا بُرا سلوک کیا تھا کہ اپنا مختار بنایا تھا؟ پھر ان دونوں نے اپنے گریبان چاک کر ڈالے اور بے اختیار جھُوٹھ مُوٹھ بھائی کی طرح روتے تھے۔ اور لات مُکّی مجھ پر کرتے تھے ؛

اس میں حاکم کے پیادے آئے۔ اُن کو ڈانٹا کہ کیوں مارتے ہو؟ میرا ہاتھ پکڑ کر کوتوال کے پاس لے گئے۔ یہ دونوں بھی ساتھ چلے۔ اور اس سے بھی یہی کہا۔ اور بطور رشوت کے کچھ دے کر اپنا انصاف چاہا۔ اور

ناحق کا دعوے کیا۔ حاکم نے مجھ سے پوچھا۔ میری یہ حالت تھی کو مارے بھوک اور مار پیٹ کے طاقت گویائی کی نہ تھی۔ سر نیچے کیئے کھڑا تھا۔ کچھ منہ سے جواب نہ نکلا۔ حاکم کو بھی یقین ہؤا کہ یہ مقرر خونی ہے۔ فرمایا کہ اسے میدان میں لے جا کر سولی دو۔ جہاں پناہ! میں نے روپے دے کر ان کو یہودی کی قید سے چھڑایا تھا۔ اس کے عوض انہوں نے بھی روپے خرچ کر کے میری جان کا قصد کیا۔ یہ دونوں اضر ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ میں اس میں سر مو تفاوت کہتا ہوں۔ خیر مجھے لے گئے۔ جب دار کو دیکھا۔ ہاتھ زندگی سے دھویا۔

سوائے اس کتے کے کوئی میرا رونے والا نہ تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک آدمی کے پاؤں میں لوٹتا اور چلاتا تھا۔ کوئی لکڑی کوئی پتھر سے مارتا۔ لیکن یہ اس جگہ سے نہ سرکتا۔ اور میں رو بقبلہ کھڑا ہو خدا کو کہتا تھا کہ اس وقت میں تیری ذات کے سوا میرا کوئی نہیں۔ جو آڑے آوے اور بے گناہ کو بچاوے۔ اب تو ہی بچاوے تو بچتا ہوں یہ کہ کر کلمہ شہادت کا پڑھ کر تیورا کر گر پڑا۔

خدا کی حکمت سے اس شہر کے بادشاہ کو قُلنج کی بیماری ہوئی۔ مرا اور حکیم جمع ہوئے۔ جو علاج کرتے تھے۔ فائدہ مند نہ ہوتا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا کہ سب سے بہتر یہ دوا ہے کہ محتاجوں کو خیرات کرو۔ اور بندیوں کو آزاد کرو۔ دوا سے دعا میں بڑ ہے۔ وُوہیں بادشاہی چیلے بندی خانوں کی طرف دوڑے۔

اتفاقاً ایک اس میدان میں آ نکلا۔ اژدہام دیکھ کر معلوم کہ کسو کو سولی چڑھاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی گھوڑے کو دا کے نزدیک لا کر تلوار سے طنابیں کاٹ دیں۔ حاکم کے پیادوں ڈانٹا اور تنبیہ کی کہ ایسے وقت میں کہ بادشاہ کی یہ حالت ہے۔ تم خدا کے بندے کو قتل کرتے ہو! اور مجھے چھڑوا

از نیرنگ خیال شمس العلما مولینا محمد حسین آزاد

شہرتِ عام اور بقاے دوام کا دربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو! دیکھو اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حبّ الوطن کے شہید ہیں۔ جنہوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جاکر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں۔ جنہیں اسی ہاتفِ غیبی کا خطاب زیبا ہے۔ جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے۔ اور بے غیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں۔ جو بزمِ تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعثِ فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بناتے رہے۔ جس سے ملکِ فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح فی الحقیقت روح بعد مرنے کے رہ جائیگی کہ اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا۔ جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں۔ اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھّے سے اچھے اور بُرے سے بُرے کام جن جن سے ہوئے یا ثواب آخرت کے لئے یا دنیا کی نامورى اور شہرت کے لئے ہوئے۔ لیکن مَیں اس دربار میں انہیں لوگوں کو لاؤنگا۔ جنہوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزمہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور نامورى کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دُنیا کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے۔ ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔ مگر بڑا فکر یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ کیونکہ جن بچاروں نے ساری جاں فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا۔ ان کے حصہ میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چنانچہ اکثروں کا نہایت

احسانمند ہوں کہ اُنہوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی۔ اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلے میں گزری۔ ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ اُنہوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اسی عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں۔ اس لئے عرض کرتا ہوں:

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدان وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں۔ جس کی وسعت اور دلفزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انہیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے۔ نہ قلم تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اس میں جمع ہیں۔ وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے۔ جس کی چوٹی گوش سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو ایسے سرپھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرت انسان کے ناخن تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ میرے دوستو! اس رستے کی دشواریوں کو سرپھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ مگر بڑی نامنصفی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرلے۔ تو ان بلاؤں کو جھیلے۔ جن پر وہ مصیبتیں گزرتی ہیں وہی جانیں:

یکایک قلۂ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دل کش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی۔ جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجب بات تھی کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے۔ جن کے کان اس کے سُننے کی قابلیت اور اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے:

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا۔ اور وہ تعجب فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی۔ تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوبصورت خوبصورت عورتیں ہیں۔ اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو

ہو رہے ہیں - یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں - مگر یہ بھی وہیں چرچا سُنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں - نہ پری نژاد عورتیں ہیں - کوئی ان میں غفلت کوئی عیاشی ہے - کوئی خود پسندی کوئی بے پروائی ہے - جب کوئی ہمّت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے - تو یہ ضرور ملتی ہیں - انہی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں - ان پر درختوں کے جُھنڈ سایہ کئے تھے - رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے - گوناگوں کے میوے جھوم رہے تھے - طرح طرح کے جانور بول رہے تھے - نیچے قدرتی نہریں اُوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں - وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں - اور آپس میں چھینٹے لڑ رہی تھیں - مگر ایسے ایسے اُلجھاوے بلندئ کوہ کے اِدھر ہی اِدھر تھے - یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں - وہ اگرچہ اقوام مختلفہ - عہد ہائے متفرقہ - عمر ہائے متفاوتہ رکھتے ہیں - مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے - ہمّت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں ؛

نہکہ دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ - صاحب ہمّت - عالی طبیعت تھے - وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندئ کوہ پر متوجہ ہوئے - جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے - اُسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی تھی - مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندئ کوہ پر چڑھ جائیں اور جس طرح ہو سکے پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوّتِ رُوحانی حاصل کریں - چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے - معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں - سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا - کسی کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی - ایک کے ہاتھ میں نشان تھا - کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزاء تھے - کسی کی بغل میں ایک کمپاس تھی - کوئی پنسلیں لئے تھا - کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا - بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا - بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا - غرض کہ علم ریاضی اور جرِثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا - جو اس وقت کام میں نہ آ رہا ہو - اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی

اس طرح تسلّی و تشفی دیتا تھا۔ کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا۔ جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوانِ عالی شان دکھائی دیا۔ کہ اس کے چاروں طرف پھاٹک تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کُرسی پر بیٹھی ہے۔ اور وہی شہنائی بجا رہی ہے۔ جس کے بیٹھے بیٹھے سروں نے ان مشاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مُسکراتی تھی۔ اور سروں سے اب ایسی صدا آتی تھی۔ گویا آنے والوں کو آفرین و شاباش دیتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ خیر مقدم! خیر مقدم! خوش آمدید! صفا آوردید! اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مؤرخوں کا گروہ ایک دروازے پر ایستادہ ہوا تاکہ صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکایک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز و جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے۔ اب اس سے ظفریابی اور مبارک بادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اُٹھا اور دروازے خود بخود کُھل گئے ؂

جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی راجوں کا مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کئے ہے۔ سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اس کی حقداری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سائے میں لئے آتے ہیں۔ فرقے فرقے کے علما اور مؤرخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے اور وہ بھی بتانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کہن سالہ رنگت کا کالا ایک پوتھی بغل میں لئے ہندوؤں کے غول سے نکلا۔ اور بہ آوازِ بلند چلّایا کہ آنکھوں والو! کچھ خبر ہے؟ دیکھو دیکھو۔ ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو۔ اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزرانی۔ اس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو معلوم ہوا کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن

تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا۔ اس وقت ایک بمان یعنی تخت ہوادار آیا وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اُڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ رامچندر جی ہیں اور یہ والمیک ہے۔ جس نے رامائن نذر دی ہے ؎

سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو بتّیس پریاں اڑائے لئے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے۔ مگر نہایت دیرینہ سال۔ اتنے فرقے فرقے کے علما اور مؤرخ لینے کو نکلے۔ مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بیقراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے۔ اور تخت سنگھاسن بتّیسی۔ پریاں اتنی بات کہ کر ہوا ہو گئیں۔ کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے۔ نہ آپ کا سنہ ہٹے گا۔ نہ سکّہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی۔ اور انہیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا ؎

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل و قال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے۔ اور ارکین دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گزر نہیں۔ اتنے میں وہی بتّیس پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا۔ ایک پنڈت آیا۔ دونوں نے ہاتھ اُٹھا کر اشیرباد کہی۔ اور بقاے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے۔ اور بتّیس پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتّیسی تھی۔ جو اُن کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالیداس شاعر تھا جس نے اُن کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔ اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش و فروش جھاڑ و فانوس سے بقعۂ نور بنا ہے۔ ایک جوان پیل پیکر ہاتھ میں گرز گاؤ سر نشۂ شجاعت میں مست جھومتا

جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے۔ ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔گرد اس کے شاہان کیانی اور پہلوان ایرانی موجود ہیں کہ درفش کاویانی کے سایۂ بے زوال میں چلے آتے ہیں۔ حُبّ قوم اور حُبّ وطن اس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔اس کی آنکھوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا۔اور سر پر کلّۂ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔مورّخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔سب نے اسے بچشم تعظیم دیکھا۔انہی میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے۔وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پہ اُٹھائے کھڑے تھے۔پھر پیر مرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجّہ ہو کر چند اشعار نہایت زور کے پڑھے۔نہیں بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحۂ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اُٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔اور گُلِ فردوس کا ایک طرّہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ الٰہی! یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے۔ تمام اہلِ محفل نے آمین کہی۔ معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی شیر سیستانی رستم پہلوان ہے۔ اور کہن سال مایوس فردوسی ہے۔ جو شاہنامہ لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا۔جس کا حُسن شباب نوخیز اور بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔سر پر تاج شاہی تھا۔مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ساتھ اس کے حکمتِ یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔میں نے لوگوں سے پوچھا۔ مگر سب اُسے دیکھ کر ایسے محو ہوئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔بہت سے مؤرّخ اور محقّق اس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔وہ اُس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لئے تیار ہوا تھا۔چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا۔ایک انبوہِ کثیر کو چیر کر نکلا۔وہ کوئی یونانی مورّخ تھا۔اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتۂ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آ جاؤ۔ کہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔یہ سکندر یونانی

ہے۔ جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیئے ہیں ؛

اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اس پر درفش کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا۔ کہ گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا۔ اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا۔ سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا۔ اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر زیادہ تنظیم کرتا تھا۔ اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی۔ وہ دارا بادشاہ ایران تھا؛

دفعتہً سکندر نے آواز دی انہیں لاؤ۔ جو شخص داخل ہوا۔ وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا۔ سکندر خود اٹھا اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا۔ اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرہ اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں۔ اور اس سہرے پر خمسے کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا۔ اب یہ کبھی نہ کملائیں گے ؛

بعد اس کے جو شخص آیا۔ اگرچہ وہ سادہ وضع تھا۔ مگر قیافہ روشن اور چہرہ ذہنیت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آ چکے تھے۔ اُن سب سے زیادہ عالی رتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا۔ اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا۔ مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقیٔ زبردست نے کچھ شوخی اور سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے۔ اور یہ کہہ کر اوّل سکندر کو آئینہ دکھایا۔ پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا ؛

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جُبّہ و عمامہ اور

طبل و دمامہ رکھتے تھے۔ مگر روکے گئے۔ کیونکہ ہر چند اُن کے جبّے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ انبوہِ کثیر علما و فضلا کا ہو لیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے ان کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لئے اشیرباد کہتے تھے۔ پہلا بادشاہ اُن میں ہارون الرشید اور دوسرا مامون الرشید تھا۔

تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے قلمکار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ ناواقف تھا۔ اس لئے کچھ زیور ہاتھ میں لئے تھا۔ کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے۔ مگر جہاں قدم رکھتا تھا بجائے غبار کے آہوں کے ساتھ دھوئیں اُٹھتے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے۔ مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکرگذاری سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے۔ مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جُھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مُسکرایا اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔

اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا۔ مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے داخل ہوتے پر شعرا تو الگ ہو گئے۔ مگر تمام علما اور فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی۔ اُس پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بوعلی سینا تھا۔

ایک انبوہِ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے۔ مگر انداز ہر ایک کے جُدا جُدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معنی و مضامین کے مُصوّر ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں آخر یہ جواب ملا کہ تم مُصوّر بیشک اچھے ہو۔ مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے

مُصوّر ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیّت اور واقعیّت کا رنگ نہیں۔ البتّہ انتخاب ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ انوری خاقانی ظہیر فاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان میں قلم دھرا تھا۔ اس میں سے آبِ حیات کی بُوندیں ٹپکتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لئے اس پر پھر تکرار ہوئی۔ اس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے اعدا کے لئے تلوار دی ہے۔ ملکِ مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بُوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں۔ تو اعدائے بدنہاد ہمارے خُونِ عزت کے بہانے سے کب چوکیں۔ چنانچہ یہ عذر اس کا قبول ہوا۔ یہ انوری تھا۔ جو باوجود گل فشانیٔ فصاحت کے بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا۔ کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔

خاقانی پر اس معاملے میں اس کے اُستاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چونکہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی۔ اس لئے یہ بھی اس کی کُرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا۔

اسی عرصے میں چنگیز خاں آیا۔ اس کے لئے۔ گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا۔ بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشمِ حقارت سے دیکھ کر تبسّم کیا۔ البتّہ مورخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا۔ تو اس نے فوراً شمشیر جوہردار سند کے طور پر پیش کی۔ جس پر خونی حرفوں سے رقم تھا۔ "سلطنت میں میراث نہیں چلتی"۔ علما نے غُل مچایا کہ جس کے کپڑوں میں لہو کی بُو آئے۔ وہ قصّاب ہے۔ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا۔ کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوّرانِ تصانیف کی تحریر نے رنگِ بقا نہ ڈالا ہو۔ اسے اس دربار میں نہ آنے دینگے۔ اس بات پر اس نے بھی تامّل کیا۔ اور متاسّف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اُٹھاتا۔ اتنے میں چند مورّخ آگے بڑھے۔ انہوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں تورۂ چنگیز خانی یعنی اس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو۔ مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو۔ اور ایک

سیاہی کا داغ لگا دو ؛

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اُور آیا۔ اُس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اس کے لیئے چند علما نے بھی مؤرخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے۔ تو اس کے لیئے بھی تکراروں کا غل ہوا، چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ اس کی وضع متشرّع عالموں کی تھی۔ لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب۔ دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انہیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی محقق کو شیخ بوعلی سینا نے یہ کہ کر اپنے پاس بٹھا لیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقاے دوام کے آبدار موتی ٹانکے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں ؛

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مؤرخوں نے اس کے لانے کی اِلتجا کی۔ مگر وہ خود سب کو دروازے پر چھوڑ گیا۔ اور اپنا آپ رہبر ہوا۔ کیونکہ وہ خود مورّخ تھا۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر کھڑا ہوا۔ اور کہا۔ اے اہلِ تصنیف! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمہیں قلم تحریر دیا ہے۔ اُسے اظہارِ واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لئے کام میں لانا چاہیئے یا اغراضِ نفسانی اور بد زبانی میں؟ تمام مؤرخ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ تیمور نے ابن عرب شاہ کے بُلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا چنانچہ اس کا نام مصنّفوں کی فہرست سے نکالا گیا ؛

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آزاد وضع۔ قطع تعلّق کا لباس بر میں خاکساری کا عمامہ سر پر آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا مورّخ اور شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے پر آکر ٹھیرے۔ سب نے آگے بڑھنے کی التجا کی۔ تو کہا معذور رکھو۔ میرا ایسے مقاموں میں کیا کام ہے۔ اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے اگر تمام اہلِ دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی اُن کے ہاتھ میں تھا۔ کہ اس میں سے کسی کو دودھ۔ کسی کو شربت۔ کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔

ہر ایک کرسی نشین انہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے اور شیشۂ مینائی ان کا دیوان تھا۔ جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے کہ دُور سے دیکھا بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک پیر مرد نورانی صورت جس کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ سر پر آویزان کیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے۔ جو باہر استقبال کو کھڑے تھے۔ مگر انہیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیونکہ ایسا کون تھا۔ جو شیخ سعدی اور ان کی گلستان بوستان کو نہ جانتا تھا۔ انہوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھا۔ لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر ان سے واقف تھے اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے۔ باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے کہ دنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں ٭

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اُولوالعزم شخص آیا۔ جس کے چہرے سے خود سری کا رنگ چمکتا تھا۔ اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مار رہا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی۔ اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیئے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے سارے مورخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اس نے باوجود اس کے ایک کرسی جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا۔ گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اُسے دیکھ کر تھرّایا اور سر جھکا لیا۔ مگر تاج شاہی پہ انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا۔ اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلے گی اور فخر کرے گی٭

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا۔ جس کو انبوہِ کثیر ایرانی تورانی ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لئے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں اور رضامندی عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان

اس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت کے حروف لکھے تھے۔ اس نے اپنے بعض ہم قوموں اور مذہبوں کی شکایت کرکے بداؤنی پر خون کا دعوٰی کیا۔ کہ اس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا۔ اور وہ فتحیاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا۔ نیت کا پھل ہے ؛

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی۔ اور جدھر چاہتی تھی۔ پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اُس کے نور جمال سے دیکھتا تھا۔ اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لئے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھ کھلتی تھی۔ تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہان تھی ؛

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مورخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لئے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر جماعت اُن عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لئے تھے۔ جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں۔ اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضامندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچوں کو ساتھ لئے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعوٰی کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہجہان کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا۔ بلکہ خلق خدا کی امنیت اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اسے دربار میں جگہ ملی۔ اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجے پر ممتاز ہوا ؛

تھوڑی دیر کے بعد دُور سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ اور بعد اس کے

ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔مصنفوں اور مورخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویّا اور کوئی بھانڈ کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے۔ کیونکہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کئے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا۔ اور اسپ بخارائی زیر ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمدشاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے کہا۔ نکالو! نکالو! ان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کرکے تاج ہندوستان سر پہ رکھا تھا۔ اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی *

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوُا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مُرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے۔ اور وجد کرکے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص کہ جب تک بات کرتا تھا اس کے مُنہ سے رنگا رنگ کے پھُول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلاتے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پرگرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ میرزا رفیع سودا تھے *

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے۔ اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کئے دیتی تھی۔ میرحسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشا اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار مُتقی پرہیزگار۔ دم میں ڈاڑھی چٹ۔ بھنگ کا سونٹا کندھے پر *

جُرأت کو کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا۔ تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلمکاری اسی کی، عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش بیانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے مگر جب کبھی کچھ کہتے تھے۔ جُرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے *

ایک پیر مردِ دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس۔ جامہ پہنے۔ کھڑکی دار پگڑی باندھے جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان سے دست و گریباں ہو جاتے۔ لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بُڈھے میر امن دہلوی چار درویش کے مصنّف تھے۔ اور بانکے صاحب میرزا سرور فسانۂ عجائب والے تھے۔ **ذوق** کے آنے پر پسندِ عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ اُنہوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ **سودا** نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا **غالب** اگرچہ سب کے پیچھے تھے۔ پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے۔ اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گُنگ کر دئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔ اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے۔ اور بس۔ اتنے ہیں آواز آئی۔ کہ **آزاد** کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر وہاں سے پھر کوئی بولا کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دوگے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اُس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ اُسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے اس مقدّمے پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادئی ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چُپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھُل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کُرسی ملی یا نہ ملی۔ مُردوں سے زندوں میں تو آیا ؛

شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی

مقدمہ شعر و شاعری

محاورہ اور روزمرّہ

محاورہ لغت میں بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہل زبان کے روز مرّہ کے موافق ہو یا مخالف۔ لیکن اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرّہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیونکہ مفرد الفاظ کو روز مرہ بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفردِ الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بمنزلۂ مفرد کے ہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں۔ جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائیگا۔ بلکہ دونوں کو ملا کر جب پان سات بولینگے۔ تب محاورہ کہا جائیگا۔ یہ بھی ضرور ہے۔ کہ وہ ترکیب جس پر محاورے کا اطلاق کیا جائے قیاسی نہ ہو۔ بلکہ معلوم ہو کہ اہل زبان اس کو اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پان سات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائیگا۔ تو اس کو محاورہ نہیں کہنے کے۔ کیونکہ اہلِ زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بلا ناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ ہر روز کی جگہ ہر دن۔ روز بروز کی جگہ دن دن یا آئے دن کی جگہ آئے روز بولنا ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ الفاظ اس طرح اہلِ زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورے کا اطلاق خاص کر اُن افعال پر کیا جاتا ہے۔ جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اُتارنا اس کے حقیقی معنے کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو اُتارنا۔ کھونٹی سے کپڑا اُتارنا۔ کوٹھے پر سے پلنگ اتارنا لیکن ان میں سے کسی پر محاورے کے یہ دوسرے معنے صادق

نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوُا ہے۔ ہاں نقشہ اُتارنا۔ نقل اُتارنا۔ دِل سے اتارنا۔ ہاتھ اُتارنا۔ پہنچا اُتارنا۔ یہ سب محاورے کہلائیں گے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنے کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے یا مثلاً کھانا اِس کے حقیقی معنے کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اُتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا۔ دوا کھانا۔ افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوُا ہے۔ ہاں غم کھانا۔ قسم کھانا۔ دھوکا کھانا۔ پچھاڑیں کھانا۔ ٹھوکر کھانا یہ سب محاورہ کہلائینگے ؎

محاورے کے جو معنے ہم نے اوّل بیان کئے ہیں۔ وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں۔ لیکن دوسرے معنے پہلے معنے سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا۔ اُس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے۔ اُس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا کرنا) اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ترکیب اہلِ زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے اور نیز اس میں تین پانچ کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ لیکن روٹی کھانا یا میوہ کھانا۔ یا پان سات۔ یا دس بارہ وغیرہ صرف پہلے معنوں کے لحاظ سے۔ کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں۔ مگر ان میں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوُا۔ آئندہ ہم ان دونوں معنوں میں تمیز کے لئے پہلی قسم کے محاورے پر روز مرّہ کا اور دوسری قسم پر محاورے کا اطلاق کرینگے ؎

روز مرّہ اور محاورے میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے۔ روز مرّہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو۔ تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ کلام میں جس قدر کہ روز مرّہ کی پابندی کم ہوگی۔ اسی قدر وہ فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائیگا۔ مثلاً کلکتے سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر۔ ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا

آتا تھا۔ یہ جملہ روز مرہ کے موافق نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جگہ یوں ہونا چاہئے۔
کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا۔ اور
کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا یا مثلاً آج تک ان سے ملنے
کا موقع نہ ملا کی جگہ نہیں ملا چاہیئے یا وہ خاوند کے مرنے سے درگور ہوئی۔
یہاں زندہ درگور ہو گئی چاہیئے۔ یا ؎

سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہو گئیں

یہاں ہو گئیں کی جگہ ہوئیں چاہیئے۔ یا ؎

دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا۔

یہاں کیا ہو گیا چاہیئے ؛

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روز مرّہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو
نہایت ضروری ہے۔ مگر محاورے کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور
سے باندھا جائے۔ تو بلا شبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا
ہے۔ لیکن ہر شعر میں محاورہ باندھنا ضرور نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر
محاورے کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلےٰ درجے پر واقع ہو۔ اور ممکن
ہے کہ ایک پست اور ادنےٰ درجے کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و
پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

گوہرِ اشک سے لبریز ہے سارا دامن آج کل دامنِ دولت ہے ہمارا دامن

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا۔ باوجود اس کے شعر تعریف کے
قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے ؎

اس کا خط دیکھتے ہیں جب صیّاد طوطے ہاتھوں کے اُڑا کرتے ہیں

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے۔ صرف ایک محاورہ بندھا
ہوا ہے۔ اور وہ بھی روز مرّہ کے خلاف یعنی اُڑ جاتے ہیں کی جگہ اُڑا کرتے
ہیں۔ محاورے کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیئے۔ جیسے کوئی خوبصورت عضو بدنِ
انسان میں۔ اور روز مرّہ کو ایسا جاننا چاہیئے جیسے تناسبِ اعضا بدنِ
انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسبِ اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے
حُسنِ بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح بغیر روز مرّہ کی پابندی کے
محض محاورات کے جا و بے جا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں
ہو سکتی ؛

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کر سکتے ہیں۔ لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہل زبان کا حصّہ ہے۔ اہل زبان عموماً اُس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس میں روز مرّہ کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اور اگر روز مرّہ کے ساتھ محاورے کی چاشنی بھی ہو۔ تو وہ ان کو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے۔ مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ عوام محاورے یا روز مرّہ کے ہر شعر کو سُن کر سر دُھننے لگتے ہیں۔ اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور سبک ہو۔ اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ جب اُنہیں اسلوبوں میں وزن کی کھپاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں۔ اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوُا پاتے ہیں۔ تو ان کو ایک نوع کا تعجب اور تعجّب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خواص کی پسند اور تعجّب کے لئے صرف روز مرّہ وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہے ان کے نزدیک محض تُک بندی اور معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روز مرّہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہے۔ تو بلا شُبہ اُن کو بے انتہا تعجّب اور حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ فن شعر میں اور خاص کر اُردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روز مرّہ میں پُورا پُورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روز مرّہ کی پابندی کو سب چیزوں سے مقدّم سمجھا ہے۔ اُن کے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تو جا بجا فروگذاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روز مرّہ اور محاورے میں بھی پُورا اُتر جائے۔ تو لا محالہ اس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً میر انشاء اللہ خاں اس بات کو کہ افسردگی کے عالم میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یا مثلاً مرزا غالب اتنے بڑے مضمون کو کہ (مَیں معشوق کے مکان پر پہنچا۔ تو اوّل خاموش کھڑا رہا۔پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا۔جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا۔اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسبان کے قدموں پر گر پڑا۔اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے) دو مصرعوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم مَیں نے پاسباں کے لئے

یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں ؎

رونے سے اَور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھُپاتا ہے۔اُس کو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ رہتا ہے۔لیکن جب راز فاش ہو جاتا ہے تو پھر اُس کو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا۔اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے۔دھویا جانا بے حیا اور بے لحاظ ہو جانے کو کہتے اور پاک آزاد اور شُہدے کو کہتے ہیں۔رونے کے لئے دھویا جانا اور دھوئے جانے کے لئے پاک ہونا۔باوجود اتنی لفظی مناسبتوں اور محاورے کی نشست اور روز مرّہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہو گیا ہے اور کوئی بات اَن نیچرل نہیں ہے۔یا مثلاً مومن خان کہتے ہیں ؎

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چُرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

آنکھیں چُرانا اغماض و بے توجہی کرنا ہے۔کھویا جانا۔شرمندہ اور کھسیانا ہونا۔پا جانا۔سمجھ جانا یا تاڑ جانا۔معنی ظاہر ہیں۔اس شعر کا مضمون بھی بالکل نیچرل ہے۔اور محاورے کی نشست اور روز مرّہ کی صفائی قابلِ تعریف ہے۔اگرچہ اس کا ماخذ غالب کا یہ شعر ہے ؎

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مگر مومن کا بیان زیادہ صفائی سے بندھا ہے ؛

الغرض روز مرّہ کی پابندی تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے۔ نہایت ضروری چیز ہے اور محاورہ بھی بشرطیکہ سلیقہ سے باندھا جائے شعر کا زیور ہے۔

نیچرل شاعری

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت و عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو۔ جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روز مرّہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے۔ نیچر یا سیکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روز مرّہ سے بعید ہوگا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائیگا۔ معناً نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہؤا کرتی ہیں۔ یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا۔ وہ اَن نیچرل سمجھا جائیگا۔ مثلاً میر حسن دہلوی کے یہ اشعار ؎

کوئی رکھ کے زیرِ زنخداں چھڑی　　رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی اُنگلی کو دانتوں میں داب　　کسی نے کہا گھر ہؤا یہ خراب

ان دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائیگا۔ کیونکہ بیان بھی بول چال کے موافق ہے اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقعہ پر وہ لایا گیا ہے۔ وہاں ہمیشہ ایسا ہی ہؤا کرتا ہے۔ یا مثلاً ذوق کا یہ شعر ہے ؎

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل کے وقت اِنسان اپنے دل سے اسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے۔ مثلاً ظفر کا یہ شعر ہے ؎

تیرے رخسار و گیسو کو بتا تشبیہ دُوں کیونکر

نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سنبل میں بُو ایسی

اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ اور کوئی بُو معشوق کے رنگ و بُو سے بہتر یا اس کے برابر نہیں معلوم ہوتی یا مثلاً مومن خاں کا یہ شعر ہے ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھ جاتا ہے۔ اُس کا تصوّر تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً داغ کے کے یہ اشعار ہیں ؎

طبیعت کوئی دن میں بھر جائیگی　　چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائیگی

رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں　　یہ نیّت کوئی آج بھر جائیگی

ان دونوں شعروں کا مضمون گو ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتا ہے مگر دونوں اپنی اپنی جگہ نیچر کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا و ہوس کا بھوت بڑے زور شور کے ساتھ سر پر چڑھتا ہے مگر بہت جلد اُتر جاتا ہے۔ اور فی الواقع دُنیا کی خواہشوں سے کبھی نیّت سیر نہیں ہوتی۔ یا مثلاً غالب کا یہ شعر ہے ؎

رنج سے خوگر ہوُا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مُجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ شعر بھی نیچرل ہے اور فطرتِ انسان کی کسی قدر گہری اور پوشیدہ خاصیّت کا پتا دیتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کے بعد کوئی شخص اُس سے انکار نہیں کر سکتا ؛

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے۔ ایسے ہیں جن کو لفظاً اور معناً دونوں حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہیئے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے ہیں۔ جن کو لفظاً یا معناً یا دونوں حیثیتوں سے نیچرل نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً ناسخ کا یہ شعر ہے ؎

کبھی ہے دھیان عارض کا کبھی یادِ مژہ دل کو

کبھی ہیں خانہ پہلو میں کبھی گلزار پہلو میں

اس شعر کو لفظاً نیچرل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن معناً نہیں کہا جا

سکتا۔ معشوق کے تصوّر سے بلا شبہ عاشق کو فرحت بھی ہو سکتی ہے۔ اور رنج بھی۔ لیکن جب فرحت ہو تو عارض اور مژگان دونوں کے تصوّر سے فرحت ہونی چاہیئے۔ اور جب رنج ہو تو دونوں کے تصوّر سے رنج ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ پلکیں جو خار سے مشابہ ہیں۔ ان کے تصوّر سے پہلو میں خار ہوں اور عارض جو گل سے مشابہ ہے۔ اس کے تصوّر سے پہلو میں گلنار ہو۔ یا مثلاً غالب کا یہ شعر ہے ؎

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

جوہرِ اندیشہ میں کیسی ہی گرمی ہو۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس صحرانوردی کا خیال آنے سے خود صحرا جل اُٹھے۔ یا امیر مینائی کا یہ شعر ہے۔

؎ کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گل سے کوئی پھول
آتشِ گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ ہیں

نزاکت کسی درجے کی کیوں نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ آتشِ گل یعنی خود گل کے چھونے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں یا مثلاً ذوق کا یہ شعر ہے۔

؎ دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے پیدا وہاں شجر کافور کا

سرد مہری میں اتنی ٹھنڈک ہو سکتی ہے۔ جتنی کہ لفظ سرد میں پھر اس کے کشتے کی خاک میں اتنا اثر ہونا کہ اس سے شجر کافور پیدا ہو۔ محض الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ جن میں معنی کا بالکل نشان نہیں ؛

ہر زبان میں نیچرل شاعری ہمیشہ قدما کے حصّے میں رہی ہے۔ مگر قدما کے اوّل طبقے میں شاعری کو قبولیّت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ انہیں کا دوسرا طبقہ اس کو سڈول بناتا ہے۔ اور سانچے میں ڈھال کر اس کو خوشنما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ مگر اس کی نیچرل حالت کو اُس خوشنمائی اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ ان کے بعد متأخّرین کا دَور شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں رکھتے اور خیالات کے اُسی دائرے میں محدود رہتے ہیں۔ جو قدما نے ظاہر کیے تھے۔ اور نیچر کے اُس منظر سے جو قدما کے پیشِ نظر تھا آنکھ اُٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے۔

تاہم اُن کی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل حالت سے تنزل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہ راست سے بہت دُور جا پڑتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم۔ کچّے اور اکونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے۔ انہیں پانی میں اُبال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ اُنہوں نے اپنی معمولی غذا سے اسی کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی موقع تنوّع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹپٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے ؛

اسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دل نشیں کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ فارسی زبان میں جس پر اُردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جن لوگوں نے اوّل غزل لکھی ہوگی ضرور ہے کہ انہوں نے عشق و محبت کے اسباب اور دواعی محض نیچرل اور سیدھے سادے طور پر معشوق کی صورت، حسن و جمال۔ نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دیا ہوگا۔ ان کے بعد لوگوں نے انہیں باتوں کو مجاز اور استعارے کے پیرائے میں بیان کیا مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ یا ناز و ادا کو مجازاً تیغ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور اِس جدّت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و بامزہ ہو گیا۔ متاخرین جب اسی مضمون پر پل پڑے اور ان کو قدما کے استعارے سے بہتر کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا۔ اور جدّت پیدا کرنے کا خیال دامنگیر ہوا۔ اُنہوں نے تیغ و شمشیر کے مجازی معنوں سے قطع نظر کی اور اُس سے خاص سروہی یا اصیل تلوار مراد لینے لگے۔ جو قبضہ، باڑ، پیپلا، آب و تاب اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے میان میں رہتی ہے۔ گلے میں حمائل کی جاتی ہے۔ زخمی کرتی ہے۔ ٹکڑے اُڑاتی ہے سر اُتارتی ہے۔ خون بہاتی ہے۔ جو رنگ کاٹتی ہے۔ اس کی دھار تیز بھی ہو سکتی ہے۔ اور کند بھی۔ قاتل کا ہاتھ اس کے مارنے سے تھک سکتا ہے۔ وہ قاتل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے۔ اس کے مقتول کا مقدمہ عدالت میں دائر ہو سکتا

ہے۔اس کا قصاص لیا جا سکتا ہے۔اس کے وارثوں کو خوں بہا دیا جا سکتا ہے۔غرض کہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے لئے ثابت کرنے لگے؛

یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہو جانے کو مجازاً دل دادن یا دل باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا۔رفتہ رفتہ متأخرین نے دل کو ایک ایسی چیز قرار دے لیا۔جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ سے چھینا جا سکتا ہے۔واپس لیا جا سکتا ہے۔کھویا اور پایا جا سکتا ہے۔کبھی اس کی قیمت پر تکرار ہوتی ہے۔سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے۔ورنہ نہیں دیا جاتا۔کبھی اس کو معشوق عاشق سے لے کر کسی طاق میں ڈال کر بھول جاتا ہے۔اتفاقاً وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔اور وہ آنکھ بچا کر وہاں سے اُڑا لاتا ہے۔پھر معشوق کے ہاں اس کی ڈھنڈیا پڑتی ہے اور عاشق اس کی رسید نہیں دیتا۔کبھی وہ یاروں کے جلسے میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے۔سارا گھر چھان مارتے ہیں۔کہیں پتہ نہیں لگتا۔اتفاقاً معشوق جو بالوں میں کنگھی کرتا ہے۔تو وہ جوں کی طرح جھڑ پڑتا ہے۔کبھی وہ ایسا تلپٹ ہو جاتا ہے کہ زلف یار کی ایک ایک شکن اور ایک ایک لٹ میں اس کی تلاش کی جاتی ہے۔مگر کہیں کچھ سراغ نہیں ملتا۔کبھی وہ بیع بالخیار کے قاعدے سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے کہ پسند آئے تو رکھنا۔ورنہ پھیر دینا۔کبھی اس کا نیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے وہی لے جائے؛

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اس لئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے۔مجازاً صیاد باندھا تھا۔پچھلوں نے رفتہ رفتہ اس پر تمام احکام حقیقی صیاد کے مترتّب کر دئے، اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے۔کہیں ان کو تیر مار کر گراتا ہے۔کہیں ان کو زندہ پنجرے میں بند کر دیتا ہے۔کہیں ان کے پر نوچتا ہے۔کہیں ان کو ذبح کر کے زمین پر تڑپاتا ہے۔جب کبھی وہ تیر کمان لگا کر جنگل کی طرف جا نکلتا ہے۔تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔سینکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا۔بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں اور

کوؤں اور بٹیروں کے اُس کے دروازے پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے چڑی مار اُس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشقِ الٰہی یا محبتِ رُوحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ مجازاً شراب کے نشے سے تعبیر کیا تھا۔ اور اس مناسبت سے جام و صراحی۔ خم و پیمانہ۔ ساقی و مے فروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارے کے استعمال کئے تھے۔ یا محض شعرائے متصوفین نے شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اس دارالغرور کے تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ البال کرنے والی ہے۔ بطور تفاؤل کے موصل الی المطلوب قرار دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اور اُس کے تمام لوازمات اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشاعرہ بلا مبالغہ کلال کی دُکان بن گیا۔ ایک کہتا ہے۔ لا۔ دوسرا کہتا ہے اور لا۔ تیسرا کہتا ہے۔ پیالہ نہیں تو اوک ہی سے پلا۔ کچھ بہک رہے ہیں۔ کچھ ہُنکار رہے ہیں۔ کوئی واعظ پر پھبتی کہتا ہے۔ کوئی زاہد کی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیلاتا ہے۔ کوئی شیخ کی پگڑی اچھالتا ہے۔ جوان اور بوڑھے۔ جاہل اور عالم۔ رند اور پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جو ہے سو نشے کے خمار میں انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جدھر دیکھو العطش العطش کی پُکار ہے۔

اسی طرح متاخّرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچرل طور پر باندھ گئے تھے۔ نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا معشوق کے دہانے کو تنگ کرتے کرتے صفحۂ روزگار سے یک قلم مٹا دیا۔ کمر کو پتلی کرتے کرتے بالکل معدوم کر دیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمرِ خضر سے بڑھا دیا۔ رشک کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بد گمان ہو گئے۔ جُدائی کی رات کو طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا۔ الغرض جب پچھلے اُنہیں مضامین کو جو اگلے باندھ گئے ہیں۔ اوڑھنا اور بچھونا بنا لیتے ہیں۔ تو ان کو مجبوراً نیچرل شاعری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ متاخّرین کی شاعری ہمیشہ اَن نیچرل ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ ممکن ہے کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں۔ جو قدما کی جولانگاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کریں۔ یا

اسی جولانگاہ کو کسی قدر وسعت دیں۔ یا زبان میں بہ نسبت متقدمین کے زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت اور صفائی پیدا کر سکیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر انیس نے مرثیے کو بے انتہا ترقی دی ہے اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔اسی طرح دلّی میں ذوق۔ ظفر اور خاص کر داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت و صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے ؛

از کتاب یادگارِ غالب
غالب کی اُردو نثر یا رُقعات

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے۔ اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔اس وقت بضرورت ان کو اُردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوتِ مُتخیّلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے۔ نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔پس جب ان کی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی۔ ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی۔اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ فارسی زبان میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے ؎

مضمحل ہو گئے قوےٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

غالباً اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مرزا نے اوّل اوّل اپنی شان کے خلاف سمجھا ہوگا مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر

اور کم وزن خیال کرتا ہے۔ وہی اس کی شہرت اور قبولیّت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے۔ ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے۔ اور ان کے اُردو دیوان کو بھی ایک عالی مرتبہ کلام عام افہام سے بالاتر سمجھتے تھے۔ مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلیداً تھا نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرتبہ دان اور پایہ شناس دوست کو ایک خط میں لکھتے ہیں: میرے فارسی قصیدے کہ جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اُٹھاتا۔ مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسیؔ خوب کہتا ہے۔ دادِ سخن کہاں اور ادراکِ پایۂ معنی کہاں۔ مہرنیم روز کے پانچ سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں میری خاطر نہ کیجئے انصاف سے کہیئے کہ یہ نثر کہیں اور ہے اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو:

اگرچہ مرزا کی اُردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہیئے ویسی نہیں ہوئی۔ چنانچہ بعض اوفیشل تحریروں میں دیکھا گیا ہے کہ اُردوے معلّے اور بوستانِ خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی مرزا کی اُردو نثر کے قدردان بہ نسبت ناقدردان کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے:

مرزا کی اُردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں اور تین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہانِ قاطع کے طرفداروں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائف غیبی، تیغ تیز اور نامۂ غالب۔ اس کے سوا چند اجزا ایک ناتمام قصّے کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لُطف انگیز اُن کے خطوط ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر اُردوے معلّے میں اور اُس سے کم عود ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں:

مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا۔ اور نہ ان کے بعد کسی سے اُس کی پُوری پُوری تقلید ہو سکی۔ اُنہوں نے القاب و آداب کا

پُرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور دُور از کار تھیں۔سب اُڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میاں۔ کبھی برخوردار۔کبھی بھائی صاحب۔کبھی مہاراج۔کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں ؛

ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے۔ جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا کہ لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں۔اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔میں نے پوچھا کہ آج نہ جائینگی ؟ اس نے کہا کہ آج ضرور جائیں گی۔تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو اُنھوں نے اس طرح ادا کیا ہے۔"محمد علی بیگ اِدھر سے نکلا۔ بھئی محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں ؟ حضرت ! ابھی نہیں۔کیا آج نہ جائینگی۔ آج ضرور جائیں گی۔تیاری ہو رہی ہے "؛

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے۔اس میں لکھنا یہ ہے کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ بھی باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے بلکہ اُس کو اس طرح شروع کرتے ہیں :-

" اے میرن صاحب ! السّلام علیکم۔ حضرت ! آداب ! کہو صاحب ! آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ! حضور ! میں کیا منع کرتا ہوں۔ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب ! اُس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت ! وہ آپ کے فرزند ہیں۔آپ سے خفا کیا ہونگے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ؟ سبحان اللہ ! اے لو حضرت ! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھ سے فرماتے ہیں کہ تُو باز رکھتا ہے۔ اچھّا تم باز نہیں رکھتے۔ مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں ؟ کیا عرض کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سُنتا۔ اور حظ اُٹھاتا۔اب مَیں وہاں

نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جائے۔ میں اب پنجشنبے کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھئے گا میاں بیٹھو۔ ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ؟ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آ گیا۔ اور آج تک اُسے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔" اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں ؛

بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اُس کو غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے اندازِ بیان سے واقف نہیں۔ وہ اُس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں۔ "میر مہدی ! جیتے رہو۔ آفرین صد ہزار آفرین۔ اُردو عبارت لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے۔ کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سُنو ! دلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لُوٹ پنجاب احاطے میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت۔ انصاریوں کے محلّے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے"۔

ظاہر ہے کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر مہدی مجروح ہیں۔ کیونکہ غدر کے بعد وہ پانی پت کے محلّۂ مذکور میں کئی سال مقیم رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی اٹکھیلی چالوں سے ناواقف ہیں۔ وہ غلطی سے اس کے دوسرے معنی سمجھ جاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو اس خیال سے کہ راقم بھی پانی پت انصاری محلّے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے یہ دھوکا ہُوا ہے کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھایا کہ یہ خود میر مہدی ہی کی نسبت لکھا ہے۔ میری نسبت نہیں لکھا۔ اُسی قدر ان کو اس بات کا زیادہ خیال ہُوا کہ میں از راہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں ؛

مغربی طریقے پر جو قصّے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اُوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں پر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہُوا۔ اور جواب کہاں سے شروع ہُوا۔

مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے۔ اور نہ ان کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال و جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں۔جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا؟ شاید قصّے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے۔ مگر خطوط میں تو مرزا صاحب نے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرز تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ شوخیٔ تحریر ہے۔ جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی اور ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر ان کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے۔ جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی۔ جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور قوّتِ متخیّلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلّاق ہے اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی مناسبت تھی۔ جو قوّتِ پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی اخلاقی۔ پولیٹیکل۔ سوشل اور رجبس مضامین کے لوگوں نے دریا بہا دئیے ہیں۔ بائیوگرافی اور ناول میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رُتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا۔ اُس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی۔ اور اب جوان ہو گئی ہے۔ بعد دُعا کے لکھتے ہیں "کیوں بھئی! اب ہم اگر کول آئے بھی تو تم کو کیونکر دیکھیں گے۔ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں

چچا سے پردہ کرتی ہیں؟" یا مثلاً نواب امین الدین احمد خاں کو جو اب رئیس لوہارو ہیں۔ ان کے بچپن کے زمانے میں ان کے رقعے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں۔" اے مردم چشم جہاں بینِ غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشم جہان بینِ غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بین تمہارا باپ مرزا علاؤالدین احمد خاں بہادر اور پتلی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خان بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں ؛

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۷ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ اُنہوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۸ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں۔" دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے خط کا جواب ۱۸۵۸ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزا یہ، جب تم سے کہا جائے گا۔ تو یہ کہوگے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے؛"

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں۔" دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقّہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں۔ اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے۔ اور روزہ بہلانا اور بات ہے؛"

جس زمانے میں برہان قاطع پر اعتراض لکھے ہیں اور لوگوں نے مرزا کی سخت مخالفت اور مؤلفِ برہان کی حمایت کی ہے۔ ایک خط میں صاحب برہان کا ذکر کرنے کے بعد اُس کی اور اُس کے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں۔" ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا۔ لکھ دیا۔ نظامی اور سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اُس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیونکر مسلّم الثبوت جانیں۔ ایک گائے کا بچّہ بزورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اُس کو خدا سمجھے؛"

ایک خط کے اخیر میں جو نواب علاءُ الدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔" اُستاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھپھی ان کی چچی تھیں۔ اور

یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اس رُو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے۔ سلام۔ اور اس سبب سے کہ اُستاد کہلاتے ہیں۔ بندگی۔ اور اس نظر سے کہ سیّد ہیں۔ دزود"؛

ایک خط میں برسات کی شدّت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں۔ "دیوان خانے کا حال محل سرائے سے بد تر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے"؛

نواب علاؤ الدین خاں اور ان کے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر رنجی ہے۔ باپ دلی آئے ہیں۔ اور بیٹے کو لوہارو چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاؤ الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں۔"سُنا گیا کہ نواب امین الدّین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزول اجلال کیا۔ پہر دن رہے از راہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے تمہیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ اُتنا ہی جتنا تم اُس کو چاہتے ہو؟ ہنسنے لگے۔ غرضکہ میں نے بظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے"؛

ایک دفعہ کثرت اخراجات سے تنگ آ کر بعضے ضروری خرچ بند کر دئے ہیں۔ یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ نواب علاء الدّین خاں نے اپنے باپ کے اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا ہے اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو یہ شعر لکھا ہے:۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو الخ

اس کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔"بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا۔ اُدھر درباری مل کو جا مارا۔ ادھر خوب چند چین سُکھ کی کوٹھی جا لُوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ اور چاٹو۔ نہ مُول نہ سُود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ

۔وتی کا خرچ بالکل پھپھی کے سر۔ با ایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے۔ سو روپے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا۔ چوکیدار جدا۔ سود جدا۔ مول جدا۔ بی بی جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آ گیا۔ گذارہ مشکل ہو گیا۔ روز مرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں۔ کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہر درویش برجان درویش۔ صبح کی تبرید۔ متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا روز مرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا۔ تبرید و شراب کب تک نہ پیوگے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیوگے۔ تو کس طرح جیوگے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینہ پورا نہیں گذرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے اور روپیہ آ گیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا۔ خیر رہو۔ صبح کی تبرید۔ رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ موقوفی و بحالی پوچھی تھی۔ اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا"۔

ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں۔ سُنو، عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گِل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے۔ جو خود فرماتا ہے۔ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْم۔ اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّار۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہُوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ (یعنی پیدا ہُوا)، تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہُوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ اور دلّی شہر کو زندان مقرّر کیا۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقّت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ

لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار۔ ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار۔ مشقّت مقرّری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ۔ مراد آباد ہوتا ہؤا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا۔ کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے۔ کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے کہیں نہیں جاتا۔ بعد نجات، سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا"؛

الغرض مرزا کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے۔ جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مُندرج نہ ہوں۔ یہاں تک رنج اور افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا؛

منشی نبی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں۔ بھائی صاحب میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸۔ ربیع الاوّل کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اُس کو ماں سمجھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا۔ کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں۔ اور اس کے مرنے سے جانا کہ یہ نو آدمی ایک بار مر گئے"؛

فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سناٹا ہو گیا ہے۔ اس کی کیفیت ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو اس طرح لکھتے ہیں: "صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہؤا۔ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات۔ نہ وہ اختلاط نہ انبساط۔ بعد چند مُدّت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ

صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمہارا آیا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں۔ اُس کا نام بھی دلّی اور اس محلّے کا نام بھی بلّی ماروں کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ! ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتّہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

بعض خطوط میں یاس و حسرت و افسردگی اور دُنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا بیان نہایت مؤثر طریقے میں کیا ہے جس سے ان کے خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً:۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔ "ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکمّا کر دیا۔ ضعف۔ سستی۔ کاہلی۔ گراں جانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دُور دراز درپیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا۔ تو خیر۔ اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے۔ اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے"

ایک اور خط میں منشی ہرگوپال کو لکھتے ہیں:۔ "تم مشقِ سخن کر رہے ہو۔ اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے۔ باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا۔ اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا۔ دُنیا میں نام آور ہوئے تو کیا۔ اور گمنام جئے تو کیا کچھ معاش ہو کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی! ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر میں ابھی اِسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہ معیشت اور

صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دئیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو اور تم کو ہوگا"۔

مرزا نے بعض اُردو خطوط میں اور خاص کر اُردو تقریظوں میں مسجّع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام تکلفاتِ باردہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اُردو جو بہ مقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے۔ وہ اس قسم کے تصنّع اور ساختگی کی متحمل نہیں معلوم ہوتی۔ مگر مرزا نے جس قسم کی مسجّع عبارت اُردو خطوط یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اُس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت کے سوا اور زبانوں کی مسجّع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تو اس میں تصنّع اور آورد کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجّع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اُس شخص سے بن پڑتی ہے۔ جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن و قافیے کی جانچ اور تول میں ایک عُمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اُردو رقعات بھر میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر یہ معلوم رہے کہ مقفّیٰ عبارت مرزا خاص کر اُن خطوں میں لکھتے تھے۔ جن سے ہنسی ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ واقعات کا بیان یا مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سیّد یوسف مرزا کو اُن کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں +

"یوسف مرزا کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو ۔ مگر صبر۔ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں ۔اور یہی کہا کرتے ہیں۔ صبر کرو! ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے ۔ اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں دوا کو لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں ؟ تو میں کہونگا۔ یوسف مرزا کو۔ تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو جوانمرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ"

انہیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں ؛۔" اے میری جان! اے میری آنکھیں! وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی رُوح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا۔ ہرگز غم نہ کرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے تو ابھی تم خود بچّے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت۔ انا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا نبی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے۔ ہاں مظفر الدّولہ کا غم منجملہ واقعات کربلائے معلّےٰ ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا"

مرزا نے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اُردو زبان میں لکھے ہیں۔ اور ان سب میں مسجّع اور مقفّٰی عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ جو بے تکلّفی اور صفائی مرزا کے خطوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان تقریظوں اور دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً مسجّع کی رعایت نے ان میں آورد اور تصنّع کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن مرزا کو اس میں معذور سمجھنا چاہیئے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے۔ وہ بغیر ان تکلفات بارده کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں ریویو لکھنے کا نکلا ہے۔ اس کو اب بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔ اور مرزا کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ با ایں ہمہ ان میں سے بعض نثریں مرزا کی روشِ خاص میں نہایت ممتاز ہیں؂

(حالی)

سیّد سجّاد حیدر صاحب بی۔ اے

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

(ایک مضمون نگار کی شکایت احباب سے)

اور کوئی طلب ابنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

ایک دن میں دلّی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک فقیر پر پڑی جو بڑے مؤثر طریقے سے اپنی حالتِ زار لوگوں سے بیان کرتا جا رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ درد سے بھری اسپیچ انہیں الفاظ اور اسی پیرائے میں دُہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز کچھ مجھے ایسا خاص معلوم ہوُا کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سُننے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس فقیر کا قد لمبا جسم خوب موٹا تازہ تھا اور چہرہ ایک حد تک خوبصورت ہوتا، مگر بدمعاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی۔ رہی اس کی صدا، تو میں ایسا قسی القلب نہیں ہوں، کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ لکھ دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ لفظ بلفظ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اسپیچ یا صدا جو کچھ کہئے یہ تھی۔

"اے بھائی مسلمانو! خدا کے لئے مجھ بدنصیب کا حال سُنو۔ میں آفت کا مارا سات بچّوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کا محتاج ہوں، اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں، مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں اے خدا کے بندو! میری سُنو۔ میں غریب الوطن ہوں"

فقیر تو یہ کہتا ہوُا اور جن پر اس کے قصّے کا اثر ہوا ان کی خیرت لیتا ہوُا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے

اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا۔ اور مجھے خود تعجب ہؤا کہ اکثر امور میں مَیں نے اس کو اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے، نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے۔ وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں، وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیے۔ میں رات دن فکر میں گزارتا ہوں۔ اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک میں غور کرتا رہا۔ کہ اس کی یہ قابلِ رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں بظاہر اس عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے، وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں" میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں" اس کا کوئی دوست نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو اُسے مبارکباد دینی چاہیئے۔

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہؤا مکان پر آیا کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص! یہیں تو تُو مجھ سے بڑھ گیا۔ لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟ یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں جو میرے دوستوں کی طرح اُسے دن بھر میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے؟ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں۔ مگر خبر نہیں کہ مجھے ذرا سا بھی وقت ایسا ملیگا کہ میں تخلیے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انہیں اطمینان سے قلمبند کر سکوں۔ یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے اُسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دہاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے؟ اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا۔ اور یہ نہ کہے گا:۔

"بھائی جان دیکھو۔ پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ مجھے اس وقت ضرورت ہے۔ تھوڑا سا روپیہ قرض دو" کیا اس کے احباب وقت بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے؟ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا،

کہ اُسے نیند کے جھونکے آ رہے ہیں، مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پر قصہ اور لطیفے پر لطیفہ کہ رہے ہیں اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتے ؟ کیا اسے دوستوں کے خطوں کا جواب نہیں دینا پڑتا ؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اُسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے۔ اور ریویو لکھنا پڑے ؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہو حق کرنا نہیں پڑتا ؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اُسے جانا نہیں پڑتا، اور اگر نہ جائے۔ تو کوئی شکائت نہیں کرتا ؟ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ ہٹا کٹا ہے۔ اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ ! کیا اس بات پر بھی شکر ادا نہیں کرتا ؟ خدا جانے وہ اور کونسی نعمت چاہتا ہے۔ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں ! بغیر دوستوں کے زندگی دو بھر ہوتی ہے اور یہ ان سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو برا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہیں۔ اور میرے خیر طلب ہیں : مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے مجھے فائدہ پہنچانے کا، اور ہو جاتا ہے۔ مجھے نقصان چاہے مجھ پر نفریں کی جائے، مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی یہ نہ ثابت کر سکا کہ احباب کا ایک جمِّ غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے ؟ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے۔ اور باتوں ہی باتوں میں عمر نہیں گزارنی ہے تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا ؛ چاہے اس سے میرے دل پر کیسا ہی صدمہ ہو :

مثلاً میرے دوست احمد مرزا ہیں جنہیں میں بھڑ بھڑیا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں، اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے۔ چیزوں کو اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرضیکہ ان کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ آتے ہیں، تو میں کہتا ہوں۔ "کوئی آ رہا

ہے۔ قیامت نہیں ہے۔" ان کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے۔ اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ "میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں" تو وہ فوراً چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو کچھ خیال نہیں۔ (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے۔ توبہ توبہ! اچھا بس ایک منٹ ان کے پاس بیٹھونگا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہونگے نا؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا"

یہ کہتے ہوئے وہ اُوپر آتے ہیں، اور دروازے کو اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی گولہ آ کے لگا۔ (آج تک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں) اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں +

آ ہا ہا ہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا۔ مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ میں ہرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ لو اب جاتا ہوں۔ میں بیٹھونگا نہیں۔ ایک منٹ نہیں ٹھہرنے کا۔ تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ خدا حافظ!" یہ کر کے وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر اب وہ کہاں! اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے تاہم اگر وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے۔ کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اور ان کی دوستی بہت پرانی ہے اور وہ مجھ سے بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم انہیں چھوڑ دونگا، اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے +

اور لیجئے! دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے

صاحب ہیں اور رات دن انہی کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے
ہیں، تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں جب میں کام سے تو فارغ ہو
چکتا ہوں، لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ
ایک گھنٹے آرام کرسی پر خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں اور ان سے
ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لئے سوائے اپنی بیوی بچوں
کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں، مگر
وہ اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں تو وہ
کہتے ہیں۔ ہاں بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے لڑکے کو بخار آ گیا۔
منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو کرتا
ہوں تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی! آج کل گھر
بھر بیمار ہے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے
میں آتے ہیں، تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک
سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ "طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں
لگتی؟" کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی
بیماری کا ہی ذکر کرتے ہیں ؛

اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں جنہیں سوائے اپنی ریاست
کے جھگڑوں، اپنے فریقِ مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا
مذمت کے (تعریف اس حالت میں جبکہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی
مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے میں شاکر
صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا۔ کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت
فرماتے ہیں۔ شاکر صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت
معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے
لیکن پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا
کرنے کا۔ ان کا خیال ہے، کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امرا کے
شایان شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے، اور بہت اصرار
سے مجھے سلیم پور لے گئے یہ کہہ کے ؛

شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ

رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی۔ اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکوگے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے، جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیّا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو۔ میری خوشی کرو۔"

میں ایسے محبّت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ "ایڈیٹر معارف" سے وعدہ کر چکا تھا، کہ ایک خاص عرصے میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی ایک کھڑکی پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی، اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو میں نیچے ناشتے کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے میں جانے کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ "ہیں ہیں! کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے کام شروع کر دو۔ اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اُٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں دریا پر مچھلی کا شکار کھیلیں گے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔"

میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا، تو یہاں بھی فرصت معلوم! خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں مَیں سرگردان تھا۔ وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

مَیں جلدی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات مگر سیاہی ... ہوا، تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب، مگر اکثر

میں نب ندارد۔ جاذب کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں، مگر لکھنے کے کاغذ کا پتہ نہیں۔ اسی طرح بہت سا اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں سے میرے کام کا نہیں اور جو چیزیں کہ ضرورت کی تھیں، وہ موجود نہیں۔ آخرکار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی مگر مفید بکس اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے میری مدد کی تھی، اور میرے پراں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفسِ کاغذ میں بند کیا تھا) نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغانِ خوش نوا کی تعریف میں شعرا اس قدر رطب اللسان ہیں، ان کی اس عنایت سے میں خوش نہیں ہوں کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم مَیں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کان بند کر لئے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا +

. . . .

. . . تن۔ تن تن۔ تنتنانا۔ چھن۔ تاتن۔ تن تن تن۔ میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکایک اس تن تن نے چونکا دیا۔ ہیں! یہ کیا ہے؟ اوہ! اب میں سمجھا۔ میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے۔ انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں +

"اس کی گلی سے آئے کیوں؛ نکہتِ زلف لائے کیوں؟ مجھ کو صبا سے ہے امید۔ آہا مجھ کو صبا سے ہے امید مجھ سے صبا کو کیا غرض" +

واہ وا! سبحان اللہ! کیا غزل چھیڑی ہے! "اے تُرک سوار! نواحِ عرب یثرب نگری پہنچا دینا۔ کس رنگ میں ہے وہ حبیب مرا مجھے وا کی کھبریا لا دینا" بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں +

کوئی آدھ گھنٹے انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے اور خاموشی طاری ہو گئی، تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا +

"اے میرے خیالات! تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو۔ خدا کے لئے رحم کرو۔ میرے دماغ میں پھر آؤ" یہ کر کے میں کاغذ کی طرف متوجہ

ہوا کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا: "ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں، اتنا ہی اس کی مشکلات کا مثل ....."

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا؟ "ریگِ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟" ہرگز نہیں۔ ایسا معمولی فقرہ تو نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا۔ کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ تھی اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھا کیا نہ تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتہ بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ

"اس کی گلی سے آئے کیوں؟ نکہتِ زلف لائے کیوں؛ مجھ کو صبا سے ہے اُمید۔ مجھ سے صبا کو کیا غرض"

مگر میرا تو صبا کے نام نے دماغ خالی کر دیا۔ اگر وہ آتی اور نکہتِ زلف بھی لاتی، تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہرحال مجھے وہ فقرہ از سرِنو درست کرنا چاہیئے۔ مشکلات کے بجائے کچھ اور ہونا چاہیئے:

"ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں اُتنا ہی اُن بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کے پُر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؛

"جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟" یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولاقوۃ۔ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔ "آپ کہاں بھول پڑے۔ اتنے دنوں کہاں رہے؟"

یہ فقرے تو شاکر خاں صاحب نے کسی دوست سے کہے ہیں جو ابھی اُن سے ملنے آیا ہے۔ میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا:

ہاں تو کاٹ کے فقرہ درست کرنا چاہیئے۔ "اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہیں ہوئی ہے اور بظاہر"

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے:

"کون ہے؟"

"میں ہوں، شبّن۔ سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں ان سے سرکار اُنہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں":

با دلِ ناخواستہ میں اُٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست راجہ طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی۔ اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شبّن نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہُوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کے تھا جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا، اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کر دکھایا جاتا تھا؛ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر میں پھر اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ نقرہ از سرِ نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ بہزار دِقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا اور میں لکھ رہا تھا:۔

"ہم کو کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے اور جو کولمبس کی طرح نئی معلومات اور نئی دُنیا (گو وہ علمی دُنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں "

دروازہ پر پھر دستک "کیا ہے؟" "اچھا"

"دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے، ضرور اس طرف متوجّہ ہونگے اور اپنی کاوشوں اور کوششوں سے موجودہ ...."

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"۔

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے"۔

"اُفوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں۔ میں پھر کھا لونگا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں"۔

"اور آئندہ نسلوں کو زیر بارِ احسان کرینگے۔ یہی وُہ نوجوان ہیں

جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے خطرات سے بچاتے اور ساحلِ مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ ...."

دستک۔ "کیا ہے؟"

"سرکار کہتے ہیں، اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائینگے تو ہم بھی اسی وقت کھائینگے۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا۔"

"اچھا بھائی، لو ابھی آیا"

یہ کہ کر میں کھانے کے لئے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں۔ میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں:۔

"چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا؟ دیکھو میں تم سے کہتا تھا نا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟"

سوائے اس کے کہ آمنّا و صدّقنا کہوں اور کیا کہ سکتا تھا۔ اب کھانے پر اصرار ہوتا ہے۔ جس چیز سے مجھے رغبت نہیں، وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے میزبان صاحب فرماتے ہیں:۔

"سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو"

واپس کمرے میں آکر میں تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں، اور پھر لکھنا شروع کر دوں۔ مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اُٹھا کر دیکھتا ہوں:۔

زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ"

اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو پہلے فقروں سے کیونکر ربط پیدا کرنا تھا۔ یوں ہی پڑے پڑے نیند آ جاتی ہے۔ تیسرے پہر اُٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں۔ "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینے کی طرح نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اُٹھ کر میز پر گیا۔ اور لکھنا چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک!

نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے۔ سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً نیچے جاتا ہوں، تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب فرماتے ہیں یہ ہوتا ہے۔ "آج تو دستے کے دستے لکھ ڈالے" میں

سچی بات کہوں کہ "کچھ بھی نہیں لکھا" تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ "آخر اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟ ؎

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا

مل ملا کر شام کو واپس آئے۔ کھانے کے بعد باتیں ہوتی ہیں۔ سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اٹھا کر دیکھتا ہوں، تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں۔ وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ۔ غصّے اور رنج میں آ کر اُسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے اپنے گھر واپس چلا آتا ہوں۔ میں ناشکر اور احسان فراموش کہا جاؤنگا۔ مگر میں مجبور ہوں۔ اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دونگا۔

میں نے ذرا تفصیل سے ان کا حال بیان کیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ یہیں اُن احباب کی فہرست ختم ہو گئی جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں۔ نہیں ابھی بہت سے باقی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے۔ مگر جب آتے ہیں۔ میں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں، جب مجھ سے ملتے ہیں کہتے ہیں "میاں عرصہ سے میرا دل چاہتا ہے۔ تمہاری دعوت کروں"۔ مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے ایک دوست آتے ہیں۔ وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں، تو متوجّہ ہو کر نہیں سُنتے، یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں، یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں۔ وہ جب آتے ہیں، اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ میری نہیں سُنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں، مگر اپنی طبیعت کو کیا کروں۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں ؎

"مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ حال لکھنا شروع کر دیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کر دوں۔

دروازے پر ایک گاڑی آکے رُکی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرنے کا۔ کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے، کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرما نے کرم نہیں فرمایا۔ اس لئے اس کے شکریے میں میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں۔ اور اپنے دوست کا خیرمقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب آتے ہیں مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں۔ کہ "تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے"۔ میں جانتا ہوں، کہ اس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے جو بڑا حاذق ہے یا کوئی مجرّب نسخہ میرے لئے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے:

"آئیے آئیے۔ مزاج عالی۔ بہت دن بعد تشریف لائے"؛

(ملخص)

سیّد سجّاد حیدر

فسانۂ مبتلا از مولانا نذیر احمد دہلوی

سیّد حاضر کا میر متقی کے وعظ سے متاثّر ہو کر بہن کا حق دینے پر آمادہ ہونا اور دونوں بھائیوں کی اسی بات پر رنجش۔

میر متقی کے چلے جانے کے بعد سیّد حاضر دیر تک سکتے کے عالم میں تھا۔ اپنے یہاں کے معاملات میں سے جس معاملے پر نظر کرتا تھا، کسی کو دخلِ فساد سے اتلاف حقوق العباد سے خالی نہیں پاتا تھا۔ جن باتوں پر اس کو بڑا ناز تھا، اب اس کی نظر میں نہایت ذلیل اور پاجی پن کی دلیل معلوم ہوتی تھیں۔ وہ گھبرایا ہوُا اکیلا دالان میں ٹہل رہا تھا، اور اس قدر بے قرار تھا، کہ جاڑے کے دن اور شام کے وقت اس کو پسینے پر پسینے چلے آتے تھے۔ اور دیکھتا تھا کہ کھانا اور پینا اوڑھنا اور بچھونا اور ساز و سامان اور مال و متاع اور نقد و جنس حتّٰی کہ اپنا گوشت، پوست کوئی چیز بھی لوث حرمت سے پاک نہیں پاتا تھا کہ بدکرداری اور بد معاملگی ہماری برادری اور ہمارے خاندان میں قدیم سے چلی

آتی ہے۔ اگرچہ حاضر و ناظر دونوں باپ کے مرنے سے معاملات کرنے لگے تھے، مگر حاضر نے احتساب کیا تو اتنے ہی دنوں میں صدہا مظلمے اُن کے نامۂ اعمال پر چڑھ چکے تھے۔ اور ان میں اکثر ایسے تھے جن کا تدارک محال تھا اور تلافی ناممکن۔ ہم کو حاضر کی اتنی ہی بات سے تعلق ہے کہ جہاں اس کو اپنے وقت کے بہت سے معاملے یاد آئے، ان میں سے ایک معاملہ غیرت بیگم کا بھی تھا۔ اگرچہ غیرت بیگم کے معاملے میں ابتداءً تحریک ناظر کی طرف سے ہوئی، اور اُسی کو اس میں زیادہ اصرار بھی تھا۔ مگر پھر بھی حاضر کا اتنا قصور تو تھا کہ بڑا بھائی ہو کر اس نے ناظر کو سمجھایا نہیں۔ غیرت بیگم کا خیال آنا تھا کہ فوراً گھوڑا کسوا سوار ہو راتوں رات شہر میں ناظر کے مکان پر جا دستک دی۔ اگلے دن کسی مقدمے کی پیشی تھی، اور ناظر آدھی رات تک گواہوں کی تعلیم اور کاغذات کی درستی میں مصروف تھا۔ ابھی اچھی طرح نیند بھری نہ تھی کہ بھائی کی آواز سُن کر چونک پڑا اور لگا پوچھنے۔ خیر تو ہے! آپ ایسے سویرے کیونکر آئے؟

حاضر۔ خیر ہے۔ تم بہ اطمینان وقتی ضرورتوں سے فارغ ہو لو تو میں اپنے آنے کی وجہ بیان کروں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ؛

تھوڑی دیر بعد جب دونوں بھائی یک جا ہوئے، تو حاضر نے پوچھا "چھوٹے ماموں آئے ہیں۔ تم ان سے ملے؟"

ناظر۔ ماموں کا آنا تو مجھ کو معلوم ہوا، مگر میں ملا نہیں اور ملنے کا ارادہ بھی نہیں ؛

حاضر۔ کیوں ؟

ناظر۔ میں جانتا ہوں، وہ آپا کا جھگڑا ضرور نکالینگے۔ اور مجھ کو کسی طرح آپا کا حصّہ دینا منظور نہیں۔ بے فائدہ باتوں ہی باتوں میں تکرار ہو پڑیگی؛

حاضر۔ کیوں! بے چاری غیرت نے ایسا قصور کیا کیا ہے؟ کیا وہ ہماری حقیقی بہن اور متروکۂ پدری میں عند اللہ اور عند الرسول حق دار نہیں ہے؟

حاضر کے منہ سے یہ سوال سُن کر ناظر کے کان کھڑے ہوئے۔ آدمی تھا معاملہ فہم، معاملہ شناس۔ فوراً تاڑ گیا کہ بھائی ماموں سے ملے اور ماموں نے پٹی پڑھائی۔ تو کہتا کیا ہے کہ اگر ماموں کوئی فتوے کہیں سے لکھوا کر لائے ہیں تو اس کو تہ کر رکھیں۔ ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ

یہاں انگریز بہادر کی عملداری ہے۔ میں نے برسوں کی جستجو میں پریوی کونسل اور عدالت ہائے عالیہ ہائی کورٹ اور چیف کورٹ اور جوڈیشل کمشنر کے فیصلوں اور میگناٹن اور سر ہنری لا کی شرع محمدی سے وہ وہ نظائر اور احکام چھانٹ کر رکھے ہیں کہ اگر آپا سے جہیز واپس نہ کرا لوں تو سیّد نہیں چمار ÷

حاضر کو بھی بھائی کی اس قدر خشونت دیکھ کر نہایت استعجاب ہؤا۔ کیونکہ اس نے آج تک حاضر کے رو برو ایسی شوخ چشمی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ اور بولا کہ "تم ماموں سے ناحق بدگمان ہوتے ہو۔ میں ان سے ملا بیشک اور وہ تعزیت کے لئے سیّد نگر تشریف لے گئے بلاشبہ مگر غیرت بیگم کا نام تک اُن بیچارے نے نہیں لیا۔ اور افسوس ہے کہ تم نے ان کی شان میں خود ہو کر اس قدر گستاخی کی اور وہ بھی غائبانہ۔ پس تم نے ایک بزرگ کا حق تلف کیا"÷

ناظر۔ اُنہوں نے آپا کا نام نہ لیا ہوگا۔ اشارے کنائے سے کام لیا ہوگا۔ اور فرض کیا کہ میں نے گستاخی کی تو قانون نے صرف ایک ہی گستاخی کو جرم قرار دیا ہے یعنی حاکم عدالت کے ساتھ گستاخی کرنا، جبکہ وہ عدالت کا اجلاس کر رہا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ماموں اس کے مصداق نہیں ہو سکتے"÷

ناظر کے اس جواب سے حاضر کو سیّد متقی کی اس بات کی تصدیق ہوئی کہ حکامِ ظاہر کے انتظام سے پورے طور پر حقوق العباد کی حفاظت نہیں ہو سکتی ÷

سیّد متقی کے وعظ سے سیّد حاضر کے خیالات دفعۃً اس قدر متبدل ہو گئے تھے کہ دونوں بھائیوں میں التیام کا ہونا محال تھا۔ ناظر اپنے اسی پرانے موروثی ڈھرّے پر چلتا تھا کہ قانونی گرفت بچا کر جہاں تک اور جس طرح ممکن ہو اپنا فائدہ کرنا چاہیئے۔ کسی کا حق ہو تو مضائقہ نہیں۔ کسی کا دِل دُکھے تو پرواہ نہیں۔ عاقبت تباہ ہو تو کچھ ہرج نہیں۔ اور سیّد حاضر کو اب اس بلا کا اہتمام تھا کہ ایک غیبت کو بھی وہ اتلافِ حق سمجھا۔ غرض یہ جو سُنا کرتے تھے کہ دین اور دُنیا دو سوکنیں ہیں، اب وہ معمّا حل ہؤا کہ حقیقت میں وہ دُنیا جو دین کی دشمن ہے، اور اس کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، وہ یہ دُنیا ہے کہ جیسی ناظر کی تھی۔ جس میں حلال و حرام

کا امتیاز نہیں۔ جائز و ناجائز کا تفرقہ نہیں۔ خدا و رسول کا خوف نہیں روز قیامت کا اندیشہ نہیں۔ ناظر کی اتنی ہی باتوں سے حاضر کو پورا تیقن ہو گیا کہ اس کو سمجھانا یا اس کے ساتھ بحث کرنا بے سود اور لاحاصل ہے۔ اس پر قانون کی پھٹکار ہے۔ اور اس کے سر پر پڑھا ہوا جن سوار۔ اس لئے زیادہ ردّ و کد مناسب نہ سمجھ کر اس نے دو ٹوک بات ناظر کو سنا دی کہ تم اس کو ماموں کا اغوا سمجھو یا میرا حُمق۔ میں تو غیرت بیگم کا حق اب ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکھ سکتا۔"

ناظر۔"دیکھئے ایسا کیجئے گا۔ تو مجھ سے آپ سے بگاڑ ہو جائے گا۔"

حاضر۔"اگر اتنی ہی بات پر کہ میں ایک حق دار کا حق مارنا نہیں چاہتا، تم مجھ سے بگڑو تو تمہاری خوشی۔ اگرچہ تمہارے بگڑنے کا مجھ کو سخت افسوس ہوگا، مگر اس سے ہزار درجے زیادہ افسوس ہوگا، اگر غیرت بیگم کا حق غصباً میرے پاس رہے۔"

ناظر۔"یہ آپا کی خصوصیّت کیا ہے؟"

حاضر۔"خصوصیّت پوچھو تو وہ ہماری حقیقی بہن ہے۔ مگر ایصال حق کے لئے اس کی مطلق خصوصیّت نہیں۔ انشاء اللہ سب حقداروں کے ساتھ میں ایسا ہی معاملہ کروں گا۔"

ناظر۔"تو آپ سیدھی بات یہی کیوں نہیں کہتے کہ ترک دُنیا پر آمادہ ہیں۔"

حاضر۔"اگر مغصوبات کا واپس کر دینا تمہارے نزدیک ترک دُنیا ہے تو مُجھ کو اِس سے انکار نہیں۔"

ناظر۔"بیٹھے بٹھائے یہ آپ کو ہوُا کیا ہے؟ پہلے تو میں ماموں کو مولوی اور حاجی اور جیسا اُن کا نام ہے متقی سمجھتا تھا۔ اب معلوم ہوُا کہ تسخیر یا سحر کے بھی عامل ہیں۔"

حاضر۔"ماموں کی شان میں تمہاری طرف سے یہ دوسری گستاخی اور دوسری غیبت ہے۔ دوسرا اتلاف حق ہے۔"

ناظر۔"میں آپ کو آگاہ کئے دیتا ہوں کہ یہ گھر کی تباہی کے سامان ہیں۔"

حاضر۔"جس گھر کی آبادی دوسروں کے حقوق کے غصب کرنے پر موقوف ہو، اس کا تباہ ہونا ہی بہتر ہے۔"

ناظر۔"آپ نے انجامِ کار پر بھی نظر کر لی ہے؟
حاضر۔"انجامِ کار پر نظر کرنا ہی مجھ کو تو اس ارادے کا باعث ہوا ہے"۔
ناظر۔"تو آپ مجھ کو بھی اپنے ساتھ برباد کرتے ہیں۔کیسی کیسی محنتوں اور کیسی کیسی تدبیروں سے میں نے ملکیت کو درست کیا۔اب ایک ڈھنگ پر آچلی تھی، تو آپ ساری عمارت کو جڑ بنیاد سے ڈھائے دیتے ہیں"۔
حاضر۔"کیا تم نے مجھ کو مجنوں قرار دیا ہے یا مخلوط الحواس سمجھا ہے۔دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا ہے، جو دیدہ و دانستہ اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارے یا سمجھ بوجھ کر اپنے رہنے کے مکان میں آپ آگ لگائے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اس بات کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ دنیا کو دین پر ترجیح نہ دوں۔اور جس دنیاوی فائدے میں دین کا ضرر ہے اس کی طمع نہ کروں۔اگر ایسا کرنے سے میری دنیا برباد ہوتی ہو تو ہو اور اگر مجھ پر دنیاوی تباہی آتی ہے تو آئے۔جب میں نے دین کے خلاف دنیاوی فائدے کا لالچ نہ کیا تو دنیاوی نقصان کی میں کیا پروا کر سکتا ہوں"۔
ناظر! میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں تمہارے فائدوں کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔مگر وہیں تک کہ وہ جائز طور پر حاصل کئے جائیں۔غصب و ظلم اور دغا اور فساد اور اتلافِ حقوق العباد کو نہ میں اپنے لئے جائز رکھتا ہوں اور نہ تمہارے لئے"۔
ناظر۔"یہی تو میں کہتا ہوں کہ آپ پر ماموں نے جادو کیا"۔
حاضر۔"اگر تمہارے نزدیک یہ جادو ہے تو یہی جادو تمام پیغمبر صلوات اللہ و سلامہ علیہم اجمعین۔تمام اولیا۔تمام انبیا۔تمام اتقیا کرتے آئے ہیں۔مگر جادو ایک مکروہ لفظ ہے۔اس کا استعمال بزرگانِ دین کے حق میں میرے نزدیک تو درست نہیں"۔
ناظر۔"اچھا تو ایک کام کیجئے۔آپ اپنے حصّے کا بٹوارہ کرا لیجئے اور علیحدہ ہو جائیے!"
حاضر۔"میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا تھا۔مگر اس صورت میں مشکل یہ ہے کہ جب تک ملکیت تمام مظالم سے پاک نہ ہو، میں اس میں سے حصّہ

میں لے سکتا"

ناظر۔"آپ نے ساری ملکیت کا ٹھیکہ نہیں لیا۔ اپنے مذہب کی رو سے حصّۂ پدری میں سے جتنا حصّہ آپ اپنا سمجھتے ہوں الگ کر لیجئے"

حاضر۔"والد مرحوم کی جگہ میرا اور تمہارا اور غیرت بیگم تینوں کا نام لکھا جانا چاہیئے۔ ہم دونوں نے ناحق اور ناروا بہن کو محروم کر کے اپنے ہی نام چڑھوائے تو نصف نصف ہم دونوں کا ہوُا۔ پس سرکاری کاغذات میں میرا نصف حصّہ لکھا ہے۔ اس میں بھی تو غیرت بیگم کا ایک عُشر شامل ہے۔ جس کو میں اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا"

ناظر۔آپ بٹوارے کی درخواست میں لکھ دیجئے، کہ اگرچہ میرے نام نصف حصّہ لکھا ہے مگر حقیقت میں میرا دو خمس ہوتا ہے اسی قدر کا میں بٹوارہ چاہتا ہوں۔ حاکم آپ کی درخواست کی تصدیق کر کے آپ کے دو خمس کا بٹوارہ کر دے گا"

حاضر۔"تو غیرت بیگم کا ایک عشر بھی تمہاری طرف منتقل ہو جائے گا"

ناظر۔"آپ کا اس میں ہرج کیا ہے۔ غیرت بیگم کا مطالبہ میرے سر رہیگا"

حاضر۔"تو اس کے یہ معنے ہیں کہ میں غیرت بیگم کا ایک عُشر جو میرے نام ہے، تمہارے نام منتقل کر دوں"

ناظر۔"خیر معنے مطلب تو میں سمجھتا نہیں۔ ایک راہ کی بات جو میں نے آپ کو بتائی، اگر آپ کو مجھ سے پرخاش نہیں ہے تو جس طرح میں نے بیان کیا، درخواست لکھئے، اور پیش حاکم اس کو چل کر تصدیق کرائیے باقی مراتب میں دیکھ بھال لوں گا۔ آپ کو وہی دو خمس ملے گا، جو آپ چاہتے ہیں"

حاضر۔"غیرت بیگم کا ایک عُشر میں تمہارے نام تو منتقل نہیں کرا سکتا۔ وہ بھی تو ناجائز ہے۔ حق دار کو تو اس کا حق نہ ملا۔ ہاں اگر کہو تو درخواست میں یہ بات بے شک لکھ دوں کہ میرے نام جو نصف حصّہ لکھا ہے، اس میں سے دو خمس میرا ہے، اور ایک عُشر غیرت بیگم کا"

ناظر۔"اس سے تو میری نصفی میں فتور پڑے گا"

حاضر۔"پڑے گا تو تم جانو، میرے اختیار کی بات نہیں"

ناظر: آپ کے اس اصرار سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف تقاضائے دین داری نہیں ہے بلکہ ماموں کے سب فساد ہیں؟"

حاضر: تم بار بار پھر پھر کر ماموں کو اُن کی پیٹھ پیچھے بُرا کہتے جاتے ہو، مجھ کو اس بات سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے تم سے کہا کہ ماموں نے غیرت بیگم کا نام تک نہیں لیا اور تم نے میرے کہنے کو سچ نہ جانا۔ فرض کرو ماموں ہی نے مجھ کو غیرت بیگم کا حق مغصوب واپس کر دینے پر آمادہ کیا، تو کیا احقاقِ حق میں کوشش کرنا فساد ہے؟

ناظر یہ کہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "بہت خوب! معلوم ہوا۔ آپ آپا کو ان کا حصّہ دیجئے اگر آپ سے دیا جائے اور وہ لیں اگر ان سے لیا جائے اور ماموں جس غرض سے بھانجی کی خوشامد میں لگے ہیں مجھ کو معلوم ہے۔ مبتلا بھائی کو انہوں نے دیکھ پایا ہے بھولا بے وقوف۔ چاہتے ہیں کہ بھانجی کے نام سے بڑے ماموں کی تمام املاک پر خود قابض ہو جائیں، لیکن (موچھوں پر تاؤ دے کر) اگر ناظر کے دم میں دم ہے تو ماموں کو ایسا مزا چکھاؤں کہ سات برس بعد تو حج سے پھر کر آنا نصیب ہوا، اب اُن کو ہجرت ہی کرنی پڑے تو سہی۔ آپا کا حصّہ لینا ایسا کیا ہنسی کھیل ہے!"

حاضر بے چارہ اپنا سا منہ لے کر سیّد نگر واپس گیا۔ غمگین اُداس۔ کیا خدا کی شان ہے کہ کل شاموں شام سیّد متّقی کے وعظ سے حاضر متنبّہ ہوا۔ توبہ کی۔ تلافیِ مافات پر آمادہ ہوا راتوں رات بھاگا ہوا بھائی پاس آیا۔ ابھی جی کھول کر بھائی سے باتیں نہیں کرنے پایا تھا کہ سخت امتحان میں پکڑا گیا۔ وہ خوب واقف تھا کہ ناظر ایک سانپ ہے۔ اس بلا کا زہریلا کہ اس کا کاٹا پانی نہ مانگے، اس کا ڈسا ہوا پھٹکا نہ کھائے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ناظر اگر بگڑا، اور اب اس کے بگڑنے میں کسر ہی کیا باقی تھی، تو کیسی زمینداری اور کس کی حصّہ داری، گاؤں کا رہنا دشوار کر دے گا۔ اور اس کے ہاتھوں سے زندگی وبالِ دوش ہو جائیگی۔ یہ خیال کر کے وہ جی ہی جی میں اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ مجھ کو بھائی کے ساتھ بگاڑنا کیا ضرور ہے۔ اگر وہ غیرت بیگم کا حصّہ نہیں دیتا تو نہ

دے۔ وہ جانے اس کا کام جانے۔ اپنا اپنا کرنا، اپنا اپنا بھرنا۔غیرت بیگم کو حصّہ لینا ہوگا۔ تو آپ سے آپ نالش کریں گی ع ہر کسے مصلحت خویش نکو مے داند۔ میری طرف سے اتنا کافی ہے کہ ابھی سے غیرت بیگم کے حصّے سے دست بردار ہو جاؤں۔ اور اگر نالش ہو تو دعوے کی تردید نہ کروں۔ پھر سوچتا تھا کہ اب تک جو غیرت بیگم حِصّے سے بے دخل رہیں، اس کا وبال جیسا ناظر پر ویسا مجھ پر۔کیونکہ ہم دونوں نے مل کر غیرت بیگم کو محروم کیا۔ بلکہ ایک اعتبار سے مجھ پر زیادہ اور ناظر پر کم۔ کیونکہ میں پٹّی کا نمبردار ہوں، اور پٹی کی تحصیل وصول میرے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے کیا یہ انصاف کی بات ہے۔کہ ہم دونوں بھائی تو بے زحمت اپنے حقوق پر قابض ہوں، اور غیرت بیگم کو نالش کرنے پر مجبور کریں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ عورت ہے۔ پردہ نشین، اور کوئی اس کے حق کی حفاظت کرنے والا نہیں۔ دُنیا میں آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی تو خدا کو کیا جواب دیں گے۔ اور مانا کہ میں غیرت بیگم کے حِصّے سے دست بردار ہو بیٹھا۔ تو وہی بات پھر آئی کہ میں نے نہ لیا، ناظر کو لینے دیا۔غیرت بیگم کو تو اس کا حق نہ پہنچا۔ علاوہ بریں آج تک تو ایک غیرت بیگم کا معاملہ ہے، اس میں یہ حجّت ہے۔ ابھی تو ایسے ایسے صدہا معاملے نکلیں گے۔ غربا کے، ضعفا کے اور ایسے لوگوں کے جن کو سوا خدا کے کہیں پناہ نہیں اور ناظر کا منشا تو معلوم ہو چکا کہ وہ تو سوائے قانون کے خدا و رسول کسی سے ڈرنے دبنے والا نہیں تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ بھائی سے تو ایک نہ ایک دن بگڑے ہی گی۔ اور آج اگر غیرت بیگم کے معاملے میں نے ذرا بھی اپنا ضعف ظاہر کیا، پھر تو ناظر کی جیت ہے۔غرض یہ تزلزل ٹھیک نہیں، بلکہ وسوسۂ شیطانی ہے ؎

مضامین فرحت

از مرزا فرحت اللہ بیگ

پُرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں نہ ملیں گے"۔ جس طرح یہ صحیح ہے، اسی طرح یہ مثل بھی صحیح ہونی چاہیئے کہ "ماضی ماضی ہے اور حال حال۔ یہ دونوں نہ ملے ہیں اور نہ ملیں گے"۔ لیکن خدانخواستہ اگر ان کی ٹکّر ہو گئی تو سمجھ لیجئے وہ ہی مصیبتیں پیش آئیں گی جو مجھ غریب کو پیش آئیں۔ وہ کیا مصیبتیں تھیں، ان کو بھی سُن لیجیے۔ واقعات از سرتاپا غلط سہی، مگر پڑھنے کی حد تک ان کو سچ جانئے اور یقین کیجئے، ورنہ پڑھنے میں خاک مزا نہ آئے گا۔ اگر آپ اس پر تیار ہیں تو بسم اللہ آگے چلیئے ؛

آؤ حضرت تمہیں بھی دکھلائیں سیر ماضی کی اس زمانہ میں

سنہ اُنیس سو کچھ میں ہم نے تعلیم سے فراغت پائی۔ اب نوکری کی تلاش ہوئی۔ ایک ریاست میں (نام کی جگہ صفر) ہمارے خاندانی تعلّقات تھے اس لئے کالج سے نکل کر سیدھا اُدھر کا رُخ کیا۔ یہاں پہنچے تو کسی نے کہا نوکری کر لو۔ کسی نے کہا ابھی تعلیم جاری رکھو۔ چونکہ کالج کا خیال دل سے ابھی تک محو نہیں ہؤا تھا، اور وہاں کی صحبتیں پیش نظر تھیں۔ اس لئے طبیعت نے اسی تجویز کو پسند کیا، اور ہم بھی اس دوسری پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ صورت بھی خود بخود پیدا ہو گئی ؛

نوٹ۔ یہ مضمون بالکل فرضی ہے۔ کوئی صاحب اس کو اپنے سے متعلق نہ فرمائیں ؛

اس ریاست میں میرے ایک عزیز ایک بہت ہی بڑے عہدے پر تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا :- ارے میاں ! میں ایک ترکیب بتاتا ہوں یہاں کے ایک امیر اپنے چھوٹے صاحبزادے کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج رہے ہیں۔ میرا ان کے ہاں بہت اثر ہے۔ اگر کہو تو تم کو اس لڑکے کا اتالیق بنا کر بھیجنے کے لئے کہ دوں۔ تمہاری تعلیم مفت میں ہو جائے گی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ نواب صاحب بڑے رسوخ کے آدمی ہیں۔ واپسی کے بعد تمہیں کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ میں نے کہا "آپ کو اختیار ہے"۔ دوسرے تیسرے ہی روز انہوں نے مجھے بلا کر کہا۔ "لو سب معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے نواب صاحب سے تمہارے متعلق سب تصفیہ کر لیا ہے۔ مگر وہ چاہتے ہیں کہ چند روز تم کو پاس رکھ کر تمہاری طبیعت کا اندازہ کر لیں۔ تم کو کبھی پرانی وضع کے نوابوں میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ تم بھی اس عرصہ میں ان کی نشست و برخاست کے طریقے اور ادب آداب کے سلیقے سیکھ جاؤ گے۔ چھوٹے صاحبزادے صاحب کی طبیعت کا رنگ بھی معلوم ہو جائیگا اور انشا اللہ اس طرح تم کچھ فائدے ہی میں رہو گے"۔ میں راضی ہو گیا۔ قرار پایا کہ سہ پہر کو ان کے مددگار صاحب لے جا کر مجھے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا دیں اور تعارف بھی کرا دیں ؛

اب آپ نواب صاحب کے نام کی جگہ نقطے سمجھ لیجئے اور مددگار صاحب کے اسم شریف پر لکیر کھینچ دیجئے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ سچی بات بری معلوم ہوتی ہے۔ کہیں نام بتا کر میں خود مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران گفتہ آید در حدیثِ دیگران

بہر حال دو بجے ہی سے ہم نہا دھو، کپڑے بدل۔ سیاہ ترکش کوٹ ڈانٹ، دستار پہن اور بگلوس باندھ تیار ہو گئے۔ یہاں ننگے سر رہنے کی عادت تھی۔ دستار سر پر بار ہو گئی۔ اگرچہ "شملہ بمقدار علم" کے لحاظ سے اس دستار کا بوجھ کچھ زیادہ نہ تھا، پھر بھی رہ رہ کر یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو الگ ہی رہنے دو۔ اتار کر رکھ دو اور ننگے

سر ہی چلے چلو۔ مگر کیا کیا جاتا، وہ نواب صاحب پرانی وضع کے ایسے دلدادہ تھے کہ ننگے سر جانا یقیناً خالی ہاتھ آنے کی صورت اختیار کرلیتا۔ اس لئے "فقرِ درویش بر جان درویش" سمجھ کر اس بار کو اٹھانا ہی پڑا۔ ابھی دستار کا تصفیہ پوری طرح نہ ہوا تھا کہ بگلوس نے ستانا شروع کیا۔ پیٹی باندھتے عمر گزری تھی مگر کوٹ کے نیچے پیٹی باندھتے تھے نہ کہ کوٹ کے اُوپر۔ کوٹ کے اُوپر باندھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر ہاتھ ہلا اور ادھر کوٹ بگلوس کے اوپر گولا بن گیا۔ دامن پکڑ کر نیچے گھسیٹا۔ برابر کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی مشکل پیش آئی، اور اسی ترکیب سے پھر رفع کی۔ ہم اس کشمکش میں تھے کہ مددگار صاحب اپنی وکٹوریہ میں آ ہی گئے۔ اور ہم کوٹ کا دامن نیچے کھینچنے اور دستار کو درست کرتے گاڑی میں جا بیٹھے۔ چلتے چلتے آندھ آ گئی۔ آخر خدا خدا کرکے نواب صاحب کا مکان آیا۔ گاڑی سے اُتر آگے مددگار صاحب اور پیچھے ہم نواب صاحب کی عالیشان اور پُرتکلّف کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ تین بج چکے تھے، مگر معلوم ہوا کہ ابھی نواب صاحب آرام میں ہیں، اس لئے دونوں کے دونوں بلیرڈ روم میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ریوٹر ایجنسی کی طرح اطلاعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے خبر آئی کہ نواب صاحب بیدار ہوئے۔ پھر اطلاع آئی کہ آنکھیں ملتے مسہری سے اُٹھے۔ پھر کہا گیا کہ ہاتھ دھو رہے ہیں۔ چوبدار پر چوبدار آتے اور بیان کرتے کہ اب یہ ہو رہا ہے، اب یہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ یہ پرچہ لگا کہ اب شیروانی کی آستین میں ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ خبر آئی تھی کہ کمرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ یا تو ہم ٹڑوں لٹوں دو ہی آدمی بیٹھے تھے۔ یا سارا کمرہ آدمیوں سے بھر گیا۔ کوئی اِدھر سے آیا۔ کوئی اُدھر سے۔ کوئی اِس کمرے سے نکلا کوئی اُس کمرے سے۔ غرض اتنے بڑے کمرے میں تِل رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ مددگار صاحب سے سب کی صاحب سلامت تھی۔ نواب صاحب ان کو بہت چاہتے تھے۔ پھر بھلا مصاحبین کا کیا حوصلہ تھا جو ان سے جُھک کر نہ ملتے۔ البتہ مجھ کو دیکھ کر ذرا کھنچتے تھے۔ اکثروں نے اپنی ناکیں ذرا ذرا اُوپر چڑھا کر چھوڑ دیں۔ بعضوں کی پیشانی

پر بل بھی آیا۔ مگر جب مددگار صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ اور یہ بتایا
کہ میں کس خاندان سے ہوں، تو ذرا ٹھنڈک پڑی۔ ایک صاحب کہنے
لگے "سبحان اللہ! اس خاندان کا کیا کہنا۔ آفتاب ہے آفتاب۔ ارے
بھئی میر صاحب! تم نہیں جانتے ان کے دادا صاحب قبلہ مرحوم و مغفور
کی لکھنؤ میں کیا قدر تھی۔ واللہ عجیب آدمی تھے۔ اور بھئی ذرا دیکھنا، ان
کی شکل مرزا صاحب مرحوم سے کتنی ملتی ہے۔ میں نے تو ان کو بڑھاپے
میں دیکھا ہے۔ واللہ جوانی میں عین بین ایسے ہی ہونگے"! مجھ کو یہ
دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ تقریباً سب کے سب مصاحبین لکھنؤ کے رہنے
والے تھے۔ بہرحال یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چوبدار نے آکر اطلاع
دی کہ سرکار برآمد ہونے والے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ سب کے سب
اپنی دستاریں سنبھالتے، کپڑوں کو ٹھیک کرتے۔ اور لگلوس باندھتے۔
باہر نکل آئے۔ اب تھوڑا سا اس مکان کا نقشہ بھی سُن لیجئے۔ کوٹھی کیا
ہے، کسی بڑے بادشاہ کا محل ہے۔ قیامت کی کرسی ہے۔ سامنے بڑا
میدان ہے۔ اس میں سے ایک چوڑی سڑک چکر کھاتی ہوئی سیڑھیوں
تک آتی ہے۔ سیڑھیوں کے بعد صحن چبوترہ اور صحن چبوترے کے بعد
پھر سیڑھیاں ہیں۔ اور یہیں سے کئی منزلہ مردانہ مکان شروع ہوتا
ہے۔ پہلی منزل میں پُرانا دقیانوسی سامان بھرا ہوا ہے۔ ان کمروں کے
سامنے جو برآمدہ ہے، اس میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں لاوارث حاجتمندوں
کے لئے پڑی رہتی ہیں۔ اِن کرسیوں سے مجھ کو بھی واسطہ پڑا ہے۔
اس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ جو بڑی سڑک چکر کھا کے محل سرا کے
دروازے کو گئی ہے۔ وہ بلیرڈ روم کے سامنے سے گزرتی ہے اور
یہاں اتنی چوڑی ہو گئی ہے کہ اچھا خاصہ صحن نکل آیا ہے۔ بلیرڈ روم
کے بالکل سامنے دوسری منزل سے نیچے آنے کا زینہ اور اس کے
بائیں طرف اُوپر کے بڑے کمرے کے سامنے چھوٹا سا چھجہ ہے۔ چھجے
کے اوپر نہایت خوبصورت نیچی سی منڈیر ہے۔ بس میرے مضمون کے
لئے مکان کا اسی قدر ہی نقشہ بالکل کافی ہے۔

خیر۔ تو ہم سب یہ سُن کر کہ نواب صاحب برآمد ہونے والے ہیں،
کمرے سے باہر نکل آئے۔ اور اس طرح لائن باندھ کر کھڑے ہوئے،

کہ یہ چھجّہ ہمارے بالکل سامنے تھا۔ بلیرڈ روم ہمارے بائیں طرف اور زینہ ہمارے دائیں جانب۔ ہر شخص کی نظر اس چھجّے پر لگی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ ہی چوبدار نے آواز دی "آداب بجا لاؤ"۔ اس آواز کے سُنتے ہی سب تو ایک دفعہ ہی رکوع میں گئے۔ مگر مَیں نے جھکنے سے پہلے ایک چلتی سی نظر نواب صاحب پر ڈال لی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب چھجّے پر کھڑے ہیں۔ مگر بالکل اس طرح کہ گویا فوٹو اُتروا رہے ہیں۔ مَیں نے ولایت کی ایک مشہور تصویر دیکھی ہے جس میں ایک بارہ سنگھے کو پہاڑ کی چوٹی پر نہایت اکڑ کر کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے نیچے لکھا ہے :-

I am the monarch of all I survey.

بس سمجھ لو کہ وہی رنگ تھا۔ نیچے صرف یہ لکھنا باقی تھا :-

"جدھر دیکھتا ہوں اُدھر میں ہی میں ہوں"۔

یہ غلط انداز نظر ڈالنے کے بعد میں بھی تسلیم کو جھکا۔ ہماری اصطلاح میں "سلام کرنا" محض ماتھے کے سامنے ہاتھ لے جانے کو کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ بڑے آدمی ہیں۔ ذرا جھک کر اس فرض کو ادا کر دو۔ جھکا۔ سلام کیا۔ اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن اِدھر اُدھر جو دیکھتا ہوں تو سب لوگ جھکے ہوئے زنا زن ہاتھ چلا رہے ہیں۔ "نقل را چہ عقل"۔ میں نے بھی غپ رکوع میں جا پہنچے کے ہاتھ چلانے شروع کر دئے مگر کن انکھیوں سے دوسروں کو دیکھتا رہا۔ جب دیکھا کہ اب سیدھے ہو گئے تو مَیں نے بھی سیدھے کھڑے ہو کر نیّت کی طرح ہاتھ باندھ لئے ؛

مگر حضرات آپ ہنستے کیوں ہیں ؟ کیا عید، بقرعید کی نماز میں اپنی حالت بھول گئے ؟ آپ ہر سال نماز پڑھتے ہوں گے۔ مگر ہر مرتبہ تکبیر کے وقت خدا کے فضل سے اِدھر اُدھر دیکھنا ہی پڑتا ہوگا کہ دوسروں کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں یا بندھے ہوئے، دوسرے رکوع میں جا رہے ہیں یا ابھی اور کوئی تکبیر باقی ہے۔ میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ پُرانی اور نئی تہذیب کی ٹکّر ہمیشہ ایسی ہی اُلجھنیں پیدا کرتی ہے۔ پھر آپ کا میرے حال پر مُسکرانا یقیناً بے جا ہے ؛

جب اس تسلیمات کے جھگڑے سے نجات پا کر میں نے اوپر نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نواب صاحب کھڑے مُسکرا رہے ہیں۔ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ میری حرکت کا اثر ہے۔ جی میں تو آیا کہ لاحول ولا قوۃ۔ تُو کس مصیبت میں پڑا۔ چل گھر چل۔ پھر سوچا ذرا یہاں کا رنگ بھی دیکھ لو۔ نئی چیز ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لطف کا بھی مزا اُٹھا لو۔ میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا۔ "اوہو! یہ ہمارے چھوٹے میاں کے ماسٹر صاحب ہیں"۔ چلو چھٹی ہوئی۔ خدا نے خود بخود تعارف کرا دیا۔ مددگار صاحب نے کہا۔ "جی ہاں"۔ نواب صاحب مُسکراتے ہوئے نیچے اُتر آئے۔ میری تعلیم کا حال پُوچھا۔ میں نے بیان کیا۔ میرے خاندان سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ نام بنام ایک ایک کا ذکر کرتے اور تعریف کرتے۔ غرض انہی باتوں میں شام ہو گئی۔ جب سب رخصت ہونے لگے تو فرمایا۔ "ماسٹر صاحب! آپ دونوں وقت آیا کیجیے۔ میں عموماً یہیں ہوتا ہوں۔ اگر یہاں نہ بھی ہوا۔ تو جہاں ہوں گا۔ چوبدار آپ کو پہنچا دیں گے"۔ دربار برخاست ہوا۔ اور سب لوگ بنگلوس کھولتے ہوئے بلیرڈ روم میں داخل ہوئے۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ "ماسٹر صاحب! آپ نواب صاحب کو مخاطب کرنے میں ہمیشہ 'آپ۔ آپ' کہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے"۔ میں نے کہا۔ "آپ نہ کہوں تو کیا 'تم' کہوں؟ اُردو میں تو 'آپ' ہی تعظیم کا لفظ ہے"۔ کہنے لگے۔ "نہیں۔ 'سرکار' کہیے۔ 'خداوند نعمت' کہیے۔ 'خاوند' کہیے"۔ میں نے کہا "میر صاحب! یہ موٹے موٹے لفظ تو مجھ سے ادا ہونے مشکل ہیں، ہاں کل سے 'سرکار' کہنے کی کوشش کروں گا"۔ مگر خدا معلوم زبان کو لفظ "سرکار" سے کیا چڑ تھی کہ کبھی یہ لفظ منہ سے نہ نکلنا تھا۔ نہ نکلا۔ اور ہمیشہ 'جناب عالی' اور 'جناب والا' ہی سے کام چلا گیا ؛

ایک دوسرے صاحب فرمانے لگے۔ "ماسٹر صاحب! آپ کا دولت خانہ بہت دُور ہے۔ صبح آ جایا کیجیے۔ دوپہر کا خاصہ یہیں تناول فرمائیے۔ شام کو تشریف لے جایا کیجیے۔ ایک کمرے میں آپ کے بیٹھنے اُٹھنے کا انتظام کیے دیتے ہیں"۔ میں نے کہا۔ "حضرت! یہ دوسروں کے مکان میں آپ انتظام کرنے والے کون؟ اگر نواب صاحب کو میرے ٹھہرانے

کا خیال ہوتا تو وہ خود ہی فرما دیتے۔ خدا میری بائیسکل کو سلامت رکھے۔ میرے لئے دور اور نزدیک سب برابر ہیں۔" وہ بیچارے شرما کر خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے ہم نے دربار کے اوقات بھی پوچھ لئے۔ معلوم ہوا کہ صبح کے نو بجے سے گیارہ بارہ بجے تک اور شام کے تین ساڑھے تین بجے سے سات آٹھ بجے تک نواب صاحب برآمد رہتے ہیں ؛

دوسرے روز ہم صبح ساڑھے آٹھ ہی بجے سے پہنچ گئے۔ ایک چوبدار سے پوچھا کہ "نواب صاحب کس طرف برآمد ہوں گے؟" اس نے کہا۔ "میرے ساتھ آئیے۔" ہم ساتھ ہو گئے۔ اُس نے لے جا برآمدے کی اُن ہی ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ جن کا میں نے کہیں اوپر ذکر کیا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا۔ نواب صاحب نہ آج نکلتے ہیں نہ کل۔ جو چوبدار ادھر سے نکلتا اس سے پوچھتا کہ "بھئی نواب صاحب آج برآمد ہونگے بھی یا نہیں؟" وہ یہی کہ کر چلا جاتا کہ "آپ تشریف رکھئے، ابھی یاد ہوتی ہے۔" جب ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اُٹھ کر دوسری پر جا بیٹھتا۔ ایک تو ٹوٹی ہوئی کرسیاں، دوسرے اس طرح جم کر بیٹھنے کی عادت نہیں، تیسرے تنہائی کی کوفت غرض کیا کہوں کہ کیا حال ہوا۔ جیب سے گھڑی نکالتا۔ دیکھ لیتا۔ ادھر پاؤں بیٹھے بیٹھے سن ہو گئے۔ ادھر دستار کے بوجھ اور بگلوس کے دباؤ نے پریشان کر دیا۔ اور ایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہو گیا۔ آخر خدا خدا کرکے دن سے بارہ بجے کی توپ چلی۔ اس وقت ایک چوبدار نے آکر کہا۔ "اب آپ جائیے۔ سرکار محل میں تشریف لے گئے۔ شام کو آئیے گا تو ملاقات ہوگی۔" کیا بتاؤں کس قدر غصہ آیا۔ لیکن جز بز ہو کر رہ گیا۔ آخر اپنی جگہ سے اُٹھا اور سائیکل سنبھال گھر آیا۔ شام کو جانے کا ارادہ نہ تھا، مگر لوگوں کے کہنے سننے پر پھر پہنچا ایک چوبدار نے لے جا کر پھر اُن ہی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ خیال تھا کہ شاید اس مرتبہ مشکل آسان ہوگی۔ مگر وہاں کون کس کو پوچھتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے شام کے چھ بج گئے۔ اس وقت میں نے دل میں کہا۔ "حضرت اگر یوں ہی اتھ پاؤں توڑے بیٹھے رہے تو تمام عمر بھی نواب صاحب کو اطلاع نہ ہوگی۔ چلو بغیر اطلاع ہی پہنچ جاؤ۔ راستہ تو معلوم ہے۔ ہو نہ ہو

نواب صاحب اسی طرف ہوں گے جدھر کل تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بلا اطلاع چلے آنے پر خفا ہو جائیں گے۔ خفا ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔ تم رُوٹھے ہم چھوٹے۔" یہ سوچ کرسی سے اُٹھا۔ کمرے میں سے ہو بلیرڈ روم میں آیا۔ یہاں نواب صاحب کی آواز صاف آ رہی تھی۔ اس آواز کی سیدھ میں چلا۔ دیکھا تو کمرے کے باہر ہی نواب صاحب اور ان کے سب مصاحب کھڑے ہیں۔ میں بھی جا تسلیمات بجا لایا۔ اس مرتبہ اس پڑھے ہوئے سبق کو ذرا اچھی طرح دھرایا۔ پُرانے مشّاقوں کی طرح ہاتھ میں لوچ تو نہ تھا۔ بلا سے نہ ہو۔ مگر ہاتھ کے جھٹکے سات کے بجائے اَن گِنت دے ڈالے۔ جب اس کارروائی سے فارغ ہُوا تو نواب صاحب مُسکرا کر کہنے لگے "اجی ماسٹر صاحب! آپ صبح کو کہاں غائب رہے؟ مجھ کو تو آپ کا بڑا انتظار رہا" میں نے کہا "جناب عالی! میں تو صبح کو بھی آیا تھا۔ مگر کسی نے اطلاع ہی نہیں کی۔ آخر بارہ بجے چلا گیا۔ اب بھی وہی صورت پیش آتی۔ اگر میں خود بغیر اِطلاع نہ چلا آتا" یہ سُن کر نواب صاحب کو بہت غصّہ آیا۔ کہنے لگے "آپ آئے تھے؟ اور مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس کے کیا معنی۔ میں نے تو کل ہی کہہ دیا تھا کہ میں جہاں بھی ہوں آپ کو اطلاع کر دی جائے" میں نے کہا "دیکھئے وہ چوبدار صاحب جو پیچھے کھڑے ہیں انہوں نے ہی مجھے وہاں ٹوٹی ہوئی کرسیوں پر لے جا کر بٹھایا تھا اور کہا تھا کہ 'ابھی سرکار برآمد نہیں ہوئے'۔ کئی دفعہ یہ بعد میں ادھر سے گزرے بھی مگر ہمیشہ میرے پوچھنے پر یہی جواب دیا کہ 'ابھی عرض کرتا ہوں'۔ اور وہ جو ان کے برابر کھڑے ہیں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو آٹھ دس مرتبہ اُن سے کہا۔ مگر انہوں نے صرف گردن کے جھٹکے ہی پر ٹالا۔ جتنے چوبدار تھے سب نیلی پیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر میں نے جب تک سب کی خبر نہ لے لی چُپکا نہ ہُوا۔ ایک چوبدار نواب صاحب کے بہت منہ چڑھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ ہمّت کر کے آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر کہا "سرکار! مگر میں نے ان کو آگے چلنے نہ دیا اور کہا "کیا سرکار سرکار لگائی ہے۔ کوئی بات میں نے غلط کہی ہے جس کی اب آپ صحت فرما رہے ہیں۔

بس خاموش رہو۔ اس طرح باتوں میں دخل دینا تمہارا کام نہیں ہے۔"
وہ پھر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کہ مَیں نے 'خاموش' اس زور سے کہا کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ بیچارے سمجھے ہونگے کہ کہیں یہ حضرت زبان سے ہاتھ پر نہ اُتر آئیں۔ پہلے تو نواب صاحب کی پیشانی پر کچھ بل آئے مگر پھر ہنسنے لگے۔ سمجھے ہوں گے کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہے۔ مگر اس روز سے چوبداروں کا یہ حال ہو گیا کہ میری شکل سے گھبراتے تھے۔ مَیں گیا۔ اور وہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "آئیے آئیے"۔ نواب صاحب کہیں ہوں، مجھے فوراً ہی وہاں پہنچا دیتے۔ نواب صاحب کے چاہیتے چوبدار صاحب تو ایسے پریشان ہو گئے تھے کہ اگر میں جاتا اور نواب صاحب واقعی محل میں ہوتے تو مجھ سے کہتے کہ "ماسٹر صاحب! سرکار محل سے ابھی برآمد نہیں ہوئے۔ آپ جا کر خود کمرہ دیکھ لیجئے ایسا نہ ہو کہ آپ سمجھیں میں غلط عرض کر رہا ہوں۔"

علم مجلس کا رنگ جیسا میں نے یہاں دیکھا، نہ پہلے کبھی دیکھا نہ دیکھنے کی آرزو ہے۔ اس نوابی دربار میں میری صاف گوئی بعض وقت عجیب رنگ لاتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت دربار گرم تھا کہ دو سائیس صاف ستھری وردیاں پہنے۔ ریشمی باگ ڈوریں ہاتھ میں لئے ایک خوبصورت گھوڑے کو ملاحظے کے لئے لائے۔ یہ گھوڑا اُسی دن آسٹریلیا سے آیا تھا۔ اور نواب صاحب نے کوئی تین ہزار روپے کو خریدا تھا۔ گھوڑے کو نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے شکر کھلائی۔ کچھ پڑھ کر اُس کی پیشانی پر دم کیا۔ اور کہا "بھئی عجیب چیز ملی ہے"۔ بس اتنا سُننا تھا کہ مصاحبوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دئے۔ غرض دو گھنٹے تک یہی بے سر و پا گفتگو ہوتی رہی۔ شامتِ اعمال دیکھو کہ نواب صاحب کا ایک اور گھوڑا تھا۔ اس کو یہ بہت ہی چاہتے تھے۔ جب تعریفوں کی کوئی انتہا نہ رہی تو نواب صاحب کو ڈر ہؤا کہ کہیں میرا پیارا گھوڑا۔ اس نئے گھوڑے سے نہ دب جائے۔ تو انہوں نے کہا "یہ سب کچھ سہی مگر ہمارے گھوڑے (نام بتانا گویا سارے راز کا انکشاف کرنا ہے) سے اچھا تھوڑا ہی ہو سکتا ہے"۔ یہاں تو سب سرکار کے نوکر تھے۔ بیگن کے نوکر تو تھے ہی نہیں۔ فوراً بدل گئے۔ ایک صاحب کہنے لگے "خداوندِ نعمت! بھلا

گھوڑوں کے تذکرے میں اس کو کیسے لایا جا سکتا ہے! وہ گھوڑا تھوڑی ہے۔
وہ تو انسان ہے انسان!!" ان کا اتنا کہنا تھا کہ یار لوگوں کو گفتگو کا
سلسلہ مل گیا۔ اب کیا تھا۔ اس دوسرے گھوڑے کی تعریف میں زمین
آسمان کے قلابے ملا دئے۔ جب کہیں جا کر نواب صاحب کو تسکین
ہوئی۔ اس طرف سے ذرا فراغت پائی تو نواب صاحب نے میری طرف
دیکھ کر ارشاد فرمایا "مرزا صاحب! آپ نے اس گھوڑے کے متعلق کچھ
نہیں کہا"۔ میں نے عرض کی "جناب عالی! مجھے نہ اس بارے میں کوئی
واقفیت ہے اور نہ تعریف کرنے کے لئے الفاظ۔ میں سرے سے گھوڑے
پر چڑھنا ہی نہیں جانتا۔ سائیکل پر سوار ہوتا ہوں۔ اس کا ایک ایک
پرزہ پہچانتا ہوں۔ ماشاء اللہ جب اتنے واقف کار لوگ تعریف کر رہے
ہیں۔ تو گھوڑا اچھا ہی ہوگا۔ اگر سچ پوچھئے تو میں اس تمام گفتگو میں یہ
بھی نہیں سمجھا کہ گھوڑے کے کس کس جوڑ بند کی تعریف ہو رہی ہے"۔
نواب صاحب یہ سُن کر مُسکرانے لگے۔ خیر ان ہی باتوں میں کوئی آٹھ بج
گئے، اور دربار برخاست ہوا۔ اب دوسرے دن شام کا ذکر سُنئے کہ نواب
صاحب نے حکم دیا۔ "ہمارا نیا گھوڑا لاؤ۔" سائیس اسی طرح بنا سنوار کر
گھوڑے کو لائے۔ مگر بجائے چلنے کے وہ پھُدکتا ہوا آیا۔ چار ٹانگ
کے گھوڑے کی جگہ تین ٹانگ کا گھوڑا رہ گیا۔ یہ دیکھنا تھا کہ نواب
صاحب آگ بگولا ہو گئے اور اس سرے سے اس سرے تک سارے
سائیسوں اور کوچوانوں کو لے ڈالا۔ مصاحبوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
ایک صاحب نے اس ٹانگ ٹوٹنے کو جادو کا اثر بتایا۔ دوسرے نے
سائیس کی لاپروائی کو سبب ٹھہرایا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں مگر آخرکار
بغلبۂ آرا یہ تصفیہ ہوا کہ دوسرے گھوڑوں کے سائیسوں نے جل کر اس
کی ٹانگ توڑ ڈالی ہے۔ قرار پایا کہ تمام سائیس یک قلم موقوف۔ میں
نے جو ان غریبوں پر بلا وجہ آفت آتے دیکھی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔
آگے بڑھ کر کہا "جناب والا! کل تعریفوں کے جوش میں خیال نہیں فرمایا
گیا کہ یہ گھوڑا لنگڑا ہے۔ اگر ذرا غور سے گھوڑے کو ملاحظہ فرمایا گیا
ہوتا تو کل ہی معلوم ہو جاتا کہ یہ گھوڑا تین ٹانگ کا ہے۔ کل بھی
چلنے میں یہ ایک پاؤں پر زور نہیں دیتا تھا" میرا یہ کہنا تھا کہ جتنے

لوگ وہاں کھڑے تھے، سب نے بڑے بڑے دیدوں سے میری طرف دیکھا۔ لیکن کچھ کہنے کی کسی کو ہمّت نہ ہوئی۔ جانتے تھے کہ جھاڑ کا کانٹا ہو کر کہیں رپٹ نہ جائے۔ نواب صاحب کو بھی ذرا معلوم ہوا۔ کہنے لگے۔ "ماسٹر صاحب! اگر آپ کو معلوم ہوا تھا کہ گھوڑا لنگ کرتا ہے تو کل ہی کیوں نہ کہا؟" میں نے کہا۔ "جناب عالی! جب اتنے حضرات تعریف کر رہے ہوں تو بھلا میری کیا مجال ہے جو ان سب کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکوں۔ اگر یہ حضرات گھوڑے کی تعریف کے بجائے میری مذمّت پر اُتر آتے تو میں کہاں ان سے پیچھا چھڑاتا پھرتا۔ میں سمجھا کہ گھوڑے کا لنگڑا پن بھی کوئی تعریف ہے جو اس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔" نواب صاحب نے فرمایا۔ "ان سے نہیں تو چپکے سے مجھ ہی سے کہ دیا ہوتا۔" میں نے کہا۔ "عالی جناب کو تعریفیں سُننے ہی سے کب فرصت تھی جو مجھے کچھ عرض کرنے کا موقعہ ملتا۔" قصّہ مختصر سارا الزام میرے سر منڈھ دیا گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بیچارے سائیسوں پر سے آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔ سب مصاحبوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ماسٹر صاحب کے پاؤں یہاں جم گئے تو انہوں نے بھی مجھ سے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔ بلاتے۔ پاس بٹھاتے۔ پان کھلاتے۔ اِدھر اُدھر کی غپیں اُڑتیں۔ شعر و سخن کے چرچے رہتے۔ غرض کچھ دنوں اچھی گزری۔ میں اس زمانے میں تحت اللفظ خوب پڑھتا تھا۔ سب نے صلاح دی کہ نواب صاحب کی مجلسوں میں تم بھی دو ایک مرتبہ پڑھو۔ نواب صاحب سُن کر بہت خوش ہونگے۔ میں راضی ہو گیا۔ چند ہی روز بعد محرّم آگیا۔ نواب صاحب کو شاید کسی نے اطلاع کر دی تھی۔ انہوں نے فرمایا۔ "ماسٹر صاحب! آپ بھی مجلسوں میں شریک ہوا کیجئے۔" میں نے کہا۔ "بہت خوب۔" دوسرے روز شام کے ۷ بجے مجلس میں شریک ہوا۔ مجلس زنانہ مکان میں ہوئی اندر پردہ ہو گیا۔ محل سرا کے وسط میں جو عمارت ہے اس کے دالانوں میں پردے ڈال کر دو حصّے کر دئے۔ ایک حصّے میں مردانہ دوسرے میں زنانہ۔ اندر کا حال تو معلوم نہیں۔ مگر مردانے حصّے کا کل فرش سیاہ تھا۔ چاندنیاں سیاہ۔ گاؤ تکئے سیاہ۔ قالین سیاہ۔ منبر سیاہ۔ یہاں تک کہ تمام گھر والوں کا سارے کا سارا لباس

دستار سے لگا کر جرابوں تک سیاہ۔ نواب صاحب منبر کے سامنے قالین پر گاؤ تکیہ لگا کر اور تمام صاحبزادے ان کے کچھ ادھر کچھ اُدھر بیٹھ گئے۔ چھوٹی صاحبزادی صاحبہ تھیں۔ وہ نواب صاحب کے پہلو میں آبیٹھیں اور اشارے کے ساتھ ہی مجلس شروع ہوئی۔ پہلے سوز خوانی ہوئی۔ یہ نہ پوچھو کہ کس طرح ہوئی۔ کئی سوزخواں تھے۔ شاید ہی کسی کو چند منٹ پڑھنے کو دئے ہوں۔ ورنہ جس کو اور جہاں کہیں نواب صاحب نے چاہا روک دیا۔ روکنے کے لئے صرف ہاتھ کا اشارہ کیا جاتا تھا کہ "بس"۔ ایک صاحب چار مصرعے پڑھنے کے بعد ٹیپ اُٹھانا چاہتے تھے کہ "بس" کا ارشاد ہوا۔ اور ان کی آواز کو پنجم سے مدھم پر آنا نصیب ہوا۔ جب یہ جماعت ختم ہوئی تو تحت اللفظ پڑھنے والوں کی باری آئی۔ کسی نے خوش قسمتی سے چار پانچ بند پڑھ لئے تو کمال کیا۔ ورنہ دو ہی بندوں پر بند کر دئے گئے۔ اس سلسلے کے ختم ہونے کے بعد حلقے کا ماتم شروع ہوا۔ ماتم کے بعد ہی مجلس ختم ہوئی۔ باہر نکل کر سب نے اصرار کیا کہ "کل آپ بھی پڑھئے"۔ میں نے کہا "حضرت میں مجلس کا رنگ دیکھ چکا۔ بھلا ایسے پڑھنے میں کیا لطف اور سننے میں کیا مزا۔ مجھے تو معاف ہی فرمائیے"۔ مصاحبین میں سے ایک میر صاحب تھے۔ بڑے بامزہ آدمی تھے۔ کہنے لگے "مرزا صاحب! آج جن لوگوں نے پڑھا، وہ پڑھنا نہیں جانتے۔ کل میں دکھاؤں گا کہ کیونکر پڑھتے ہیں۔ دیکھوں تو نواب صاحب بیچ میں کیونکر روک دیتے ہیں"۔ دوسرے دن جب میر صاحب کی باری آئی تو انہوں نے مرثیے کو بجائے ابتدا سے پڑھنے کے وسط سے شروع کیا۔ اور پہلے ہی بند پر میدان میں اُتر آئے۔ مرثیہ واقعی اچھا تھا۔ سب لوگ نہایت غور سے سُن رہے تھے۔ میر صاحب نے تلوار تول کر اُٹھائی۔ چاہتے تھے کہ ہاتھ ماریں، کہ "بس" کا اشارہ ہوا۔ اور میر صاحب تلوار علم کئے ہوئے منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ اس کے بعد سب نے مجھ پر زور دیا کہ پڑھو۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے ایک آدھ دفعہ اشارتاً فرمایا۔ مگر میں ٹال گیا۔ اور اس طرح سُنتے سُنتے یہ مجلسیں ختم ہو گئیں ؏

محرم کی تیرھویں یا چودھویں تاریخ تھی۔ صبح نو بجے کا وقت تھا۔ دربار جما ہؤا تھا۔ معلوم نہیں کیوں ایک دفعہ ہی نواب صاحب کو کچھ خیال آگیا۔ حکم دیا کہ "ہمارے جواہر خانے سے چھوٹا صندوقچہ لاؤ"۔ چوبدار صندوقچہ لے آیا۔ اوپر کارچوبی کام سے بپا ہؤا سبز مخمل کا غلاف۔ اندر ہاتھی دانت کا صندوقچہ۔ صندوقچے پر گنگا جمنی جالی کا کام۔ ایسی خوبصورت چیز تھی کہ کیا کہوں؟ نواب صاحب نے صندوقچہ کھولا۔ پہلے ایک انگوٹھی نکالی۔ اس کو دیکھا بھالا اور رکھ دیا۔ اس کے بعد سونے کی ایک جڑاؤ گھڑی نکالی۔ اس کو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا اور رکھ دیا۔ پھر ایک چھوٹے چھوٹے سبز دانوں کی تسبیح نکالی۔ اچھی طرح دیکھی بھالی اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں سمجھا کہ مجھے دکھانے کو دیتے ہیں۔ میں نے تسبیح لے کر خوب غور سے دیکھا مگر سمجھ میں نہ آیا کہ شیشہ ہے یا زمرّد۔ دیکھنے کے بعد جس طرح تھی اسی طرح واپس کر دی اور کہا "جناب والا! مجھے جواہر کی پرکھ نہیں ممکن ہے زمرّد ہو۔ کسی جوہری کو دکھائیے۔ وہ مجھ سے بہتر بتا سکے گا"۔ نواب صاحب نے مسکرا کر تسبیح صندوقچے میں بند کی اور صندوقچہ واپس بھیج دیا۔ جب دربار برخاست ہؤا تو یار لوگوں نے میرا مذاق اُڑانا شروع کیا کہ "واہ ماسٹر صاحب! خوب سمجھے! اجی حضرت! تسبیح آپ کو سرفراز ہوئی تھی۔ آپ نے غضب کیا کہ واپس کر دی۔ سلام کر کے لے لیتے۔ نذر گزرانتے۔ بھلا ایسے موقعے کہیں روز روز ملتے ہیں؟ ہم کو دیکھنے کے لئے بھی کوئی چیز دی جاتی ہے تو ہم سلام کر کے اپنی کر لیتے ہیں"۔ میں نے کہا "حضرت! یہ لوٹ مار آپ ہی کو مبارک ہو۔ اگر نواب صاحب کا ارادہ تسبیح دینے ہی کا تھا تو زبان کس نے بند کی تھی؟ بھلا میری عمر دیکھو اور تسبیح کی سرفرازی دیکھو اس بے جوڑ عطا کا مطلب بغیر سمجھائے سمجھنا میرے لئے دشوار ہی نہیں۔ ناممکن تھا"۔

اس واقعے کے چند ہی روز بعد سے ہمارے علی گڑھ جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گھر میں کیا کیا انتظام ہوئے۔ اس کا علم تو اللہ کو ہے۔ ہاں باہر جو کچھ لاؤ لشکر جمع کیا گیا، اس کا حال سُن لیجئے۔ ایک روز شام کے چار بجے کے قریب چھوٹے صاحبزادے صاحب محل سرا سے باہر

تشریف لائے۔ نواب صاحب نے فرمایا۔" بادشاہ! لو اب تم جو چیزیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو چھانٹ لو۔ ماسٹر صاحب بھی موجود ہیں۔ یہ بھی اس انتخاب میں مدد دینگے" سب سے پہلے گاڑی گھوڑوں کا انتخاب شروع ہوا۔ پڑھنے جا رہے تھے۔ پھر بھی نواب کے بیٹے تھے۔ اللہ کے فضل سے چار گاڑیاں اور چھ گھوڑے پسند کیئے۔ اس کے بعد ملازمین کے چھانٹنے کی باری آئی۔ چار خدمت گار۔ دو پاؤں دبانے والے۔ ایک کہانی کہنے والا دو باورچی۔ آٹھ سائیس۔ اس طرح خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی بیس پچیس آدمی منتخب ہوئے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔" جناب والا! یہ صاحبزادے صاحب پڑھنے جا رہے ہیں یا کہانیاں سُننے۔ پاؤں دبوانے؟ یہ گاڑیاں گھوڑے استعمال کے لیئے جا رہے ہیں یا پروسیشن نکالنے؟ بھلا اس لاؤ لشکر کے ساتھ تعلیم کیا خاک ہوگی؟ جن صاحب کا انتخاب اس بھیرو بنگاہ کی نگرانی کے لیئے ہؤا تھا۔ وہ بگڑ کر بولے۔" ماسٹر صاحب! نواب صاحب کے صاحبزادے تعلیم کے لیئے جا رہے ہیں، میرے یا آپ کے بچے نہیں جا رہے ہیں کہ ایک صندوق اُٹھایا اور نکل کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا۔" اور ہاں جناب عالی! یہ بھی تو بتا دیا جائے کہ خیر میں تو صاحبزادے صاحب کا اتالیق بن کر جا رہا ہوں، کیا یہ حضرت میرے اتالیق ہو کر تشریف لے جا رہے ہیں!" ان کے لیئے تو میرا ایک ہی فقرہ کافی تھا۔ بیچارے خاموش ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ طوطی کی آواز نقّار خانے میں کوئی نہیں سُنتا تو میں بھی لاحول پڑھ کر خاموش ہوگیا؂

اس واقعہ کو تین روز گزر گئے۔ ایک دن۔ رات کو جب آٹھ بجے کے قریب دربار برخاست ہونے لگا تو نواب صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔" ماسٹر صاحب! آج رات کو ہم سب چھوٹے میاں کو پہنچانے کے لیئے علی گڑھ جا رہے ہیں۔ آپ بھی دو بجے اسٹیشن پر آ جائیے۔" میں نے عرض کی۔" عالی جناب! میں نے ابھی تک چلنے کی کوئی تیاری نہیں کی ہے۔ اور نہ میں ایسے فوری حکم کے لیئے خود تیار تھا۔ آپ تشریف لے جائیے۔ میں انشاءاللہ دو تین روز بعد پہنچ جاؤنگا۔" الغرض یہ تصفیہ ہؤا کہ تیسرے روز میں یہاں

سے روانہ ہوں۔ اور اس وقت تک نواب صاحب وہیں تشریف فرما ہیں؛

دوسرے روز صبح ہی میں نے روانگی کی تیاریاں شروع کیں۔ شام کو مددگار صاحب سے ملنے گیا۔ ان سے معلوم ہوا کہ نواب صاحب دو تین ہی اسٹیشن گئے تھے کہ نزلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ مع مصاحبین واپس تشریف لے آئے۔ مگر صاحبزادے صاحب اور ان کا لشکر آگے چلا گیا۔ مددگار صاحب سے مل کر میں نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دیکھا خاصے بھلے چنگے ہیں۔ ایک آدھ چھینک آ گئی تھی۔ ڈر ہوا کہ کہیں نمونیا نہ ہو جائے۔ اس لئے واپس تشریف لے آئے۔ دوسرے دن پھر گیا۔ نواب صاحب نے ایک تار میرے ہاتھ میں دیا۔ صاحبزادے صاحب کا تار تھا کہ "کالج والوں نے تمام ملازمین اور گاڑی گھوڑوں کو بورڈنگ میں رکھنے سے انکار کر دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اگر اس کالج میں رہنا ہے تو صرف ایک اتالیق اور ایک نوکر کے ساتھ آکر رہو۔ ورنہ کوئی دوسرا کالج تلاش کرو۔" اس تار نے تمام مصاحبین میں ایک جوش پھیلا دیا۔ کوئی کہتا تھا۔ خداوند نعمت! یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں۔ بھلا کیا جانیں کہ نوابوں کے لڑکے کس طرح رہتے ہیں اور کس طرح تعلیم پاتے ہیں؟ یہ تو گدھے گھوڑے دونوں کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔ خدا کے واسطے صاحبزادے صاحب کو بلوا لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اُن کے دُشمن بیمار پڑ جائیں۔" میں نے کہا "میر صاحب! جب نوابی ہی کرنی ہے تو پڑھانے سے فائدہ؟ نواب بن کر نہیں پڑھا جاتا۔ طالب علم بن کر پڑھا جاتا ہے۔ صاحبزادے صاحب کو اگر نواب صاحب بالکل میرے سپرد کر دیں تو میں دو ہی برس میں دکھا دوں کہ کیا سے کیا ہو گیا۔" یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسرا تار آیا۔ لکھا تھا "میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ واپسی کی اجازت دی جائے۔" میں نے بہتیرا سر مارا۔ مگر میری ایک نہ چلی اور تار دے دیا گیا۔ "فوراً چلے آؤ۔" جب طالب علم ہی نہ رہا تو اتالیق کیسا۔ میں نواب صاحب کو اس روز جو آخری سلام کر کے آیا تو وہ دن اور آج کا دن؛ پھر کبھی نہیں گیا۔ مدتیں گزر گئیں۔ بھول گئے ہونگے مگر مجھے پرانی اور نئی تہذیب کی یہ ٹکر ہمیشہ یاد رہیگی؛

تم ہمیں بھول گئے ہو صاحب؛ ہم تمہیں یاد کیا کرتے ہیں؛

آباد ہیں۔ اور انہیں کے طفیل سیر و سفر کے لئے ہر طرح کی آسائشیں یہاں مہیّا ہیں۔ الپس کی کئی چوٹیوں تک ہلکی ہلکی ریل جاتی ہے۔ اس کی سڑک کو دُور سے دیکھیں تو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی قلّۂ کوہ تک چلی گئی ہے۔ گاڑی کو اس ڈھلوان سڑک پر لے جانے کے لئے اس کے انجن اور گاڑیوں کی ساخت میں ایسی کلیں لگائی گئی ہیں، جن سے گاڑی قابو میں رہے اور نیچے کو لڑھک نہ جائے۔ جھیل کی سیر کے لئے ہر وقت دخانی جہاز چلتے ہیں، جو مختلف قابلِ سیر موقعوں پر ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں اور ہر جگہ لوگ اُتر کر آگے تھوڑی دُور پیدل سَیر و تماشے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے سوا گاڑیاں ہیں۔ گھوڑے ہیں۔ ہاتھ سے چلانے کی کشتیاں ہیں۔ جس مذاق کا کوئی آدمی ہو، اپنی پسند کی سواری ڈھونڈ لے اور سیر کرتا پھرے۔ سبزہ و گل اور کوہ و دریا کے تماشے کے ساتھ شہروں کی زندگی کے مزے ملانا چاہے، تو جھیل کے کنارے گھنے سایہ دار درختوں کی دوہری قطار ہے۔ وہاں کرسیاں اور بنچیں رکھی ہیں۔ لوگوں کا جماؤ رہتا ہے۔ بیٹھ جائے اور تماشا دیکھا کرے۔ شام کے قریب باجا بجتا ہے۔ شام کے بعد ناٹک وغیرہ کے تماشے شروع ہوتے ہیں۔ جھیل کے کنارے روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ اور مکانوں کے لیمپ اور سڑک کی لالٹینیں اپنا عکس پانی میں ڈالتی ہیں اور عجیب بہار دیتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شہروں کی ان معمولی دلچسپیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہو اور گوشۂ تنہائی کا متلاشی ہو، تو وہ آبادی سے کچھ دُور نکل جائے۔ چاروں طرف مناظرِ قدرت اس کے مونس و ہمدم ہونگے۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہوگی اور برف پوش پہاڑوں کی دل لبھانے والی ہوا۔ وہ ہوگا اور اس کے خیالات۔ نہ کوئی روکنے والا نہ کوئی ٹوکنے والا، نہ اس تخلیے میں خلل ڈالنے والا۔ اگر کہیں اس شوق کا مارا اسی کا ہمخیال کوئی اور بھی آ نکلا تو وہ اس گوشے کو آباد پاکر خود ہی اور گوشہ ڈھونڈ لے گا۔

ہماری سیر ان دونوں قسموں سے علیحدہ تھی۔ ہمارا اس پر عمل تھا کہ جی بھر کر دیکھنا میسّر نہ ہو تو نہ ہونے سے ایک جھلک بھی بہتر

ہے۔ جیسے تیتری باغ کی سیر کرتی ہے، ایک پھول سے دوسرے پر۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است

اسی طرح ہم تھے کہ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا نمونے دیکھتے پھرتے تھے۔ ہر نئے مقام کو ابھی پہلا سلام۔ ابھی آخری سلام۔ جانتے تھے کہ یہی ایک نظر ہے، جس کی اجازت ہے۔ پھر کہاں ہم اور کہاں یہ حسن قدرت وصنعت کے جلوے۔

۱۹ر جولائی ۱۹۰۶ء۔ **عجائب خانہ صلح و جنگ**۔ لوسرن میں پہلی چیز جو ہم نے دیکھی، وہ عجائب خانہ تھا۔ بیس مختلف حصّوں میں منقسم ہے۔ اس میں آلاتِ حرب اور طریقِ جنگ میں قدیم زمانوں سے لے کر آج تک جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، سلسلہ وار دکھائی گئی ہیں اور اس کی منشا تحریک صلح عام کی تائید ہے۔ داخل ہوتے ہی ایک بڑا ہال ہے جو اسلحۂ جنگ سے پُر ہے۔ وسط میں توپیں رکھی ہیں۔ پُرانی سے پرانی توپوں سے لے کر زمانۂ حال کی کرپ توپوں تک یہاں موجود ہیں اور ہر ایک کے اوپر لکھا ہے کہ کونسی کس زمانے کی یادگار ہے۔ دیواروں پر ایک طرف نیزے۔ برچھیاں۔ تلواریں اور دوسری طرف طرح طرح کی بندوقیں سج رہی ہیں۔ ایک کمرہ اسلحۂ روما کے لئے ہے اور ایک ازمنۂ متوسطۂ یورپ کے لئے۔ جنگِ سی سالہ اور جنگِ ہفت سالہ میں جو اسلحہ استعمال ہوئے تھے ان کا علیحدہ مجموعہ ہے۔ پہاڑی لڑائی کا سین جُدا ہے، اور جنوبی افریقہ کی جدید لڑائی کا جُدا۔ یہ نظارے تاریک کمروں میں بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں کہ دیکھنے والا اندھیرے میں ہوتا ہے اور سپاہیوں کی تصویروں اور اسلحہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے گرد جنگل پہاڑ اور لڑائی کے میدان کا نقشہ ہو بہو دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر میں جنگِ روس و جاپان بھی موجود ہے۔ قلعہ بندی کے دستور کی ترقی کے مختلف مدارج۔ بیماروں اور زخمیوں کے اُٹھانے اور لے جانے کی تدابیر۔ جنگ میں عارضی پُل بنانے اور توڑنے کے نمونے۔ بحری لڑائی کی خصوصیّات۔ سب کا ایک خاکہ ذہن میں آ جاتا ہے۔ ان سب کے بعد صلح کا محل آتا ہے۔ وہاں یورپ کے سب بڑے

بڑے مدبروں کی تصویریں رکھی ہیں جو صلح عام کے حامی ہیں اور جو مجالس صلح میں شریک ہو چکے ہیں ان تصویروں میں ایک ایرانی مدبّر کی تصویر دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا: ارفع الدّولہ مرزا رضا خاں دانش۔ پرنس صلح" اہل یورپ نے آج کل ایسی باتوں کا کچھ ایسا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ ہمیں کسی ایشیائی کا مدبّروں کی صفِ اوّل میں کھڑا ہونا غنیمت معلوم ہوًا ÷

اس کمرے میں جس پر صلح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مختلف زبانوں میں صلح سے متعلق کتابیں اور رسالے اور اخبارات رکھے تھے جن میں سے اکثر مفت تقسیم ہونے کے لئے تھے اور ہر شخص مجاز تھا کہ ان میں سے چند چُن لے۔ ہم نے چند پرچے وہاں سے لئے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوًا کہ ٹرکی کے ارمنی وغیرہ باشندوں کے بعض نہایت جوش دلانے والے رسالے فرانسیسی زبان میں جن میں ترکوں کو یورپ سے نکالنے اور ان کے خلاف اہلِ یورپ کو اُکسانے کے مضمون مندرج تھے۔ وہ بھی انہی کاغذاتِ صلح میں رکھے تھے۔ کیا مجلسِ صلح ایسی ہی تدابیرِ صلح پھیلانے کی کر رہی ہے اور ان کے قول و فعل میں ایسی ہی مطابقت چاہیئے؟ حقیقت یہ ہے کہ صلح عام کی تحریک سے مدبّرینِ یورپ کا مقصودِ اصلی فقط اسی قدر ہے، کہ یورپ کی عیسائی سلطنتوں میں صلح رہے اور وہ سب مل کر باقی دنیا پر اپنا غلبہ اور اقتدار قائم رکھیں۔ لیکن حقیقی صلح ممکن نہیں، جب تک دولِ یورپ اور ان کے مدبّروں کے دماغ سے اپنے مقبوضات کی توسیع کی ہوس اور ایشیائی ممالک اور اقوام و مذاہب کی حقارت کا خیال نہ نکل جائے۔ کیونکہ یہی دو خیال سب فساد کی بنا اور جنگ و جدال کی جڑ ہیں۔ اس صلح و جنگ کے عجائب خانے میں آلاتِ حرب اور نمائشِ جنگ کو اسبابِ صلح سے جو نسبت ہے، غالباً وہی نسبت ابھی یورپ میں شوقِ جنگ و شوقِ صلح میں قائم ہے۔ صلح کے متعلق باتیں ہیں اور دوسروں کو نصیحتیں اور اپنے ہاں ہر قوم روز بروز زیادہ سے زیادہ روپیہ سامانِ جنگ پر صرف کر رہی ہے اور یورپ کی ذہانت اور اس کے علوم و فنون کی ترقی ایسی ایجادات کے کام آ رہی ہے کہ وقتِ جنگ زیادہ سے زیادہ انسان

تھوڑے سے تھوڑے وقت میں کس طرح بے جان کیئے جا سکتے ہیں اور زمین سے گولے مارنے کے بجائے آسمان پر چڑھ کر کس طرح آہن و آتش کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے ؟

برفانی باغ۔ اس عجائب خانۂ صنعت سے نکل کر ہم ایک عجائب خانۂ قدرت کی طرف گئے جسے یہاں "گلیسیر گارڈن" یعنی تودہ ہائے برف کا باغ کہتے ہیں۔ برف کے یہ تودے اس زمانے کی یادگار ہیں، جب سارا سوئٹزرلینڈ برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ یہ زمانہ تاریخی کتب سے بہت پہلے گزرا ہے۔ ماہرانِ علم طبقات الارض نے اس کا پتہ چلایا ہے اور اب وہ یقینی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک وقت میں رُوئے زمین کا سارا شمالی حصہ ایک سطح برفانی تھا۔ کہیں اتفاق سے کوئی جگہ خالی تھی، تو وہاں بھی حضرت انسان کا وجود نہ تھا۔ البتہ کچھ حیوانات تھے مگر اب ان حیوانات کی نسل بھی مقطوع ہے۔ کہیں کہیں ان کے پنجر اور ہڈیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساخت کیا تھی۔ اور موجودہ جانوروں سے کس قدر نرالی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس برفانی عہد سے قبل ایک زمانہ ایسا تھا کہ ساری زمین پر پانی ہی پانی تھا مگر اس وقت اُس زمانے سے بحث نہیں، بلکہ صرف عہدِ برف سے کام ہے۔ جس کی یہ حیرت انگیز نشانی لوسرن میں موجود ہے۔ برف کے پگھلنے سے جو سیلاب پہاڑوں کے اندر رواں ہوا، اس میں کئی بڑے بڑے تودے برف کے پگھلنے سے جو بچ رہے، بہتے ہوئے آئے اور اپنے زور میں پتھروں کو تراشتے ہوئے آخر خود ایک بھنور میں آ پھنسے۔ یعنی ایسی جگہ پہنچے جہاں وہ چاروں طرف مضبوط چٹانوں سے گھر گئے۔ اب "نہ روئے ماندن نہ راہ رفتن"۔ جائیں تو کہاں جائیں۔ پانی ہے کہ اُوپر سے برابر آ رہا ہے اور انہیں حرکت دیئے جاتا ہے۔ مگر یہ قلعہ بند ہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر آرام سے بیٹھے تھے اپنی جگہ چھوڑ کر اس مصیبت میں آن پھنسے کہ رات دن ایک مقام پر چکی کی طرح گھوم رہے ہیں۔ خود بھی گھستے ہیں، پتھروں کو بھی گھساتے ہیں !!

یہ خدمت صدیوں سے ان کے سپرد ہے۔ نہ کبھی رخصت نہ تعطیل۔ اتنی خیریت تھی کہ چشم مردم سے ان کی یہ سزا پوشیدہ تھی۔ مگر آج کل انسان کو یہ جرأت ہوئی ہے کہ ہر جگہ کارخانۂ قدرت سے پردۂ راز اٹھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بے چارے معتوب تودہ ہائے برف کی پردہ دری بغیر بھی نہ رہا۔ ۱۸۷۲ء

تک یہ قطعۂ زمین، جہاں اب یہ عجیب برفانی باغ ہے، ایک چراگاہ تھا اور اس کی ہری ہری گھاس کے نیچے یہ برفانی کارخانہ جاری تھا۔ مگر کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ اتفاق سے ایک جگہ زمین میں سوراخ ہو گیا اور وہاں سے اس برفانی چکی کی آواز آئی۔ کھودنے پر یہ عجوبہ نظر آیا۔ اور پھر ایک چکی کے دریافت ہونے سے اسی قرب میں کئی اور چکیاں نکل آئیں اور یہ حصہ تماشائیوں کو محوِ حیرت کرنے کے لئے آراستہ کر دیا گیا۔ اس کھدائی میں اس عہد کے جانور اور درخت ملے، جو پتھر کی طرح سخت بن چکے تھے۔ اب لوگ جوق جوق ان عجائبات کو دیکھنے آتے ہیں۔ تواریخ و جغرافیہ دونوں علوم کے شائقوں کی دلچسپی کا سامان یہاں موجود ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے قدیم باشندوں کی جھونپڑیوں، ان کے ہتھیاروں اور اوزاروں کے نمونے بھی اس احاطے میں ایک جگہ دکھائے گئے ہیں اور عام تماشائیوں کی دلچسپی کے لئے ایک نہایت خوش وضع بھول بھلیاں بنائی گئی ہے جو عربوں کے مشہور قصر الحمرا کی بھول بھلیاں کی نقل ہے بھول بھلیاں سے نکلتے ہی باغ کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جہاں چٹان کاٹ کر ایک بہت بڑا شیر بنایا گیا ہے، جس پر شہر لوسرن کو ناز ہے۔ اور جو فی الواقع سنگ تراشی کا عمدہ نمونہ ہے۔

باغ سے لوٹتے ہوئے ہوف کرک جو کیتھولک مذہب کا بڑا گرجا ہے، رستے میں پڑتا تھا۔ ہم نے اسے بھی ایک نظر دیکھا۔ بلندی پر واقع ہے اور بہت سی سیڑھیاں چڑھ کر اس کے دروازے تک پہنچتے ہیں۔ عام طور پر عیسائی گرجاؤں میں ایک مخروطی مینار ہوتا ہے۔ اس گرجا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دو مخروطی مینار بنائے گئے ہیں، جنہیں جڑواں مینار کہتے ہیں۔ گرجا کے اندر لکڑی کا کام بہت خوبصورت بنا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی کی ساخت کا نمونہ ہے اس زمانے میں اہلِ سوئٹزرلینڈ کو لکڑی کے کام کا بہت شوق تھا۔ گو اب بھی وہ اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اس گرجا کی شہرت صرف اس کی بڑائی اور وسعت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے ارغنوں کی وجہ سے ہے۔ یورپ کے گرجاؤں کے ارغنوں بجائے خود عجائبات ہیں۔ دھات کی لمبی لمبی بانسری نما نالیاں متوازی رکھ کر ایسی بلند اور سریلی آواز پیدا کی جاتی ہے کہ گرجا گونج اٹھتا ہے۔ فن موسیقی کے ماہر ایک ایک ارغنوں کی ساخت میں اپنا کمال صرف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ ارغنوں جو ہوف کرک کی زینت ہے۔ گائسلر نامی ایک استاد نے ۱۶۵۰ء میں بنایا تھا۔ اس

کے بعد ہاس نامی ایک اور استاد نے ۱۸۶۲ء میں اس کی تجدید کی۔ ۱۸۹۸ء میں پھر اس کی مرمت ہوئی ہے۔ چار ہزار نو سو پچاس بنسریاں اس ارغنوں میں ہیں۔ لوگ دُور دُور سے اس کا راگ سُننے آتے ہیں۔ شام کے وقت ہر روز یہ ارغنوں بجتا ہے۔ اور اس وقت کا داخلہ ایک فرانک (دس آنے) ہوتا ہے؛

جھیل کی سَیر۔ جھیل لوسرن، جس سے شہر لوسرن نے نام پایا ہے، اس ملک کی نہایت خوبصورت جھیلوں میں سے ہے۔ اور بعض اعتبارات سے سب سے بڑھ کر گنی جاتی ہے اس کا طول ۲۳ میل ہے۔ اور عرض آدھے میل سے لے کر تین میل تک ہے۔ چاروں طرف بلند پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں اور درمیان میں یہ جھیل عجب بہار دیتی ہے۔ جس سیّاح کو فرصت ہو وہ یہاں مہینوں رہے اور روز کشتی میں بیٹھ کر سیر کو جائے۔ جہاں کہیں خشکی پر اُتر کر کوہستان کی سَیر کرے گا، اس کے لئے کوئی نہ کوئی قابلِ دید منظر موجود ہوگا۔ ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دی گئی تھی۔ اس لئے ہم گرجا سے واپس آتے ہی کشتی پر بیٹھ کر جھیل کی سیر کو نکلے۔ مطلع صاف تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گرد و پیش کے مناظر مزا دے رہے تھے۔ ابھی لطف سے سیری نہ ہوئی تھی، کہ وہ سٹیشن آگیا جہاں سے ہلکی پہاڑی ریل پر بیٹھ کر کوہ الپس کی مشہور چوٹی "رگی کلم" کی سیر کو جاتے ہیں۔ ہم وہیں اُتر پڑے اور ریل پر سوار ہو لئے؛

رگی کلم کا منظر۔ ریل سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ پر چڑھنے لگی ایسی ایسی ڈھلوان چوٹیوں پر چڑھتی ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ اب گری اب گری۔ مگر فنِ انجنیئری کی خوبی دیکھئے۔ گاڑیوں اور آہنی سڑک دونوں کی ساخت میں وہاں یہ خصوصیّت پیدا کی ہے کہ گاڑیاں لڑھکنے نہ پائیں۔ اور مزید احتیاط کے لئے اُوپر جاتے وقت انجن نیچے سے اوپر کو دھکیلے لئے جاتا ہے اور رگی پر جا کر ٹھہرتا ہے۔ جو اس سطح سے، جہاں سے ریل چلی تھی، چار ہزار تین سو ساٹھ فٹ اور سطحِ سمندر سے پانچ ہزار نو سو پانچ فٹ بلند ہے۔ صبح و شام سینکڑوں تماشائی اس چوٹی پر موجود رہتے ہیں اور جو تماشہ وہاں انہیں نظر آتا ہے۔ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ تصوّر کیجیئے کہ چودہ جھیلیں چھوٹی بڑی اور ان کے گرد کے اشجار و انہار۔ کوہ وہامون۔ شہر و قریے سب وہاں سے نظر آتے ہیں اور یہ سین اہلِ نظر کے

دل چھین لیتا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس سے ذرا اونچی چوٹیاں اُسی کے قریب برف سے ڈھپی ہوئی نظر آتی ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی عورتیں جو مناظرِ قدرت کی شناسا آنکھ رکھتی ہیں، اس جنّت نگاہ کی داد دیتے دیتے دیوانی ہوئی جاتی ہیں۔ "اہاہا! ادھر دیکھنا کیسا دلفریب سین ہے۔ اہو ہو! اُدھر دیکھو کتنا پیارا نظارہ ہے۔" ایشیائیوں میں اگر کوئی حسنِ قدرت کا مزا لینے کی قابلیت رکھتا ہو یا پیدا بھی کر لے تو یہ جوش کہاں سے لائے گا اور حسنِ قدرت کے رو برو یہ زبان آوری کہاں سے پائے گا۔ یہاں تو حسن چپ لگا دیتا ہے اور اس کا رُعب مہرِ لب بن جاتا ہے۔ ہم چپ چاپ اس عجیب نظارے کو دیکھا کئے۔ اور اِرد گرد کے شور سے بے پروا شام تک اسی محویت میں پڑے رہتے۔ اگر ریل کی سیٹی یہ یاد نہ دلا دیتی کہ شام سے پہلے واپس جا کر جھیل کے کنارے چراغاں کی سیر بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ اُٹھے مگر بادِل ناخواستہ۔ اسی چوٹی پر ایک بڑا عالیشان ہوٹل مسافروں اور تماشائیوں کے آرام و تفریح کے لئے بنا ہؤا ہے۔ وہ سامنے تھا اس کی صورت اور اس کے خوشنما صحن میں میزوں کے ارد گرد لوگوں کے جمگھٹے دیکھ کر ہمیں بھی یاد آیا کہ چائے کا وقت ہے۔ وہاں چاء پی لی۔ تازہ دم ہوئے اور ریل پر پہنچے۔ واپسی پر ریل تیز تر چلی۔ کوئی آدھ گھنٹے میں جھیل کے کنارے تھے۔ وہاں کشتی فوراً مل گئی اور ہم اپنی قیامگاہ کے قریب آ پہنچے تھوڑی دیر تک کنارِ آب سَیر کرتے رہے۔ آخر تھک کر ہوٹل میں آئے۔ کھانا کھایا اور سو گئے، کیونکہ سفرِ اٹلی درپیش تھا؛

۲۰ جولائی ۱۹۰۶ء۔ لوسرن میں ایک دن اور ایک رات ٹھہر کر ہم اٹلی کی طرف روانہ ہوئے۔ دن کے دس بجے جو گاڑی چلی، اس نے پانچ بجے کے قریب ہمیں اٹلی کے مشہور شہر میلان میں پہنچا دیا۔ دن بھر سوئٹزرلینڈ کے نظر فریب سین آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور پُرلطف سفر کیا ہوتا۔ مگر ہر پھول کے ساتھ کانٹا لگا ہؤا ہے۔ راستے میں اس قدر ٹنل پڑے کہ دھوئیں کے مارے بار بار دم گھٹتا تھا۔ روح کو جو تازگی اور فرحت سبز پوش پہاڑوں، ان کی سفید چوٹیوں اور ان کے آبشاروں کو دیکھ کر ہوتی تھی وہ سب اس دھوئیں سے مبدّل بہ پریشانی ہو جاتی تھی۔ کبھی صنعت اور اہلِ صنعت پر غصّہ آتا تھا کہ

انہوں نے اپنی طمع کی خاطر قدرت کے پاکیزہ اور شاندار مناظر کے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔ اور ان کی عمدگی اور پہاڑوں کے سکون میں کتنا خلل ڈالا ہے۔ مگر ساتھ ہی انصاف یہ کہتا تھا کہ ان کی کوہ کنی کی داد دی جائے اور چونکہ ان کا منشاء ان کارناموں سے محض ذاتی فائدہ یا ذاتی نمود نہ تھا، بلکہ ان کی یہ کوشش تھی کہ ہزاروں بندگانِ خدا جو ویسے ان نظاروں سے بالکل محروم رہتے انہیں ان سے بہرہ ور کیا جائے۔ اس لئے ان کی محنتیں شکریے کی مستحق ہیں نہ کہ شکایت کی۔ یہ ٹنل ہی ہیں۔ جن کی بدولت گویا زمین کی طنابیں کھینچ کر عصر جدید کے ان فرہادوں نے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کو ملا دیا ہے۔ سب سے بڑا ٹنل جو ہمارے راستے میں پڑا، وہ سینٹ گاتھرڈ کا مشہور ٹنل تھا جس کے اندر ریل آدھ گھنٹے کے قریب رہی۔ اس سے دوسری طرف ملک کا نقشہ بدلنے لگا۔ بلند پہاڑوں کی جگہ میدان نظر آنے لگے مگر یہ میدان سرسبزی میں رشکِ گلزار تھے۔ تھوڑی دیر بعد آسمان کے صاف نیلگوں رنگ اور آفتاب کی تیز چمک نے خبر کر دی کہ اٹلی کی تاریخی سرزمین شروع ہوئی۔ اسٹیشنوں کے ناموں نے اس خبر کی تصدیق کی۔ لوگانو۔ کیاسو۔ کاموٗ جس نام کو پڑھو واؤ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ احساس کہ ہم اٹلی میں ہیں، ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ انگلستان اور فرانس کے مصنّفین نے نظم و نثر میں اٹلی کی اس قدر تعریف کی ہے، کہ سینکڑوں فسانے اور ڈرامے یہاں کے قصّوں پر مبنی ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا تاریخ یورپ پر بالخصوص اور تاریخ عالم پر بالعموم اتنا اثر پڑا ہے کہ اس میں داخل ہوتے ہی خود بخود طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی سرزمین بُت پرست روما کی شاہنشہی دیکھ چکی ہے۔ یہی پاپائے اعظم کے خود مختارانہ تسلّط سے پامال ہو چکی ہے۔ اور یہی کچھ عرصہ ہوا، اپنے میزینی اور گیرے بالڈی کے ذریعے دُنیا کو سبق آموز آزادی دے رہی ہے۔ یہی وہ ملک ہے جس نے فنِ تصویر و بُت تراشی کو کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اور جہاں اب بھی ان فنون کے طالب مشق فن بہم پہنچانے اور اساتذہ کی صحبت سے مستفید ہونے آتے ہیں۔ اور یہی ملک ہے جہاں کے باشندوں کو حسن صورت میں یورپ کے شمالی ممالک سے امتیاز حاصل ہے۔ صباحت اور ملاحت میں یہاں آشتی ہے۔ اور بہت سی صورتیں ایسی نظر آتی ہیں۔ جن میں حسینانِ انگلستان کا

سرخ و سفید رنگ ۔خوبانِ فرانس کی نزاکت اور ماہ رویانِ مشرق کی سی سیاہ آنکھیں، سب خوبیاں یکجا پائی جاتی ہیں۔ جوں جوں ریل میلان کے قریب ہوتی جاتی تھی شوق بڑھتا جاتا تھا۔ یہ غنیمت ہؤا کہ ریل شام سے پہلے پہنچ گئی۔ سٹیشن پر لکھا دیکھا، میلانو، اور جی خوش ہو گیا۔ اُترتے ہی ایک ہوٹل میں اسباب رکھ بازار کا رخ کیا اور شام کے وقت کو یوں استعمال کر لیا۔ سفر کی کوفت نے شب گردی کی قابلیت باقی نہ چھوڑی تھی۔ اس لئے رات کو بے ہوش لیٹ گئے اور دوسرے دن صبح سے باقاعدہ سیر شروع ہوئی ؂

۱۲ر جولائی ۔ اٹلی میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ خوبصورت صاف اور کھلی سڑکوں اور ایسی سربفلک عمارات کو چھوڑ کر جو ہندوستان کے بڑے شہروں کلکتے اور بمبئی میں بھی کمیاب ہیں۔ وہاں کئی باتیں ہمارے ملک سے ملتی جلتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آب و ہوا ہے۔ گرمی کے موسم میں گرمی خاصی پڑتی ہے اور شام کے وقت لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کر باہر بیٹھتے ہیں کہ ذرا ہوا لگے۔ مکانوں میں بھی ایک مشرقی رنگ موجود ہے۔ مثلاً بہت سے مکان امرا کے ایسے نظر آئے جن کے بہت بڑے بڑے دروازے ہیں اور ان دروازوں کے اندر صحن اور صحن میں چھوٹے چھوٹے باغیچے ہیں، بجائے اس کے کہ باغیچہ۔ مکان کے گرد ہو جیسے انگریزوں میں رواج ہے۔ امراء اور شرفاء کی عورتیں سوائے اس کے کہ گاڑیوں میں شام کے وقت سیر کو نکلیں بازار میں بہت کم نکلتی ہیں۔ دوپہر کے وقت کاروبار کچھ سست رہتا ہے اور لوگ دوپہر کی نیند کے مزے سے آشنا ہیں۔ مقامِ غور ہے کہ آب و ہوا کسی ملک اور اہلِ ملک کی عادات پر کتنا زبردست اثر رکھتی ہے۔ بازاروں اور کوچوں میں شور بھی اٹلی میں انگلستان اور فرانس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے کئی لوگ جو ٹوکریوں میں رکھ کر یا چھکڑوں میں لاد کر ترکاری یا پھل پھول بیچتے ہیں، وہ تو اس طرح آواز لگاتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے دوکاندار۔ یہاں تک کہ میں نے میلان میں ایک صبح ایک فقیر کو بھی صدا دیتے سُنا اور یورپ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایسی صدا میرے کان میں پڑی۔ اٹلی کا ٹھیک اندازہ لگانے کے لئے روما کو دیکھنا ضرور ہے۔ مگر افسوس تنگیٔ وقت نے ہمیں میلان اور وینس صرف دو مشہور مقامات کی سیر پر قناعت کرنے پر

مجبور کیا اور انہیں بھی جی بھر کر دیکھنے کا موقعہ نہ دیا۔

میلان میں ایک بڑی نمائش انہی دنوں میں ہو رہی تھی۔ اور یہ نمائش انٹرنیشنل یعنی بین الاقوامی تھی۔ ہمارا بہت سا وقت اس نمائش میں صرف ہوُا۔ لیکن اس کے تفصیلی حالات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف اسی صورت میں دلچسپ ہوتے کہ انہی دنوں میں لکھے جاتے جب نمائش جاری تھی۔ اس زمین کا یہ رقبہ جس میں یہ نمائش ہو رہی تھی دس لاکھ مربع گز یعنی پیرس کی مشہور نمائش کے قریب قریب، تھا۔ اور اس سارے رقبے کا تیسرا حصّہ نمائش کی عمارات سے گھرا ہوُا تھا۔ آسٹریا۔ بلجیم۔ بلگیریا۔ کینیڈا۔ چین۔ کیوبا۔ ڈنمارک۔ فرانس۔ جرمنی۔ جاپان۔ انگلستان۔ ہالینڈ۔ پرتگال۔ سوئٹزرلینڈ۔ ٹرکی اور ایران یہ سب ممالک اس نمائش میں شریک تھے۔ اور سب نے اپنی اپنی مصنوعات کے نمونے اس میں بھیجے تھے۔ ایک ہال میں بحری سامان کی نمائش تھی۔ ایک میں ریل کے انجنوں اور گاڑیوں کے عمدہ ترین نمونے رکھے گئے تھے اور اس صیغے میں جرمنی۔ آسٹریا اور ہنگری میدانِ مقابلہ میں اترے تھے۔ زراعت کے صیغے میں کینیڈا کا حصّہ نہایت خوبصورت اور شاندار تھا۔ بازارِ مصر کا نمونہ لوگوں کی تفریح کے لئے وہاں رکھا گیا تھا۔ جس میں قاہرہ کی زندگی کے خراب پہلو دکھانے کی کوشش غالب نظر آتی تھی۔ اہلِ یورپ مشرقی زندگی کی تصویر جب کبھی کھینچ اور اپنے وطن کو دکھاتے ہیں تو اس کے تاریک پہلو کو ہی لیتے ہیں۔ ٹرکی اور ایران کے قالین عمدگی میں لاجواب تھے۔ مگر افسوس کہ اور کوئی مصنوعات وہاں سے قابلِ نمائش نہ نکلیں۔ ہماری آنکھیں نمائش میں ہندوستان کو ڈھونڈتی تھیں کہ کہیں اس کا بھی شمار بین الاقوام ہے یا نہیں؟ آخر بہت تلاش سے خیمۂ انگلستان کے سایۂ عاطفت میں کچھ جے پور کے ظروف اور کچھ بنارس کے دوپٹے ایک الماری میں سجے ہوئے نظر آئے۔ معلوم نہیں کس وجہ سے خود انگلستان کا حصّہ اس میں بہت خفیف تھا۔ پس اس حصّے میں سے ہندوستان کے حصّے میں کیا آتا۔ ہاں جو موجود ہوگیا یہی غنیمت۔ لیکن ہمارے ملک کو آئندہ ایسے مواقع سے فائدہ اُٹھانے اور ہندوستان کی مصنوعات کو دنیا کی منڈیوں میں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کی بہت سی صنعتیں مٹ گئیں اور مٹتی جاتی ہیں۔ تس پر بھی ابھی یورپ و امریکہ کے خوش مذاق اور انصاف پسند قدر دانوں سے باج تعریف لینے کے لئے دستکاری کے کافی نمونے

ہم جمع کر سکتے ہیں، اگر ہم اطرافِ ہند سے بہترین مصنوعات جمع کرنے کی کوشش کریں ؛

۲۲ر جولائی۔ نمائش میں کام کی چیزوں کے علاوہ جن سے تجارت اور صنعت کی ترقی کا حال دکھلانا مقصود ہوتا ہے، ہمیشہ بہت سے کھیل تماشے لوگوں کو کھینچنے کے لئے لگے ہوتے ہیں۔ چونکہ ان دنوں میں نمائش کے سبب لوگوں کا مجمع زیادہ نمائش میں ہی ہوتا تھا اور شہر کی سڑکیں سوائے شام کے وقت کے سونی پڑی تھیں۔ اس لئے ہم نے ۲۲ر جولائی کا بھی بیشتر حصہ نمائش میں ہی کاٹا اور وہاں کے دلچسپ تماشوں میں سے بعض تماشے دیکھے ؛

۲۳ر جولائی۔ شہر میلان میں سب سے بڑھ کر قابلِ دید چیز وہاں کا گرجا ہے جس کا شمار دُنیا کی مشہور ترین عمارتوں میں ہے۔ باہر سے تو ہم نے اُسے آتے ہی دیکھ لیا تھا۔ آج اندر سے بھی دیکھا اور اس کی چھت پر بھی چڑھے۔ یہ شہر کے مرکز میں واقع ہے۔ ہمارا ہوٹل بھی اس کے قریب تھا۔ اور جب ہم باہر نکلتے تھے تو راستے کا پتہ لگانے میں ہمیں اس سے بہت مدد ملتی تھی اور کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ ورنہ زبان نہ جاننے کے سبب بہت مشکل ہوتی۔ اس گرجا کو یہاں ڈومو کہتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ شاید اس سے زیادہ خوبصورت گرجا دنیا میں نہیں ہے۔ ۱۳۸۶ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ عجیب بات یہ ہے کہ گرجا بننے سے پہلے بھی یہ زمین معبد کے طور پر ہی استعمال ہوتی تھی اور یہاں منروا دیوی کی پرستش کے لئے ایک مندر تھا۔ بنا ہونے کے وقت سے آج تک کم و بیش زیرِ تعمیر ہی رہا ہے۔ نپولین اوّل نے اس کے جلد مکمل کرنے میں بہت کوشش کی۔ مگر جلدی کا کام ویسا نفیس نہ بنا جیسا باقی حصے کا کام ہے۔ جو پہلے سے تیار ہو چکا تھا۔ اندر باہر اس کی آرائش میں جو محنت صرف ہوئی ہے وہ دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتی ہے۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے میناروں اور کنگروں کے ساتھ ساتھ چھ ہزار قدِ آدم بُت استادہ ہیں۔ جو آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جس کونے سے اس عمارت کو دیکھو، ایک نیا حسن نظر آتا ہے۔ اور ہر در و دیوار سنگِ مرمر کے عمدہ کام کا نمونہ ہے۔ اس کی عمارت جیسی باہر سے خوشنما ہے، اسی قدر اندر سے شاندار ہے۔ ہم نے جس دن اِسے دیکھا، اُس دن ایک بہت بڑا مجمع کیتھولک مردوں اور عورتوں کا اس میں مصروفِ عبادت تھا۔ مگر عمارت کا فقط

ایک گوشہ ان سے آباد تھا اور باقی جگہ خالی تھی ؛

ڈومو کے علاوہ اور بھی شاندار عمارتیں اس شہر میں ہیں۔مگر ایسی اہمیت نہیں رکھتیں۔شہر کے ہر چوک میں یا اور نمایاں مواقع پر بہت سی روئیں اور سنگین بُت استادہ ہیں جو اہلِ ملک کے مذاقِ بُت تراشی اور قدردانیٔ بزرگان ملک و ملت پر دلالت کرتے ہیں۔یہاں لوگوں کی عادات اور چلنے پھرنے میں وہ چستی اور چالاکی جو شمالی یورپ کی اقوام کا خاصہ ہے نظر نہیں آتی اور آرام طلبی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔فرانس کی طرح یہاں کے لوگ بھی باتیں کرتے وقت اپنے شانے ہلاتے ہیں۔کھانے کا طریق گو سارے یورپ میں ایک ہے، پھر بھی اہلِ اٹلی کے کئی کھانے ہمارے ہاں کے کھانوں سے ملتے ہیں۔خصوصاً سویّوں کا یہاں بہت رواج ہے۔شوربے میں ڈال کر کھائی جاتی ہیں۔حلوے یا کھیر کی صورت میں میٹھی پکائی جاتی ہیں۔تلی ہوئی بھی کہیں کہیں بکتی ہیں۔گانے کا شوق ان لوگوں کو بہت ہے اور اب تک یورپ کے بہت سے مشہور گویّے اٹلی سے آتے ہیں۔لباس میں بھی رنگینی یہاں زیادہ پائی جاتی ہے۔فرانسیسی کی طرح اہلِ اطالیہ کی زبان بھی شیریں ہے اور ایک خاص نرمی اور ملائمت ان کے لہجے میں ہے۔جو انہی کا حصّہ ہے۔اطالی زبان فرانسیسی زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی بھی ہے۔ایک جگہ اس مشابہت سے خوب کام نکلا۔فرانسیسی میں "توت" کُل کو کہتے ہیں۔مجھے معلوم نہ تھا کہ اطالی میں بھی اس کے لئے یہی لفظ ہے۔صرف تلفظ میں ذرا فرق ہے۔ایک رسٹوران میں ہم بیٹھے تھے۔وہاں کے ملازم سے کھانا مانگا۔مگر گونگوں کی طرح فہرست لے کر ایک چیز پر انگلی دھرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ لاؤ۔وہ جاتا تھا اور آکر کہتا تھا "ترمیناتو"[1] یعنی ختم ہو گیا۔اب نہیں جانتے تھے کہ اسے کیونکر کہیں کہ کچھ باقی بھی ہے یا نہیں۔جب دو تین دفعہ اس نے یہی جواب دیا۔میں تنگ آگیا اور میں نے فرانسیسی لفظ کو اطالی صورت دی اور خفا ہو کر اس سے کہا "توتو ترمیناتو" یعنی سب کچھ ختم ہو گیا؟ اتفاق سے یہ فقرہ درست تھا۔وہ چونکا ہوا اور اس نے وہ چیزیں گِن دیں جو اس کے پاس موجود تھیں اور ان سے انتخاب کر کے ہم نے اپنا پیٹ بھر لیا ؛

---

[1] یہی لفظ ہے جو انگریزی میں بھی مستعمل ہے "ٹرمی نیٹ" یعنی ختم ہو گیا ؛

فسانۂ آزاد

از پنڈت رتن ناتھ سرشار

ایک شعبدہ باز

لب جویبار ایک فراخ وسیع میدان پُر بہار ہے۔ یہ سرسبز و شاداب مقام کسی زمانے میں تاجدارانِ ثریا جاہ و خسروانِ کجکلاہ کا عشرت کدہ تھا۔ اور گو لب رود بار واقع ہونے سے اب بھی پُر فضا اور نزہت افزا ہے، لیکن جو لطف پیشتر تھا۔ وہ اب کہاں۔ ممکن کیا تھا۔ پرندہ پر مارتا۔ اب یہ حال ہے کہ جا بجا کھنڈل اور پرانی عمارات عالیشان کی گری پڑی دیواروں کے ڈھیر ہیں۔ کہیں اونچا کہیں نیچا۔ اگلے وقتوں کے لوگ بیان کرتے ہیں کہ زمانۂ سابق میں خاص اس مقام پر نور کا عالم تھا۔ ایک احاطۂ فراخ میں، جس نے دو میل زمین گھیرلی تھی، سو کمرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے بنے تھے۔ جس کی تعمیر میں شاہ فردوس آرامگاہ نے کم سے کم کروڑ روپیہ صرف کیا تھا۔ عمارت قابل دید تھی بلکہ دید تھی نہ شنید تھی۔ شاہ کجکلاہ کو صفائی کا انتہا سے زیادہ خیال تھا۔ اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ اُن سو کمروں میں سے اگر کسی میں ایک پرکاہ بھی نظر آتا تو خسروِ ذی جاہ از بس بد دماغ ہو جاتے اور جب تک کامل طور پر چپہ چپہ صاف نظر نہ آتا کھانا نہ کھاتے۔ خدام با ادب، مزاج دان اور خوش سلیقہ تھے۔ ہزار ہا آدمی خاص اس غرض سے نوکر تھے کہ صفائی کی طرف بدل متوجہ رہیں۔ ایک ایک کمرے میں لاکھوں کا اسباب اور سامان شاہی ہردم مہیّا رہتا تھا۔

نقل ہے کہ ایک مرتبہ ایک شعبدہ باز نے جو امریکہ کے ملک سے آیا تھا اور اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتا تھا شاہ عالی مقام ذی المجد والاحترام کو انواع و اقسام کے نادر نادر شعبدے دکھائے اور خلعت پر خلعت پائے۔ ایک روز خسروِ عالی پایگاہ نے حکم دیا کہ ہم کو کوئی ایسا شعبدہ دکھاؤ جو کسی خاقانِ جہاں و شہنشاہِ زمان نے نہ دیکھا ہو۔ شعبدہ باز نے کہا۔ خدا کے

فضل سے مجھے اس فن میں وہ ملکہ حاصل ہے کہ اگر پیٹ بھر کھانا پاؤں اور حضور میرے کمال کی قدر دانی فرمائیں۔ تو تمام عمر روز ایک نیا شعبدہ دکھاؤں۔ تین دن کی مہلت کا طالب ہوا اور اقرار کیا کہ تیسرے روز شعبدہ کامل فن بحضور شاہ حاضر ہوا اور بصد ادب عرض کی کہ غلام حسب اقرار حاضر ہوا ہے۔ جس وقت حکم ہو شعبدہ دکھاؤں۔ شاہ عالی مرتبت نے بہ طیب خاطر فرمایا کہ آج سہ پہر کو مابدولت و اقبال ملاحظہ فرمائیں گے۔

حسب الحکم سلطان شہر بھر میں منادی کی گئی کہ آج سہ پہر کو ایک شعبدہ باز چابکدست جو اپنے فن کا مسلّم الثبوت اُستاد ہے۔ اور جس کی شعبدہ بازی کے تمام عالم میں جھنڈے گڑے ہیں۔ حضرت ظلّ سبحانی خلیفۃ الرحمانی کی فرمائش کے بموجب ایسا شعبدہ دکھانے والا ہے جو دُنیا سے نرالا ہے۔ جس کسی کو دیکھنا منظور ہو حاضر آئے۔ کرّم دھم۔ کرّم دھم۔ اہل شہر وقت معیّنہ پر جوق جوق آئے اور تھوڑی دیر میں کئی میل تک ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ ایک عالم مشتاقِ نظارۂ شعبدۂ دلربا تھا۔ جب جہاں پناہ کے حضور میں باریابان دربار سلطان نے گزارش کی کہ پیر و مرشد لکھوکھا آدمی جمع ہیں تو جہاں پناہ نے فرمایا کہ شعبدہ باز فوراً حاضر آیا۔ جھک کر سات بار آداب بجا لایا۔ شاہ گیتی پناہ نے فرمایا کہ ساری خلقت مابدولت و اقبال کے فرمان واجب الاذعان کے بموجب حاضر آئی ہے۔ کوئی ایسا شعبدہ دکھاؤ کہ حاضرین و ناظرین میں سے ایک آدمی بھی محروم نہ جائے۔ شعبدہ باز نے دست بستہ عرض کی کہ جہاں پناہ کے ارشاد واجب الانقیاد کی بجا آوری بسر و چشم منظور۔ لیکن جان جوکھم ہے۔ بس اِتنا خیال رہے۔

یہ کہہ کر شعبدہ باز جو ایک خوبرو جوانِ طنّاز تھا۔ شعبدہ دکھانے کے لئے آمادہ ہوا۔ بامِ فلک احتشام پر بیش بہا شال کا بلند و وسیع و فراخ و فسیح خیمہ نصب ہوا۔ اور خسروِ ذی شان مع شاہزادگان عالم و عالمیان بصد آن بان متمکن ہوئے۔ شعبدہ باز نئے قسم کے زرق برق کپڑے پہن کر اپنی چھولداری سے باہر آیا اور خوشنما پٹارا کھول کر حاضرین کو دکھایا کہ اگر کسی شخص کو شک ہو تو بغور دیکھ لے۔ اس پٹارے سے ایک کم سن حسین و مہ جبین عورت نکلے گی۔ جہاں پناہ نے حکم دیا کہ پٹارا ہمارے پاس حاضر

کیا جائے۔ اُسی دم چوبداروں نے چٹکیوں میں پٹارا جہاں پناہ کے پاس پہنچایا اور بادشاہ نے مع شاہزادگان نامدار کے چوطرفہ بہت غور سے دیکھا۔ مگر پٹارے میں ایک سوراخ بھی نہ پایا۔ متحیّر ہو کر وزرائے سلیقہ شعار اور اراکین باوقار سے کہا کہ ذرا سوچو۔ اس پٹارے میں کیونکر انسان چھُپ سکے گا۔ وزراء نے بغور دیکھ بھال کر عرض کی کہ جہاں پناہ بجز حیرت کے اور کیا گزارش کریں۔ اتنا سا پٹارا، اس میں بلی کا بچّہ تک نہ بیٹھ سکے، بھلا عورت کیونکر چھپ رہے گی۔ ایک ضعیف الاعتقاد آدمی نے کہا جہاں پناہ! یہ سب جادو کا کھیل ہے۔ مگر شاہِ ثریّا جاہ جادو ٹونے کے قایل نہ تھے۔ مسکرا کر خاموش ہو رہے اور پٹارا شعبدہ باز کے پاس بھیج دیا۔ اس نے پھر بہ آوازِ بلند کہا کہ جس کسی کو شک ہو خود دیکھ لے۔ ایسا نہ ہو کہ جب اس پٹارے میں سے عورت نکلے تو لوگ اپنے اڑھائی چاول گلائیں۔ جس کا جی چاہے، اسی دم عقل دوڑائے اور جو کچھ کہنا ہو کہ لے۔ اتنا ذرا سا پٹارا اور ایک سوراخ تک نہیں اور ہلکا پھلکا۔ پچاس ساٹھ آدمی بھیڑ کاٹ کر شعبدہ باز کے پاس آئے۔ اِدھر اُدھر ہر سمت پٹارے کو دیکھا مگر اپنا سا منہ لے کر چل دیے۔ ایک شہزادۂ گردوں مدار نے حکم دیا کہ دس معتبر اور ذی شعور آدمی پٹارے سے دس دس قدم کے فاصلے پر علیٰحدہ علیٰحدہ کھڑے دیکھتے جائیں کہ عورت اس میں سے کیونکر آتی ہے۔ شعبدہ باز نے پٹارا بند کر دیا اور تھوڑی دیر تک زبانِ انگریزی میں کچھ کہا اس کے بعد باآوازِ بلند للکارا کہ پٹارے کی طرف دیکھتے رہو۔ عورت اس میں موجود ہے وہ آئی۔ وہ آئی۔ نکل۔ نکل۔ نکل۔ نکل۔ ایک دفعہ ہی بندوق سر کی۔ داہیں پلک جھپکنے کی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ پٹارے کا ڈھکنا از خود اُچک کر وہ گرا اور چودہ پندرہ برس کی ایک گلبدن غنچہ دہن یورپین لیڈی کا جھمکڑا نظر آیا ؏

تماشائی دنگ کہ یہ مہ پارہ پری چہرہ اس پٹارے میں سے کیونکر آئی۔ شعبدہ باز نے کیا آفت ڈھائی کہ لاکھوں آدمیوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر پٹارے میں سے یہ صورت زیبا دکھائی۔ جہاں پناہ نے خوش ہو کر فرمایا کہ ایک کمرے کا سارا سامان تم کو بخش دیا۔ شعبدہ باز نے

فرط غرور سے کہا کہ جہاں پناہ! ابھی میرا شعبدہ ختم نہیں ہؤا ہے - یہ فقط ایک چٹکلا تھا۔ شاہ عالی مقام اور بھی محظوظ ہوئے اور بصد شوق تماشا دیکھنے لگے۔شعبدہ باز نے ایک ہاتھ بھر کی رسی سب کو دکھائی اور کہا کہ یہ ہاتھ بھر کی رسّی کائنات الجوّ کی حد تک پہنچے گی جو یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں ایک دیو رہتا ہے۔ جس کا نام ونٹوسس ہے وہ دیو اس رسّی کے دیکھتے ہی از بس خشمگیں ہوگا اور طیش کھا کر چاہے گا کہ کل رسّی کو گھسیٹ لے۔ میں اس کا سرا نہ چھوڑونگا۔ وہاں مجھ سے اور دیو سے لڑائی ہوگی۔ اور خدا نے چاہا تو میں سُرخ رُو آؤں گا۔ لوگوں نے اس بیان کو غور سے سُنا۔ اور حسب درخواست شعبدہ باز پانچ سو آدمیوں کو حکم دیا گیا کہ بہ آواز بلند کل حاضرین کو اس بیان سے مطلع کریں۔ رسّی جو دیکھی گئی تو بس ایک ہاتھ بھر کی تھی بڑھتی تھی نہ گھٹتی تھی۔ رسّی لے کر شعبدہ باز نے پھر انگریزی میں کچھ کہا اور ایک مرتبہ بندوق داغ کر رسّی جو پھینکی تو بڑھتی ہی چلی گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے عرصے میں لوگوں نے دیکھا کہ آسمان سے جا لگی اور کھٹ کی آواز آئی۔ حاضرین مقام مذکور کے علاوہ ان لوگوں نے بھی یہ انوکھا شعبدہ دیکھا جو شہر میں تھے۔ اس وقت یہ کیفیت تھی کہ کوٹھے پھٹے پڑتے تھے۔ ہر محلّے کے زن و مرد کوٹھوں پر سے سیر دیکھتے تھے۔ جسے دیکھو آسمان کی طرف نظر ہے۔ ادھر کھٹ کی آواز آئی۔ ادھر آسمان پر گل لالہ کھل گیا۔ تماشائیوں کی آنکھیں جھپک گئیں۔ شرق سے غرب تک آسمان سرخا سرخ نظر آتا تھا۔ اس کے بعد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا۔ اب لوگ متوحش ہوئے کہ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تاریکی بھی دُور ہو گئی۔ مگر ایک سیاہ فام آدمی نظر آیا۔ ٹانگیں بیس بیس گز کی۔ ہاتھ۔ پاؤں۔ آنکھ۔ ناک۔ کان سب بھیانک۔

رسّی کو شعبدہ باز نے بہت زور سے پکڑا۔ مگر دیو نے اس زور سے گھسیٹی کہ شعبدہ باز بھی ساتھ ہی چلا گیا۔ دم کے دم میں رسّی اور شعبدہ باز اور دیو سب غائب۔ تب تو تماشائی اور بھی متحیّر ہوئے کہ یہ عجیب بات ہے۔ ہاتھ بھر کی رسّی اور آسمان بھر پر نمودار ہوئی اور پھر مطلع صاف۔ دیو کا نظر آنا اور شعبدہ باز کا جانا اور دونوں کا غائب ہونا اور رسّی

کا کھونا ان سب واقعات سے نہایت ہی حیرت ہوتی تھی۔ کل تماشائی مضطرہ ششدر تھے۔ مگر شعبدہ باز کی حور طلعت بیوی مسکراتی جاتی تھی ؛
جہاں پناہ نے حکم دیا کہ اس زن ملک فریب کو یہاں لے آؤ۔ مقربانِ بارگاہ سلطانی نے جا کر کہا کہ حضرت سلطان عالم نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔ اس غیرت خوبان فرخار نے نہایت کج ادائی سے کہا کہ کیا مجال! جب تک میرا شوہر نہ آئے گا، اس جگہ سے ہرگز نہ ٹلوں گی۔ اتنے میں وہ غیرت حُور دور از قصور بعد شان دلربائی چمک دمک کر بغیر کسی چیز کے سہارے کے ہوا میں کھڑی ہو گئی۔ تماشائیوں نے نعرۂ سبحان اللہ بلند کیا۔ اس وقت اس نازنین کا جمال مبین دیکھنے کے قابل تھا۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ حسن کی تصویر کاتب قدرت نے ہوا پر کھینچ دی ہے۔ وہ ناز و انداز کہ دیکھا نہ سُنا۔ اس پر ستم یہ ڈھایا کہ ہوا ہی پر ناچنے لگی۔ تماشائی ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ حضرت شاہ جمجاہ کی تو یہ کیفیت ہوئی کہ جان پر بن آئی تھی۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ چاہے فقیری نصیب ہو، مگر یہ حور شمائل ضرور ہماری ہو رہے۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور دیکھ دیکھ خوش ہوتے تھے کہ مطلع صاف ہے۔ گرد و غبار۔ سرخی تاریکی کچھ بھی نہیں ہے۔ شک کی جگہ یقین ہوا کہ شعبدہ باز کو دیو نے قتل کر ڈالا ؛
بادشاہ کی تو یہ کیفیت تھی۔ اب ولیعہد تاج و تخت کا حال سنئے کہ ان کے چہرے سے جنون کی کیفیت صاف ظاہر ہوتی تھی اپنے آپے میں نہ تھے ؎

دل مے رود ز دستم صاحبدلاں خدا را
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

تماشائیوں میں بھی اکثر نوجوان چوٹ کھا گئے ؛
اتنے میں اس بُتِ طنّاز و سراپا ناز کی زلفِ عنبر بار جو کھُل گئی تو لٹیں کمر کی خبر لائیں، اور رُخِ تاباں کے اردگرد مارِ سیہ کی طرح لہرائیں ؛
آخر وہ ناظورۂ دلفریب، حاضرین و ناظرین اور اراکین و شہزادگان باتمکین کو اپنے جمالِ مبین کا فریفتہ و شیدا کر کے ہوا ہی پر سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی زمین پر آئی۔ اِدھر زمین پر اس عابد فریب عدوے صبر و شکیب نے قدم رکھا۔ اُدھر آسمان پر حشر بپا ہوا۔ بادل کے ٹکڑے ہٹتے ہی دیو دنٹوٹس

نمودار ہوا اور دوسرے ٹکڑے سے شعبدہ باز نکلا۔ شعبدہ باز کے دیکھتے ہی تماشائیوں نے خوب غل مچایا اور ادھر دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ دیو اس زور سے چیخ اُٹھا کہ گہوارۂ زمین ڈانواڈول ہو گیا۔ شعبدہ باز بھی رعد کی طرح گرجنے لگا۔ دیو نے اپنا منہ جو قہرِ جہنم کا نمونہ تھا کھولا اور شعبدہ باز کی طرف جھپٹا۔ شعبدہ باز کی بیوی نے ایک سبز کپڑا اوپر کی طرف پھینکا وہ کپڑا سیدھا اڑتا ہوا دیو کے سر پر پہنچا اور وہاں گولا بن کر پھٹا، تو دیو نظر سے غائب ہو گیا۔ اور ایک اور پارہ ابر سے نکلا۔ اس مرتبہ دیو کے ہاتھ میں ایک بانس تھا جس سے وہ شعبدہ باز کے سر پر چوٹیں لگاتا تھا۔ مگر شعبدہ باز ہر بار بچ بچ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ شعبدہ باز نے بانس کو پکڑ لیا۔ اب دل لگی دیکھئے کہ ایک طرف سے شعبدہ باز اور دوسری جانب سے ونٹوسس زور کر رہا ہے۔ جب ونٹوسس کسی قدر غالب آیا اور شعبدہ باز کا دم پھول گیا تو اس حور طلعت نے ایک چاقو آسمان پر پھینکا چاقو نے اس بانس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ آدھا دیو کے پاس اور آدھا شعبدہ باز کے ہاتھ میں ؛

ولی عہد نے اس عورت سے پوچھا کہ لڑائی کا انجام کیا ہو گا ؟

لیڈی دل، یعنی شعبدہ باز کی ہمراز) خدا جانے!

ولیعہد۔ آخر کچھ تو معلوم ہو!

ل۔ (ترش رو ہو کر) فتح یا شکست ؛

ولیعہد۔ شکست کا انجام کیا ہو گا ؟

ل۔ موت ؛

ولیعہد۔ تو لڑتے کیوں ہیں پھر ؟

ل۔ اُن کی مرضی ؛

ولیعہد۔ تم اُن کو منع کیوں نہیں کرتیں ؟

ل۔ (مسکرا کر) وہ آسمان پر ہیں زمین پر۔ منع کیونکر کروں ؟

بادشاہ۔ ہماری عقل دنگ ہے۔

ل۔ ہوا ہی چاہیے۔ ان کے شعبدوں سے دُنیا بھر کی عقل دنگ ہے ؛

بادشاہ۔ خدا کرے زندہ آئیں !

ل۔ بس اب باتیں نہ کیجئے نہ مجھے ادھر دیکھنے دیجئے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیو اور شعبدہ باز میں تلوار چل گئی۔ ادھر دیو تیغ دو پیکر سوت کر جھپٹا اور ادھر شعبدہ باز نے سبز کاشانی مخمل کے غلاف سے شمشیر خارا شگاف چمکائی۔ دونوں پینترے بدل بدل کر وار کرنے لگے۔ دیو سے ایک مرتبہ تلوار چھٹ گئی۔ مگر دوسرے ہاتھ سے اس نے فوراً روک لی۔ شعبدہ باز نے کڑک کر مونڈھے پر تلوار لگائی مگر ہاتھ چھچھلتا ہؤا پڑا۔ دیو نے خشمگیں ہو کر ایک اور تلوار دستِ چپ میں لی اور دونوں تلواروں سے حملہ کرنے لگا؛

اس سانحۂ ہوش ربا کو دیکھ کر وہ زن خوب رُو ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگی۔ اُدھر آسمان پر وہ ہنگامہ بپا تھا، اِدھر زمین پر یہ شور و بکا تھا۔ اس معشوق شیریں حرکات کے رونے سے کل تماشائیوں کا دل بھر آیا۔ ہر فرد بشر زار زار رونے لگا؛

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ دونوں نے تلواریں پھینک دیں۔ اور دُور دُور کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ اس پر ستم زدہ نے بہ آواز بلند کچھ کہنا شروع کیا جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اپنے شوہر کو کچھ سمجھاتی ہے؛

ل۔ بائیں آنکھ۔ بائیں آنکھ۔ چرب۔ چرب۔ چرب؛

لوگ متحیّر کہ یا الٰہی! بائیں آنکھ سے کیا مطلب ہے اور یہ چرب چہ معنی دارد؟

اس نے اشارے سے کچھ پوچھا؛

ل۔ فول۔ آن۔ آن۔ آن؛

لوگوں نے دیکھا کہ لیڈی کے آن آن کہتے سے شعبدہ باز آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے؛

ل۔ رائٹ ہینڈ۔ یو فول۔ رائٹ ہینڈ؛

شعبدہ باز دائیں طرف آگیا اور آتے ہی دیو کے سر پر اس زور سے دو ہتھڑ لگایا کہ دیو پیچھے ہٹا؛

ل۔ ہولڈ آن۔ ہولڈ آن؛

شعبدہ باز اسی مقام پر کھڑا رہا تو دیو نے جھپٹ کر ایک چپت لگائی اور شعبدہ باز کی زبان سے ہائے کا لفظ بے اختیار نکل گیا۔ اس پر لیڈی نے زمین پر مارے غصے کے پاؤں کو زور سے دے پٹکا۔ شعبدہ باز اس صدمے سے نیم جان ہو گیا تو دیو خوب ہی کھلکھلا کر ہنسا اور اس کے بڑے بڑے دانت دیکھ کر تماشائیوں میں سے کوئی دو تین ہزار بزدلوں نے مارے ڈر کے آنکھیں بند کر لیں ❖

شعبدہ باز یہ سن کر ونڈسس پر جھپٹا اور جھپٹتے ہی چپت دی تو دیو سر سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ پھر لیڈی نے غل مچایا کہ "ہولڈ آن۔ ہولڈ آن" یعنی آگے بڑھ کر ایک اور دے۔ لیکن شعبدہ باز پھر رک رہا۔ اس پر لیڈی بہت جھلائی ❖

اتنے میں دیو نے ایک ہاتھ کاٹ ڈالا۔ اور کٹا ہوا ہاتھ سیدھا اس چھولداری کے قریب گرا۔ بڑا غل مچا۔ لاکھوں آدمی ایک دفعہ ہی چلا اٹھے۔ اور وہ بت پندار فرطِ الم سے زمین پر گر پڑی۔ حضرت جہاں پناہ نے حکم دیا کہ اس کو بہ آرام تمام کمال ادب و تعظیم کے ساتھ اٹھا لاؤ۔ چنانچہ خدام ذوی الاحترام نے ویسا ہی کیا ❖

اتنے میں دیو اور شعبدہ باز پھر جٹ گئے۔ دیو نے منہ کھولا اور لپک کر شعبدہ باز کو کاٹ کھایا۔ تھوڑی دیر میں اس بے چارے کا دوسرا ہاتھ بھی کٹ کے گر پڑا اور پھر غل مچا۔ دس منٹ تک برابر اس قدر غل مچتا رہا کہ کان پڑی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی تھی ❖

دیو کے ہاتھ میں ایک خارا شگاف پنجہ نظر آیا۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ اس نے ایک ہاتھ ایسا بھرپور لگایا کہ شعبدہ باز کی دونوں ٹانگیں کٹ کر گر پڑیں۔ اس کے بعد دھڑ کے بھی کوئی بہتر ٹکڑے کر ڈالے۔ اور سر دیو لے بھاگا ❖

خلقِ خدا اس انوکھے شعبدے کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ شعبدہ باز کی یہ گت بنی تو وہ پری چہرہ بجلی کی طرح چمک دمک کر بادشاہ کے سامنے آئی۔ اور دونوں ہاتھ اونچے کر کے کچھ کہا تو چند بونے نظر آئے اور وہاں خود بخود آگ پیدا ہو گئی۔ اس آگ میں کے شعلے آسمان کی خبر لاتے تھے۔ وہ شعلہ رو جل بھن کر خاک ہو گئی۔ اور بونوں نے اس خاک کو اٹھایا تو

ہوا سے باتیں کرنے جانے لگے۔ دم کے دم میں نظر سے اوجھل ؛
شاہ زمان انگشت حیرت بدنداں۔ خلق خدا گریہ کناں، ایسا شعبدہ کسی نے کبھی کاہے کو دیکھا تھا۔ عین مایوسی کی حالت میں لوگ اپنے اپنے گھر جانے کو ہی تھے کہ آسمان پر ایک شعلہ نمودار ہوا۔ دیکھتے دیکھتے اس شعلے سے ایک ہاتھ نکلا۔ پھر دوسرا ہاتھ ظاہر ہوا۔ اس کے بعد ایک ٹانگ دکھائی دی۔ تماشائی بغور و تعمق دیکھتے جاتے تھے۔ ان لاکھوں آدمیوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا۔ جس کی نظر آسمان کے رُخ نہ ہو۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد اس شعلے میں سے ایک آدمی نکلا۔ دیکھا تو وہ شعبدہ باز ہے۔ اس وقت وہ شور مچا کہ الامان۔ شعبدہ باز فوراً زمین پر آیا۔ اور شاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر آداب بجا لایا۔ تماشائی متحیر کہ یا الٰہی یہ بشر ہے یا فرشتہ!

شعبدہ باز (ش)، (بادشاہ سے)، جہاں پناہ! اس وقت میں بالکل شل ہو گیا ہوں ؛

با۔ کارے کردہٗ! شاباش!

ش۔ گھنٹوں لڑائی رہی۔ طرح طرح کی مصیبت سہی ؛

ولیعہد۔ بارے صحیح و سلامت تو آئے ؛

ش۔ حضور کے اقبال سے ؛

وزیر۔ تم باکمال آدمی ہو ؛

ش۔ جہاں پناہ وہ میری برق دم جورو کہاں ہے؟

با۔ کمال افسوس ہے کہ تمہاری حالتِ زار دیکھ کر وہ بیچاری جل مری ؛

ش۔ کیا! جل مری!! اے نہیں حضور!

ولیعہد۔ (آبدیدہ ہوکر)، ہائے افسوس۔ وائے افسوس!

ش۔ حضور! میری بیوی مجھ کو مل جائے۔ ورنہ میں اپنی جان دونگا۔ اور چاہے حضور توپ کے مُنہ سے اُڑا دیں۔ مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ مرزا ولیعہد بہادر نے اس کو گھر ڈال لیا ؛

با۔ اس وقت تم جو چاہے کہو۔ تمہارا قصور قابلِ معافی ہے ؛

ش۔ حضور! میری جورو تمام امریکہ کی لیڈیوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ حسن و جمال میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ میرزا ولیعہد بہادر نام خدا

ابھی جوان ہیں۔ اور جوان کیا معنی۔ عنفوانِ شباب ہے ؛
ولیعہد۔ یہ لاکھوں آدمی دیکھ رہے تھے کہ وہ جل کے خاک ہو گئی۔ اور اُس تودۂ خاک کو چھ بونے اٹھا لے گئے ؛
ش۔ جہاں پناہ! غریبوں پر کرم کرنا چاہیئے ؛
با۔ تم سب سے پوچھ دیکھو کہ کیا ہوُا ؟
ش۔ حضور! یہ سب حضور کی رعایا ہیں۔ میری سی کون کہے گا بھلا۔ بس صاف ظاہر ہے کہ اُس کی اٹھتی ہوئی جوانی اور اُس کا چہرۂ نورانی میرا دشمن ہوُا اور میرزا ولیعہد بہادر کو بادشاہ ذی جاہ کا لڑکا اور کلّے ٹھلّے کا گبھرو دیکھ کر ریجھ گئی۔ اَب میں نے اس سے ہاتھ دھویا ؛
با۔ بولو تم کو کیا انعام دیں ؛
ش۔ جہاں پناہ! جب تک میری بیوی مجھے نہ ملے گی۔ میں کچھ نہ لونگا اور اپنی جان دوں گا ؛
ولیعہد۔ یا الٰہی! اس کو کیونکر کوئی سمجھائے ؟
وزیر۔ بڑی خرابی ہے!
ش۔ ہاں جس کی خرابی ہے۔ اس کی ہے۔ میرزا ولیعہد بہادر کا تو کچھ نہیں بگڑا۔ مجھ پر البتہ اوس پڑ گئی۔ ہائے ایسی ماہ رُو اب مجھے بھلا کہاں ملیگی۔
وزیر۔ تم ذرا دم تو لو۔ ہم کُل باتیں تم کو سمجھا دینگے ؛
ش۔ بس میں سمجھ گیا۔ فیری۔ فیری۔ ڈیرُ فیری! شعبدہ باز نے جو اپنی پیاری بیوی فیری کو تین بار آواز دی تو فیری نے کہا۔ "ہیلو ڈیرُ!" یہ کہ کر وہ سبرق وش، جو ابھی ابھی جل کے خاک ہو گئی تھی، بصد ناز و انداز میرزا ولیعہد بہادر کی کرسی کے نیچے سے نکل کر سامنے آن کھڑی ہوئی اور شعبدہ باز نے قہقہہ لگا کر یوں زبان کھولی ؛
ش۔ دیکھا! میں تو کہتا ہی تھا کہ میرزا ولیعہد بہادر کا اس میں ہاتھ ہے ؛
ل۔ یہ تو مجھ کو اپنے گھر میں ڈالے لیتے تھے ؛
ش۔ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا ؛

اس شعبدے سے خسرو گیتی پناہ از بس محظوظ ہوئے اور بہ طیب خاطر فرمایا کہ جو انعام مانگے دیا جائے۔ شعبدہ باز نے عرض کی جہاں پناہ! میں تو ایک غریب آدمی ہوں۔ لیکن حضور کے غلاموں کو میں نے خوش کر دیا

ہے۔اب حضور ہی زبانِ مبارک سے کچھ فرماویں ٭
با۔ دس کمروں کا پورا سامان دے دیا جائے ٭
نش۔ (آداب بجا لا کر) حضور نے میری بڑی قدر دانی کی ٭

ابن الوقت

از مولانا نذیر احمد دہلوی

ایک ڈپٹی کلکٹر انگریزوں کی مدارات کا شاکی

نوبل صاحب۔ میں نے آپ کے لئے نوکری کے حاصل کرنے میں جان بوجھ کر خود کوشش نہیں۔ اس لئے کہ میں نے عزت طلب ہندوستانیوں کو اکثر انگریزوں کی مدارات کا شاکی پایا۔ اور اگر آپ نوکری کی خواہش کرینگے تو میں ہر وقت کوشش کرنے کو موجود ہوں ٭

ابن الوقت۔ میں آپ سے بار بار عرض کر چکا ہوں کہ ہم لوگ پشت ہا پشت سے شاہی سرکاروں کے متوسّل ہیں۔ ان سرکاروں کی مدارات کا یہ رنگ تھا کہ چھوٹی بڑی کل خدمتیں موروثی یہ کتنے اطمینان کی بات تھی کہ سارے ملازم نہ صرف اپنی بلکہ اولاد کی معاش سے بھی بے فکر تھے۔ میں واقعات کے طور پر ان سرکاروں کے دستور اور قاعدے کچھ بیان کرتا ہوں۔آپ اُن کو درست نادرست، واجب ناواجب جو چاہیں سمجھیں۔ جرمانے، معطلی، موقوفی کا نام بھی مارے قلعے میں کبھی کسی نے نہیں سُنا۔ داد و دہش انعام و اکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ تیمور کی نسل نے کبھی روپے کو روپیہ سمجھا ہی نہیں شاہی تنخواہیں اولاد، اولاد کی اولاد پر تقسیم ہوتے ہوتے بعض کے حصّے میں صرف پیسے رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی دو دو ڈھائی ڈھائی برس میں ملے تو ملے، ورنہ اکثر تنخواہیں محض برائے نام تبرّک کی طرح صرف سرکار کی داد و دہش پر نوکروں گزر تھا۔ مگر وہ پیسے لوگوں کو ایسے عزیز تھے کہ مفتی صدر الدین خاں الصّدور دہلی کی نقل مشہور ہے کہ قلعے سے ڈھائی یا تین روپے ان تنخواہ کے بھی تھے۔ خواجہ محبوب علی خاں نے تخفیف کا قلم جاری کیا تو منتی

صاحب کا نام بھی زمرۂ ملازمانِ شاہی سے کاٹ دیا۔ مفتی صاحب تو مفتی صاحب، ایسے تین تین روپلّی[1] کی ان کے خدمتگاروں کو بھی پروا نہ تھی۔ مگر مفتی صاحب نے جب سُنا تو دُہائی دیتے ہوئے حضور تک پہنچے اور آخر اپنی تنخواہ بحال کرا کر ٹلے۔ غرض قلعے کی سرکاروں کا برتاؤ نوکروں کے ساتھ ایسا تھا جیسے ماں باپ کا اپنے بال بچوں کے ساتھ۔ تو صاحب میں تو ایسی سرکاروں میں رہا ہوں اور میں خود اپنے تئیں انگریزی نوکری کے قابل نہیں سمجھتا ؂

میرے نسبتی بھائی ڈپٹی ہیں۔ برس دن ہوا رخصت لے کر انہی دنوں حج کو گئے تھے۔ اب آج کل میں آنے والے ہیں۔ مزاج کے ہیں تیز۔ کسی حاکم سے ان کی نہیں بنتی اور برس میں دو دو بار نہیں تو بیچارے ہر برس ضرور بدلتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی آ نکلتے ہیں اور اپنے حالات بیان کیا کرتے ہیں۔ اُن سے میں قیاس کرتا ہوں کہ واقع میں ایک دن بھی مجھ جیسے آدمی کا انگریزی دربار میں گزر ہونا مشکل ہے۔ میں نے اپنے بھائی صاحب سے ایک دن پوچھا تھا کہ کہئے۔ کچھ آپ نے سرمایہ بھی جمع کیا؟ تو کہنے لگے۔ اجی اللہ اللہ کرو۔ کیسا سرمایہ۔ خدا جانے کیسے کیسے کتربیونت[2] کرتا ہوں کہ قرض نہ لینا پڑے۔ مجھ کو تو آئے دن کی بدلی ادھیڑے ڈالتی ہے۔ ورنہ خدا کا فضل ہے۔ میری تنخواہ خرچ کو کافی ہے۔ بلکہ کچھ پس انداز ہو رہتا ہے ؂

میں۔ حقیقت میں آپ کو برس دن بھی کہیں جم کر رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اور بھی تو ڈپٹی ہیں قطبؔ[3] از جا نمی جنبد، برسوں سے ایک جگہ جمے بیٹھے ہیں ؂

بھائی صاحب۔ خدا جانے، صاحب! لوگ کیا کمال کرتے ہیں۔ میں ہر چند کوشش کرتا ہوں کہ حکام کو راضی رکھوں۔ مگر کچھ ایسی تقدیر کی گردش ہے کہ خواہی نخواہی ناچاقی ہو ہی جاتی ہے۔ اور بار بار کی بدلی نے مجھے اور بھی بدنام کر رکھا ہے۔ لوگ میرا نام سُن کر پکار اُٹھتے ہیں۔ اجی! وہ لڑاکو ڈپٹی کلکٹر ؂

میں۔ آپ نے اصلی سبب اب بھی نہ بتایا کہ حکام آپ سے کیوں ناراض رہتے ہیں۔ اگر آپ کو میں سرمایہ دار دیکھتا تو شبہ کر سکتا کہ شائد آپ رشوت

---

[1] روپے کی تصغیر۔ [2] توڑ جوڑ۔ جز رسی۔ [3] قطب اپنی جگہ سے نہیں ہلتا ؂

لیتے ہوں گے ؛

بھائی صاحب - بات صاف صاف تو یہ ہے کہ میں رشوت نہیں لیتا اور مجھ جیسا تنگ مزاج آدمی رشوت لے بھی نہیں سکتا ؛

میں - مَیں تو سُنتا تھا کہ انگریز رشوت سے بہت چڑتے ہیں - اور آپ کے فرمانے سے بالکل اُلٹی بات معلوم ہوتی ہے ؛

بھائی صاحب - سچ تو یہ ہے کہ مجھ کو کسی مرتشی انگریز سے معاملہ نہیں پڑا - نہ میں نے کبھی کسی انگریز کو رشوت دی - انگریزوں کی بڑی رشوت کیا ہے ؟ ڈالی یا دَورے میں گئے تو رسد - یا ڈاک بٹھانے کی ضرورت ہوئی تو گھوڑا گاڑی - یا شکار کو نکلے تو مانگے کے ہاتھی وغیرہ - یا خاص خاص لوگوں سے شاذ و نادر تحفہ تحائف - سو میں ان چیزوں پر رشوت کا اطلاق نہیں کر سکتا - رسد میں تو اکثر نوکروں کی شرارت ہوتی ہے کہ صاحب سے بھی ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں - اور بیچ میں آپ چٹ کر جاتے ہیں - اور صاحب کو خبر نہیں ہونے دیتے - اور شاید کوئی میم والا صاحب ہوا اور میم ہوئی کفایت شعار جز رس - اور اس کے دھیلے انڈا اور آنے مرغی کے دام کاٹ دئے - اور لکڑی گھاس مفت کہ یہ چیزیں تحصیلدار، تھانہ دار دیہات سے ضرور بے قیمت لیتے ہیں - اور ہم کتنے ہی دام کیوں نہ دیں، اصل مالکوں کو کوڑی ملنے والی نہ ؛ - تو ہاں اس کا بھی عجب نہیں مگر پھر بھی میں یہی کہونگا کہ انگریزوں میں رشوت نہیں چلتی - مگر ان کے حصّے کی بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ ان کے اردلی، خدمت گار، شاگرد پیشہ، پیشی کے عملے لے مرتے ہیں - اور صاحب کی آنکھ، کان، زبان بلکہ ہمزاد جو کچھ کہو، یہی لوگ ہوتے ہیں - اگر کوئی شخص میری طرح ان ہمزادوں کو راضی نہیں رکھ سکتا، تو کتنا ہی بڑا عہدہ دار کیوں نہ ہو - اختیارات ، حکومت، تنخواہ سب کچھ ہے مگر عزّت نہیں - اور میں چاہوں تو انگریزوں کے شاگرد پیشوں کو کچھ خرچ کر کرا کے راضی کر لے سکتا ہوں، مگر مجھ کو ان کے نام کی کچھ ایسی چڑ سی آپڑی ہے کہ دوہری دوہری سواریاں رکھتا ہوں، خدا کے فضل سے نوکر بھی متعدّد ہیں - مکان کا کرایہ، اخبار، کھانا، کپڑا، میرا سارا خرچ میرے پندار میں اُجلا ہے - سال میں سینکڑوں روپئے تو ہسپتال، مدرسے اور متفرق چندوں میں نکل جاتے ہوں گے - یہ تمام مصارف میں خوش دلی سے کرتا ہوں - لیکن ڈالیوں

اور شاگرد پیشوں کے انعام میں مجھ سے ایک روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ اتنی مدت مجھے نوکری کرتے ہوئی اور چھوٹے بڑے صدہا انگریزوں سے میری معرفت ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں خوشی سے کبھی کسی انگریز سے ملنے گیا ہوں، یا کسی انگریز سے مل کر میری طبیعت خوش ہوئی ہو۔ میں انگریزوں سے ملتا ضرور ہوں۔ مگر بہ مجبوری دفع ضرورت کے لئے کہ ایسا نہ ہو۔ مغرور سمجھا جاؤں، یا عملوں اور اردلیوں کو جو ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتے ہیں چغلی کھانے کا موقعہ ملے۔ مجھ کو بعض ایسے کریم النفس انگریزوں سے بھی واسطہ پڑا ہے۔ جنھوں نے صرف بہ تقاضائے انصاف کارگزاری دیکھ کر مجھ کو فائدے پہنچائے ہیں۔ اور میں ان کا دل سے ممنون ہوں۔ مگر انگریزوں کے عام برتاؤ سے میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو گیا ہے کہ جنھوں نے مجھ پر احسان کئے ہیں، ان کے ساتھ بھی میں نے اس سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی کہ جب تک افسری ماتحتی کا تعلق رہا ملتا رہا۔ جب وہ بدل گئے یا میں بدل گیا تو بھول کر بھی میں کسی کو عرضی نہیں بھیجتا۔ میں انگریزوں کی ملاقات کا ایسا چور ہوں کہ جب دیکھتا ہوں کہ اب بہت دن ہو گئے ہیں تو ہفتوں پہلے سے ارادہ کرتا ہوں اور آخر زبردستی ٹھیل کر دھکیل کر اپنے تئیں لے جاتا ہوں، تو کوٹھی پر جا کر ہمیشہ وہی بے لطفی وہی بے عزتی۔ جاڑا ہو، لوئیں چلتی ہوں، ہندوستانی ڈپٹی نہیں، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو۔ اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑے کی بگھی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو۔ کلکٹر، جنٹ اسسٹنٹ کی تو بڑی بارگاہیں ہیں، اگر یوریشین ڈپٹی کلکٹر سے بھی ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور۔ اور احاطے بھی شیطان کی انتڑی کہ ہم جیسے پرانے فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حال میں دیکھ پائیں تو سمجھو کہ ملاقات کو گئے۔ نوکری نذر کر آئے۔ اسی دن رپورٹ ہوئی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا۔ گویا ڈپٹی کلکٹری کو ضرور ہے کہ کم سے کم ڈاک کے ہرکارے کی ایک چوکی تک پوئی نہیں تو ڈلکی پیشی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے۔ اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے سے چکھوتیاں کرا دی ہیں تو باورچی خانے یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے دم لیا۔ اور جب

سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگی۔ تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے ڈاڑھی مونچھ کو سنوار آہستہ سے عمامے کو ذرا اور جما لیا۔ چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مؤدب مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے، خدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر ہی سے تاڑ لیا تھا۔ کوٹھی کے پاس آتے دیکھ قصداً اِدھر اُدھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر زینے کے نیچے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے تو اوپر چڑھنے کا قصد کریں۔ چلنے کی، باتوں کی اور چیزوں کے رکھنے اُٹھانے کی آوازیں ہیں کہ چلی آتی ہیں، مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اُتار ہمت کر کے بے بلائے اُوپر پہنچے۔ کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں۔ کھڑے کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں لوٹ چلیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہ ہو، لوٹتے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں۔ شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اتنے میں باورچی خانے کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کا اور اردلی لوگوں کا حال معلوم ہوگا۔ وہ لپک کر ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا۔ اور اِدھر کو رُخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے (اور اس کو انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا کہ دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لئے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں، اپنی غرض کے لئے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ حیا اور عزت کو بالائے طاق رکھ آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا۔ کیوں جماعہ دار کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے؟ بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ادب اور ڈر تو خاک بھی نہیں۔ صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے۔ خدا جانے کب موقع آ پڑے۔ چار و ناچار اچٹتا ہوا سا سلام کر کے، جیسے کوئی مکھی اُڑاتا ہو، اس کو کہنا پڑا کہ آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے۔ ملاقات تو شاید ہی ہو۔ لیکن آپ بیٹھئے۔ ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں۔ یہ کہ کر پھر وہ اندر کو جانے لگا، تو آخر رہا نہ گیا اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں، اپنے سر پر؟ تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، تکیہ اور ایک بازو ندارد گویا بید کی تپائی لا کر ڈال دی۔ اس کے بعد سے جب جب

کوئی چپراسی یا خدمت گار باہر آتا، یہی معلوم ہوتا کہ ابھی صاحب غسل خانے سے نہیں نکلے۔ اب کپڑے بدل رہے ہیں۔ اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں۔ اب چھٹی لکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کو معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سُن کر جی ہی تو بیٹھ گیا کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی۔ ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں۔ پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں۔ آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کیا بھروسہ۔ اتنی محنت کیوں ضائع کی جائے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے اور صبر کرو۔ بڑی دیر کے بعد چپراسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گذری ہوئی۔ تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ خیر، میں تو اب جاتا ہوں صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا۔ میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں، کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں۔ خفا ہو تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی قدر رکھنا۔ غرض بلائے گئے۔ صاحب کو دیکھا تو پائپ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں، بس معلوم ہو گیا کہ مطمئن ملاقات نہیں ہو سکتی۔ سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں۔ اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ان کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں اور کیا معلوم ہے۔ شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو۔ بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کی بہت دیر پہلے سے ان کو خبر تھی۔ چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ ہیں۔ عین سامنے کے دروازے سے آیا۔ درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی اُن کی نظر نہ پڑی ہوگی! ضرور پڑی ہوگی۔ خیر! آخر آپ ہی سر اُٹھایا۔ اور ڈپٹی صاحب! حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہیں کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل کی کرسی پر، جو دوسری طرف تھی، بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کون نہیں جانتا۔ لیکن میں تو اپنے سے زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور

ڈپٹیوں کا انگریزوں کے رو برو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا۔ کہنے کو کرسی پر بیٹھا مگر حقیقت میں بید پر چونزٹ ٹیکے ہوں تو جیسی چاہے قسم لو۔ تم خدا کے بندے ہو یقین مانتا، بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈے پر گلدم۔ کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ خداوند! سررشتہ دار حاضر ہیں۔ صاحب میری طرف دیکھتے جاتے ہیں، اور چپراسی سے فرما رہے ہیں۔ " اچّا آنے بولو۔" یعنی اچھا سررشتہ دار سے کہو، چلے آئیں۔ اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب دوں۔ اور سررشتہ دار مردود، آگے آگے آپ، پیچھے بستہ قلمدان لئے ہوئے چپراسی آ ہی گھسا۔ سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں۔" ول صاحب گرمی ہوٹ ہے"

ہیں۔ (گردن جھکا کر) ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا کہ لو سے بھی کئی آدمی مرے۔ صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں۔ اور دل میں کہ رہا ہوں کہ گرمی کا تو حال معلوم تھا۔ ارے ظالم! تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندۂ خدا جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملی ہے، ناظر اپنی بدذاتی سے خس کی بندھوا دیتا ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان۔ اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے، اور جو واقع میں گرمی بھر اپنے گھر ٹٹی ہیں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدے میں پڑا بھن رہا ہے۔ لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کردوں۔ میں سمجھتا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ آئی؟ کتنے آدمی مرے؟ کب مرے؟ لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں؟ اور کوئی لائق ڈاکٹر صاحب کے ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں؟ غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب تو کچھ پی سے گئے۔ نہیں معلوم، دھیان سے نہیں سُنا یا سمجھے نہیں۔ اب سررشتہ دار ہے کہ بستہ کھول کاغذ پھیلا رہا ہے۔ اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ۔ جب سررشتہ دار کاغذ پھیلا لگا صاحب کا منہ دیکھنے۔ تو صاحب مجھ سے فرماتے ہیں" آپ کچھ کچھ" یعنی آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟ یہ سنتے ہی

میں تو یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ "نہیں۔ میں تو صرف سلام کے لئے حاضر ہوا تھا۔
بہت دن ہو گئے تھے۔ جی ملنے کو چاہتا تھا" بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے
کا جی ملنے کو چاہتا تھا اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے۔ ملاقات
بے بامزہ اور بے مزہ ہونے کا معیار وقت ہے۔ دیر تک ملاقات رہی تو
جانو کہ خوب دل کھول کر باتیں ہوئیں۔ ہماری ملاقات کیا خاک بامزہ سمجھی
جائے کہ جانا اور اٹھاؤ چولھے کی طرح بیٹھنا، اور گفتگو اور رخصت سب
کچھ دو ہی منٹ میں ہو ہوا چکا۔ اپنے حساب سے کون ایسا تیسا ملاقات
کے ارادے سے گیا تھا۔ خدا گواہ ہے۔ صرف ماتھا پھٹول[1]۔ وہ بھی اپنے سر
کا چھدّا[2] اتارنے کے لئے۔ صاحب مجھ سے چاہتے ایک بات بھی نہ کرتے۔
مگر سررشتہ دار اور چپراسیوں کو میرا اُلٹے پاؤں لوٹ آنا معلوم نہ ہوتا، تو
مجھ کو کچھ شکایت نہ تھی۔ مگر میری تفضیح ان لوگوں کی نظروں میں ہوئی جو
منصبی عزّت میں میرے پاسنگ بھی نہ تھے۔ باہر نکلا تو چپراسیوں اور
خدمت گاروں کا غول کا غول برآمدے میں موجود تھا۔ مجھ کو دیکھتے
ہی سب نے فرشی سلام کیا۔ الٰہی! یہ کاہے کی ایسی لمبی چوڑی تعظیم ہو
رہی ہے۔ گھنٹوں میں برآمدے میں بیٹھا سوکھا کیا۔ ان میں سے کسی کی
صورت بھی نظر نہیں پڑی۔ اب یہ حشرات الارض کہاں سے نکل پڑے؟ آہا!
میں اتنی جانفشانی کے بعد صاحب کو ایک سلام کر لینے کا گنہگار ہوں۔ یہ
سرکاری پیادے اس کا جرمانہ وصول کرنے کے لئے مجھ پر تعیّنات ہیں۔ ہر چند
کہتا ہوں مکان پر تنخواہ پر دیکھا جائے گا۔ عید قریب ہے، اس میں سمجھ
لینا۔ بے حیا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ آخر میں نے ذرا ترش رُو ہو کر کہا کہ اس
وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ہوتا تو دینے کا نام دینا کبھی کا دے چکا ہوتا۔
ایسی بے اعتباری ہے تو ایک آدمی میرے ساتھ چلو۔ ایک دوسرے کی طرف
دیکھ کر ایک آدمی تیار سا ہوا کہ مجھ سے پہلے آگے کوچ بکس پر بیٹھ لے۔
اتنے میں جماعہ دار نے پنسل اور ایک پرچہ کاغذ نکال میرے ہاتھ میں دیا
کہ حضور ناظر کو رقعہ لکھ دیں۔ جب میں قلم اٹھاتا تھا، بے ادب ہاتھ پکڑ پکڑ
لیتے تھے۔ پہلے ذرا دیکھئے کہ آپ کیا لکھتے ہیں۔ اسی کشمکش میں بڑھتے بڑھتے

---

[1] سر ٹکرانا۔ بناوٹی مدارات ÷ [2] گلہ اتارنا ÷

میں تو اپنی بگھی تک جا پہنچا سائیس پٹ کھولے کھڑا ہی تھا۔ لپک کر پائدان پر پاؤں رکھ کر غڑپ بگھی کے اندر۔ سائیس نے کھٹ سے پٹ بھیڑ دیا۔ اور گھوڑا تھا کہ آہٹ پاتے ہی چل نکلا۔ میں نے کوچبان سے لے کر کاغذ کے پُرزے میں ایک روپیہ رکھ پُڑیا بنا اردلیوں کو دکھا کر نیچے پھینک دیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھا تو ایک چپراسی نے پُڑیا اٹھائی ایک روپیہ دیکھ کر یقیناً بہت ہی بگڑے ہونگے۔ مگر میں ان کی گالیوں کی زد سے باہر نکل جا چکا تھا۔ بگھی کے اندر بیٹھ کر میں نے ایک ایسا لمبا سانس لیا، جیسے کوئی مزدُور سر پر سے بھاری بوجھ اُتار کر۔ تمام راستہ اسی ملاقات کی ادھیڑ بن میں طے ہوُا۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سررشتہ دار اور چپراسیوں کی نظر میں میری کیا عزّت رہی اب یہ لوگ تمام شہر میں اس کا ڈھنڈورہ پیٹیں گے۔ ایسی بیحرمتی سے روٹی کمانے پر لعنت ہے۔ پھر دل کو سمجھاتا کہ عزّت ایک امر اضافی ہے۔ مجھے اپنے اقران و امثال پر نظر کرنی چاہیئے ان کے ساتھ بھی تو اُنیس بیس کے فرق سے ایسی ہی مدارات کی جاتی ہے تو جس مجلس میں سب ننگے ہیں وہاں لنگوٹی کی کیا شرم۔ اسی حیص بیص میں گھر پہنچا۔ چند آدمی منتظر ملاقات بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر نہ وہ ڈپٹی تھے اور نہ میں کلکٹر کہ برآمدے میں محتاج اطلاع بیٹھے ہوں۔ آئے تو میں موجود نہ تھا۔ مزے میں گاؤ تکیوں کے سہارے سے پھیل پھیل کر بیٹھے۔ گھر میں سے پان آ گئے۔ آدمیوں نے حُقّے بھر دیئے۔ جوں مجھ کو دیکھا۔ ایک صاحب بولے۔ اللہ اکبر، ڈپٹی صاحب! آج تو کلکٹر صاحب سے خوب گاڑھی چھنی[1]۔ کون وقتوں سے میں آپ کا منتظر بیٹھا ہوں۔ دوسرے صاحب۔ آج بندے کا ارادہ بھی کلکٹر صاحب کے سلام کو جانے کا تھا۔ معلوم ہوُا کہ ڈپٹی صاحب تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بس آج کسی کی دال نہیں گلنی۔ تیسرے صاحب۔ مُدّت سے جدید تحصیلداری قائم ہونے کی خبر تھی۔ یہاں تک کہ بورڈ سے منظوری بھی آ چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اسی انتظام کے صلاح مشورے میں دیر لگی۔ لوگ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں اور میں کپڑے اُتارتا جاتا ہوں اور اندر ہی اندر دل میں خوش ہوں کہ بھلا ہے۔ خدا کرے لوگ ایسی ہی غلط فہمی میں مبتلا رہیں ؂

[1] خوب گھل مل کر ملاقات رہی ؂

فسانۂ آزاد

از پنڈت رتن ناتھ سرشار

داروغہ جی کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں

نواب۔ داروغہ جی! اس حلوائی کا حساب کر دو۔ اور اس کو سمجھا دو کہ اگر خراب یا سڑی ہوئی باسی مٹھائی بھیجی تو اس سرکار سے نکال دیا جائے گا۔ پرسوں برفی خراب بھیجی تھی۔ گھر میں شکایت کرتی تھیں ؀

داروغہ۔ سنتے ہو جی شیو دین! دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں۔ خبردار! جو گلی سڑی مٹھائی بھیجی تو تم جانوگے۔ اب تم نے نمکحرامی پر کمر باندھی ہے۔ کھڑے کھڑے نکال دئے جاؤ گے۔ ہاں بس کہ دیا ہے تم سے۔ تمہارے بھائی بند سیکڑوں در چوم کے مٹھائی دیں گے۔ مگر تم راندے ہی جاؤگے ؀

حلوائی۔ نہیں کھداوند! گُلام کی کیا مجال۔ اوّل مال دوں اول مال، چاشنی جرا (ذرا) بہت آگئی۔ تو دانہ کم پڑا۔ ملائم نہ رہی کڑی ہو گئی۔ چاشنی کی گولی دیر میں دیکھی۔ نہیں تو یہی دُکان کی برفی تو شہر بھر میں ماشور (مشہور) ہے۔ وہ لجّتی (لذّت) ہوتی ہے کہ ہونٹھ بندھنے لگتے ہیں ؀

داروغہ۔ چلو تمہارا حساب کر دیں۔ لے بتاؤ۔ کتنے دن سے خرچ نہیں پایا۔ اور تمہارا کیا آتا ہے؟

حلوائی۔ جو حساب سے ہو ؀

داروغہ۔ لاحول ولاقوۃ! اور ہم پوچھتے کیا ہیں۔ یہی تو پوچھتے ہیں کہ حساب سے کیا ہوا؟

حلوائی۔ اگلے مہینے میں پچیس روپے کچھ آنے کی آئی تھی۔ اور اب کی دس تاریکھ (تاریخ)، انگریجی (انگریزی)، تک کوئی سترّ یا اسّی ؀

داروغہ۔ اجی تم تو گدّے بازیاں کرتے ہو۔ سترّ یا اسّی یا سَو یا پان سَے۔ اس مہینے میں اتنی۔ اس مہینے میں اتنی۔ یہ بکھیڑا تم سے پوچھتا کون ہے۔ اس جھنجھٹ سے ہمیں واسطہ کیا بھلا، ہمیں تو بس گھڑی بتا دو کہ اتنا ہوا

حلوائی۔ اچھا حساب تو کر لوں (تھوڑی دیر کے بعد) بس ایک سو بیالیس روپئے اور دس آنے دیجئے۔ چاہے حساب کر لیجئے بولتا جاؤں؟

داروغہ۔ اجی تم کوئی نئے تو ہو نہیں۔اب بتاؤ، اس میں یاروں کا کتنا ہے۔ سچ بولنا لالہ! (پیٹھ ٹھوک کر) آؤ وارے نیارے ہوں کیوں ہے نہ؟

حلوائی۔ بس سو ہم کا دے دیو۔ بیالیس تم لے لو۔ سیدھا سیدھا میں تو یہ جانتا ہوں ؛

داروغہ۔ اچھا منظور۔ مگر بیالیس کے باون کرو۔ ایک سو تم لو باون ہمارے۔ سچ کہنا۔ کوئی چالیس کی مٹھائی اس مہینے اور اُس مہینے میں ملاکر آئی ہوگی یا کم؟

حلوائی۔ اجی ہجور۔ آپ کو اس بھید سے کیا واسطہ! آپ کو آم کھانے سے گرج ہے یا پیڑ گننے سے۔اور سچ سچ یہ ہے کہ کوئی سب ملاکر اڑتیس روپے کی آئی ہوگی۔ کُل وجن (وزن) میں البتہ کتر بیوت کر دیتا ہوں۔ سیر بھر لڈو مانگ بھیجے۔ ہم نے پاؤ سیر کم کر دئے ؛

داروغہ۔ اونھ اس کی نہ کہئے۔ یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔یہ دماغ کسے کہ تولنے بیٹھے۔ میاں لکھ لٹ، بیوی ان سے بڑھ کر۔ ڈنڈی ترازو کون لے بیٹھے۔ چین کرو۔ دس کے بچاس لو، اور سیر کے تین پاؤ بھیجو۔ مزے ہیں۔ اچھا یہ سو روپئے گن لو، اور ایک سو باون کی رسید ہمیں دو ؛

حلوائی۔ یہ مول تول ہے۔سو اور پانچ ہم لیں، اور باکی (باقی) ہجور کو مبارک (مبارک) رہیں۔مالمے (معاملے) کی بات ہے ؛

الغرض داروغہ جی نے حلوائی کو راضی کر لیا۔ اس داروغگی کے صدقے اڑتیس روپے کے ایک سو باون دلوائے۔ اور بیالیس سے زیادہ ہی زیادہ خود ہضم کئے۔ اے پھٹکار! کور نمک ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔جن رؤسا کے یہاں ایسے ایسے داروغہ اور اہلکار ہوں، ان کا خدا ہی حافظ ہے۔ مگر نواب صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ خبر ہی نہ ہوئے کہ کیا دیا اور کیا لیا۔ اور یار لوگوں نے حلوائی سے بالائی رقم اڑا ہی لی۔ پھر وہ تو شیرِ مادر ہے ؛

اب سنئے کہ میاں خوجی نے وہ ساری گفتگو سن لی جو داروغہ جی اور حلوائی میں ہوئی۔ جب داروغہ جی نے شیو دین حلوائی کو ہنسی خوشی رخصت کیا تو خوجی نے بڑھ کر یوں کہا :-

خوجی۔ اجی حضرت! آداب عرض ہے۔ کہئے اس میں کچھ یاروں کا بھی حصّہ ہے؟ یا باون کے باون خود ہی ہضم کر جاؤ گے، اور ڈکار تک نہ لوگے؟ اب ہمارا اور آپ کا ساجھا نہ ہوگا تو بُری ٹھہرے گی ÷

داروغہ۔ کیا! کس سے کہتے ہو۔ یہ ساجھا کیسا۔ آخر ہم بھی تو سُنیں۔ بھنگ تو نہیں پی گئے ہو کہیں؟ یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو؛ ذرا سمجھ بوجھ کر بات زبان سے نکالا کیجئے۔ یہاں بیہودہ بکنے والوں کی زبان دست پناہ سے نکال لی جاتی ہے تم ٹکر گدوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟

خوجی (کمر کس کر) او گیدی! قسم خدا کی اتنی قرولیاں بھونکی ہوں۔ کہ یاد کرے۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو۔ میں آدمی کو دم کے دم میں سیدھا بنا دیتا ہوں۔ ذری کسی اور بھروسے نہ بھولئے گا۔ کیا خوب! اڑتیس کے ڈیڑھ سو دلوائے، اور پچاس خود اُڑائے۔ اور اوپر سے غرّاتا ہے مردک۔ بہت داروغگی کے بھروسے نہ بھولئے گا۔ میں ابھی تو نواب صاحب سے سارا کچّا چٹھا جڑتا ہوں کھڑے کھڑے نہ نکال دیے جاؤ تو سہی۔ ہم تمام عمر رئیسوں ہی کی صحبت میں رہے ہیں۔ گھانس نہیں چھیلا کئے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے بیس روپے ادھر رکھ دیجئے، اور بیسیوں چہرہ شاہی ہوں۔ بس اسی میں خیر ہے۔ ورنہ اُلٹی آنتیں گلے پڑینگی۔ اب سوچتے کیا ہو۔ ذرا چین چپڑ کرو، تو ابھی ابھی قلعی کھول دوں۔ یہ اکڑنا وکڑنا سب بھول جائے۔ اور یوں تو بیس پر معاملہ ہوتا ہے۔ بولو۔ اب کیا رائے ہے؟ بیس روپئے سے غم کھاؤ گے یا ذلّت اٹھاؤ گے۔ پہلے تو بڑے گرم ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کھا ہی جاؤ گے۔ مگر اب موم ہو گئے۔ لے بس اب لائیے لائیے بیس چہرہ شاہی سامنے بسا دیجئے۔ ورنہ خیر نہیں نظر آتی۔ ابھی تو کوئی کانوں کان نہ سنے گا، پیچھے البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے ÷

داروغہ۔ واہ ری پھوٹی قسمت! آج صبح صبح بوہنی تو اچھی ہوئی تھی۔ اچھے کا منہ دیکھ کر اُٹھے تھے۔ مگر حضرت نے اپنی منحوس صورت دکھائی۔ خدا

جانے یہ ذاتِ شریف کہاں سے سُن رہے تھے۔ لاحول ولا قوۃ۔ واہ رے ہم اور واہ ری ہماری قسمت! کہئے اب باون میں سے آپ کو بیس ایک رقم کی رقم نکال دیں، تو ہمارے پاس کیا خاک رہے۔ اور ہاں، خوب یاد آیا۔ باون کس مردود کو ملے۔ کل سینتالیں ہی تو ہمارے ہتھے چڑھے۔ دس تم بھی لو بھئی (ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر) مان جاؤ اُستاد۔ ہمیں ضرورت تھی۔ اس سے کہا۔ ورنہ کیا بات تھی اور پھر ہم تم زندہ ہیں، تو سینکڑوں لُوٹیں گے۔ میاں یہ ہاتھ دونوں لُوٹنے اور رقم ہی چیرنے کے لئے ہیں یا کچھ اور ؛

خوجی۔ دس میں تو ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ اچھا بھئی پندرہ دو ؛

الغرض داروغہ نے مجبور ہو کر پندرہ روپئے میاں خوجی کی نذر کئے۔ اور دونوں آدمی جا کر شریک محفل ہوئے۔ تو وہاں نواب صاحب کے فرشتے خاں کو بھی خبر نہیں کہ یہاں کیا وارے نیارے ہوئے۔ وہاں شعرخوانی ہورہی ہے۔

ندرت ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نواب۔ خوب بہت ہی خوب! میاں آزاد! آپ بھی کچھ فرمائیے ؛

آزاد ؎

شکل دکھلا او بُتِ گلفام کیا ہو کیا نہ ہو
میں چراغِ صبح ہوں تا شام کیا ہو کیا نہ ہو

اتنے میں ایک بزاز آیا۔ اور چوب دار نے آن کر کہا کہ خداوند! چھاؤنی کا بزاز آیا ہے۔ جو ولائتی کپڑا بیچتا ہے۔ کل بھی حاضر ہوا تھا۔ مگر اُس وقت موقع نہ تھا۔ میں نے عرض نہ کیا ؛

نواب۔ داروغہ سے کہو۔ مجھ سے کیا گھڑی گھڑی آکے پرچہ جڑتے ہو۔ (داروغہ سے) جاؤ بھئی۔ ان کو بھی گئے ہاتھوں بھگتا ہی دو۔ جھنجھٹ کیوں باقی رہ جائے۔ کچھ اور کپڑا آیا ہے ولایت سے ؟ آیا ہے تو دکھاؤ۔ مگر ہاں یا مول کی سند نہیں ؛

بزاز۔ اب کوئی دوج تک سب کپڑا آ جائے گا۔ اور حضور ایسی بات کہتے

ہیں۔ بھلا اس ڈیوڑھی پر ہم نے کبھی بھی مول تول کی بات کی ہے۔ آج تک ؟ اور یوں تو آپ امیر ہیں۔ جو چاہیں کہیں۔ مالک ہیں ہمارے ؛ داروغہ۔ چلو بھئی حساب ہو جائے۔ اُٹھو ؛

داروغہ اور بزّاز چلے۔ جب داروغہ صاحب کی کھپریل میں دونوں سے دونوں جاکر بیٹھے تو میاں خوجی بھی رینگتے ہوئے چلے۔ اور ذن سے موجود۔ داروغہ نے جو ان کو دیکھا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ مُردنی سی چہرے پر چھا گئی۔ چپ۔ ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ سمجھے کہ یہ خوجہ ایک ہی کائیاں ہے۔ دُنیا بھر کا نیاریا ہے۔ اس سے خدا پناہ میں رکھے۔ صبح کو تو مردود نے ہتّے ہی پر ٹوک دیا، اور پندرہ پٹیلے۔ اب جو دیکھا کہ بزاز آیا تو پر موجود۔ آج رات کو اس کی ٹانگ نہ توڑی ہو سہی۔ ٹھہر تو جا توّ۔ چچا ہی بنا کر چھوڑوں تو سہی۔ مگر پھر سوچے کہ :۔ ع

گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

آؤ اس وقت چنیں و چناں کریں۔ پھر سمجھا جائے گا ؛

خوجی۔ داروغہ صاحب ! سلام ؛

داروغہ۔ آؤ بھائی جان ! ادھر مونڈھے پر بیٹھو ؛ اچھی طرح بھئی۔ حقّہ لاؤ۔ آپ کے لئے ؛

بزاز صدر بازار کا رہنے والا۔ ایک ہی اُستاد۔ تاڑ گیا کہ اس کے بیٹھنے سے میرا اور داروغہ کا مطلب خبط ہو جائیگا۔ کسی تدبیر سے اس کو یہاں سے نکالنا چاہیئے پہلے تو کچھ دیر داروغہ سے اشاروں ہی اشاروں میں گفتگو ہؤا کی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بزاز نے کہا کہ میاں صاحب آپ کو یہاں کچھ کام ہے ؟

خوجی۔ تم اپنی کہو لالہ جی ! ہم سے کیا واسطہ ؟

بزاز۔ تم یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ چلو۔ اُٹھتے ہو کہ میں دوں ایک لات اوپر سے ؛

خوجی۔ او گیدی ! زبان سنبھال۔ نہیں تو اتنی قرولیاں بھونکونگا۔ کہ خون خرابہ ہو جائے گا ؛

بزاز۔ اٹھوں پھر نیں ؟

خوجی۔ اُٹھ کے تماشا بھی دیکھ لے ؛

بزاز۔ بیدھا ہے کیا؟
خوجی۔ واللہ جو بے۔تے کیا تو اتنی قرولیاں ؛

قرولیاں کہ کر خوجی کچھ اور کہنے ہی کو تھے کہ بزاز نے بیٹھے بیٹھے منہ دبا دیا اور ایک چپت جمائی۔ چلئے دونوں گتھ گئے۔ اب داروغہ جی کی سنئے کہ بیچ بچاؤ کس مزے سے کرتے ہیں۔ کہ خوجی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور کمر دبائے ہوئے ہیں۔ اور بزاز اوپر سے ان کو ٹھونک رہا ہے۔ اور داروغہ صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر غل مچائے جاتے ہیں کہ میاں کیوں لڑتے مرتے ہو۔ بھئی دھول دھپے کی سند نہیں۔ زبانی ہی دا خلہ رہے۔ خوجی اپنے دل میں جھلا رہے ہیں کہ اچھے میر فیصلہ بنے۔ اتنے میں کسی نے نواب صاحب سے جا کر کہ دیا کہ میاں خوجی اور داروغہ صاحب اور بزاز تینوں گتھے پڑے ہیں تو ایک مصاحب بولے کہ بھئی واللہ اچھی تگڈم ہے ؛

اتنے میں بزاز دوڑا ہوا آیا اور نواب صاحب سے فریاد کی کہ ہجور (حضور)! ہم آپ کے ہاں تو سستا مال دیتے ہیں۔ مگر یہ کھوجی (خوجی) حساب کتاب کے وکھت (وقت) نہ ٹلے لاکھ لاکھ کہا کئے کہ بھئی! ہم اپنے مال کا بھاؤ تمہارے سامنے نہ بتائینگے۔ مُل انہوں نے ہاری مانی نہ جیتی۔ اور اُلٹے نبجے جھاڑ کے چپٹ کی ٹھہرائی۔ کمجور (کمزور) مار کھانے کی نشانی میں نے وہ گدا دیا کہ چھٹی کا دودھ یاد کرتے ہونگے۔ داروغہ بھی روتے پیٹتے آئے کہ دہائی ہے۔ چارپائی کی پٹی توڑ ڈالی خاصدان توڑ ڈالا۔ اور سینکڑوں ہی صلواتیں سنائیں ؛

میاں خوجی ایسے دھپیائے گئے۔ اور اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس کچھ پوچھئے نہیں۔ داروغہ نے تو حضرت کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بزاز نے تان تان کر لپڑ لگانے شروع کئے۔ خوجی نے دونوں کو گیدی اور مردک خر بنایا۔ اور بہت کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی کہ لانا میری قرولی۔ مگر ایک نے بھی شنوائی نہ کی۔ نواب صاحب کو جو خدام با ادب نے خبر کی تو بزاز دوڑا آیا اور معاً یہ فقرہ چست کیا کہ حضور! میں تو حساب کرنے آیا تھا۔ مگر جس قیمت پر اس سرکار میں کپڑا فروخت کرتا ہوں، اس قیمت پر کسی اور کے ہاتھ تھوڑا ہی بیچتا ہوں۔ خوجی وہاں داروغہ جی کے پاس ڈٹے بیٹھے تھے۔ میں سوچا کہ سب قسم کے کپڑوں کی قیمت سے واقف ہو جائینگے اور صورت سے

آدمی کھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ان سے ڈرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ خوجی صاحب آپ ذرا اس وقت باغ میں ٹہلئے تو ہم حساب کر لیں۔بس اس پر آنکھیں نیلی پیلی کر کے لام کاف بکنے لگے۔ نواب کے دل میں یہ بات کھب گئی۔ خوجی اور داروغہ اور بزاز تینوں کو بلوایا اور اظہار لینے شروع کئے ؛

نواب۔ داروغہ صاحب ! یہ کیا جھگڑا تھا ؟ بھئی تم تو بیٹھے بیٹھے خوب مینڈھے لڑا دیتے ہو ؛

داروغہ۔ حضور ! یہ خوجی صاحب تو بڑے ہی تیکھے آدمی ہیں۔بات بات بات پر فرولی بھونکتے ہیں۔اور گیدی تو تکیہ کلام ہے حضرت ! تا کے باشد۔ یہ بے گیدی بنائے نہ چھوڑینگے۔اس وقت لالہ بلدیو ہی سے بھڑ پڑے۔ اب میں لاکھ ہاں ہاں کرتا ہوں۔ سمجھاتا ہوں۔ وہ ہاری مانتے ہیں نہ جیتی۔ وہ تو یہ کہیئے، میں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ ورنہ ایک آدھ کا سر ہی پھوٹ جاتا ؛

بزاز۔ بڑے بھلے آدمی ہیں۔ وہ تو دروگا (داروغہ) بچرؤ (بیچارے) نہ آ جائیں تو کپڑے وپڑے پھاڑ ڈالیں ؛

خوجی۔ تو اب روتے کاہے کو ہو۔ جو ہؤا سو ہؤا۔آئی گئی بات ہو گئی۔ اب یہ دکھڑا لے کے کیا بیٹھے ہو ؛

نواب۔ لپّا ڈکی تو نہیں ہوئی ؟

خوجی۔ نہیں حضور ! شریفوں میں کہیں ہاتھا پائی ہوتی ہے بھلا ! ہم نے ان کو للکارا۔انہوں نے ہم کو ڈانٹا۔ مگر کندے تول تول کے دونوں رہ گئے۔ بھلے مانس پر ہاتھ اُٹھانا کچھ دل لگی ہے اور پھر شریف کہیں پٹ کے آتے ہیں ؛

راوی۔ واہ میاں خوجی ! کیوں نہ ہو۔اتنی بے بھاؤ کی پڑیں کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔مگر نواب صاحب کے سامنے جا کر کیا شیخی جتاتے ہیں۔ کہ شریفوں میں کہیں لپّا ڈکی کی نوبت آتی ہے ؟ یہ نہ کہا کہ دونوں کے دونوں چمٹ گئے اور مارتے مارتے کچومر نکال دیا ؛

خیر ادھر تو میاں خوجی نواب کی محفل میں جا کر بیٹھے اور اُدھر لالہ بلدیو اور داروغہ صاحب گئے کہ حساب کر لیں ؛

داروغہ۔ ہاں بھئی لالہ بتاؤ ؛

لالہ۔ اجی بنائیں کیا۔ جو چاہو دلوا دو ؛
داروغہ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا آنا کیا ہے ؟ سو دو سو۔ دس بیس پچاس جو ہو کہ دو ؛
لالہ۔ دروگا جی ! آج کل کپڑا بڑا مہنگا ہے ؛
داروغہ۔ لالہ ! تم نرے گاؤدی ہی رہے۔ اجی ہم کو گراں اور ارزاں سے کیا واسطہ۔ ہم کو اپنے حق سے مطلب ہے۔ تم تو اس طرح کہتے ہو جیسے ہماری گرہ سے جاتا ہے ؛
لالہ۔ پھر اب کی سات سو ترپن روپے نکالئے ؛
داروغہ۔ سات سو ترپن۔ بس ! ارے میاں اب کے اتنے دنوں میں بس سات ساڑھے سات ہی سو کی نوبت آئی ؟
لالہ۔ جی ہاں۔ اجی آپ سے تو کچھ پردہ ہی نہیں۔ دو سو اور چھبّن روپئے کا کپڑا آیا ہے۔ اندر باہر سب ملا کے۔ مگر پرسوں تو نواب صاحب کہنے لگے کہ اب کے تو تمہارا کوئی پانچ چھ سو کا مال آیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایسے موکے (موقع) پر چوکنا گدھا پن ہے۔ وہ تو پانچ سو بتاتے تھے۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ حساب کئے سے معلوم ہو۔ کُل کوئی سات آٹھ سو کا آیا ہوگا۔ تو اب سات سو ترپن ہی رکھئے۔ اس میں ہمارا آپ کا سمجھوتہ ہو جائے گا ؛
داروغہ۔ اجی سمجھوتہ کیسا۔ ہم تم کچھ دو تو ہیں نہیں۔ اور ہمارے تمہارے تو باپ دادا کے وقت کے مراسم ہیں۔ تم تو مثل اپنے عزیزوں کے ہو۔ لے بولو۔ کتنے پر فیصلہ ہوتا ہے بتاؤ ؛
لالہ۔ بس دو سو چھبّیس تو ہم کو ایک دیجئے اور تین سو اور دیجئے اس کے بعد جو بڑھے وہ آپ کا ؛
داروغہ۔ ٹھہرو میں حساب تو لگا لوں۔ دو اور تین پانچ ہوئے تو پانچ سو چھبّیس تو تم لو۔ اور وہاں بچا کیا۔ سات سو ترپن میں سے پانچ سو چھبّیس گئے تو کتنے بچے ؟
لالہ۔ دو سو ستائیس ؛
داروغہ۔ (قہقہہ لگا کر) اچھا بھئی منظور۔ ہاتھ پر ہاتھ مارو ؛
لالہ۔ پھر دلوائیے تو چلیں ؛

داروغہ۔ ابھی لو۔ گھبراتے کیوں ہو ؛

داروغہ نے پانچ سو چھبیس روپیئے بزاز کے حوالے کئے اور دو سو ستائیس نلوہ اڑائے۔ بزاز جانے لگا تھا کہ داروغہ نے پھر پکارا ؛

داروغہ۔ بھئی سنتے ہو۔ سات سو ترپن روپیئے چھ آنے لکھ لو تاکہ معلوم ہو کہ آنے پائی سے حساب لیس ہے ؛

لالہ (مسکرا کر) بڑے کائیاں ہو دروگا جی! اجی دو سو ستائیس روپیہ چھ آنہ کل آپ کا ؛

آواز۔ "بلکہ آپ کے باپ کا" ؛

جیسے ہی داروغہ اور لالہ میں باہم گفتگو ہو چکی، ویسے ہی ایک موکھے میں سے آواز آئی۔ لالہ نے کہا کہ کل آپ کا۔ اور آواز آئی کہ "بلکہ آپ کے باپ کا" تب تو دونوں چونکنّے ہوئے کہ بھئی یہ کون بولا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ سخت حیرت ہے کہ یا الٰہی! یہ کون بولا۔ داروغہ کے حواس غائب۔ بزاز کے بدن میں خون کا نام نہیں کہ اتنے میں پھر آواز آئی "کہو کچھ یاروں کا بھی حصّہ ہے؟" تب تو دونوں کے رہے سہے ہوش اور بھی اُڑ گئے۔ کہ یہ اسرار کیا ہے ؛

اب سنئے کہ جب خوجی نواب نامدار کی بزم عشرت بار میں بیٹھے، تو داروغہ اور بزاز دونوں کو ڈھارس ہوئی کہ اب یہ بلا ٹلی۔ اور پھر وہ سوچے کہ پٹ پٹا کر اب کس منہ سے میاں خوجی یہاں آئیں گے۔ لیکن خوجی ایک ہی بے حیا۔ راستے بھر یہی خیال تھا۔ کہ وہ لوگ مطمئن ہو کر وارے نیارے کر رہے ہونگے۔ تو چپکے سے کسی بہانے اُٹھے اور اُٹھ کر کھپریل کے پچھواڑے ایک موکھے کی راہ سے سب سُنا کئے۔ جب کل کارروائی ختم ہو گئی، تو فرمایا کہ (بلکہ آپ کے باپ کا)۔ خیر۔ داروغہ اور لالہ بلدیو نے ان کو ڈھونڈ نکالا اور للّو پتّو کرنے لگے ؛

بزاز۔ ہمارا کسُور (قصُور) ماپھ (معاف) کیجئے ؛

داروغہ۔ اجی یہ ایسے آدمی نہیں۔ یہ بے چارے کسی سے لڑنے بھڑنے والے نہیں۔ اپنے کام سے کام ہے۔ باقی لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ دل میں کدورت آئی اور صاف ہو گئے ؛

خوجی۔ یہ باتیں تو عمر بھر ہوا کریں گی۔ مطلب کی بات فرمائیے ؛

داروغہ۔ جو ارشاد ہو ؛

خوجی۔ لاؤ پھر کچھ ادھر بھی ؛

داروغہ۔ جو کہو ؛

خوجی۔ سو دلوائیے۔ پورے ایک سو لئے بغیر نہ ٹلوں گا۔ آج تم دونوں نے مل کر خوب ہماری مرمت کی ہے۔ اور ہمارے پاس اتفاق سے قرولی نہ تھی؛

داروغہ۔ یہ تیس روپئے تو ایک لیجئے۔ اور یہ دس کا نوٹ بس۔ اور جو الیسٹھ کیجئے تو اس سے بھی ہاتھ دھوئیے ؛

خوجی۔ اجی از خرمن موئے بس ست۔ لائیے چالیس کیا کم ہیں ؛

بزاز۔ کھاسی رکم کی رکم ہے (خاصی رقم کی رقم ہے) ؛

خوجی تمہاری بھی پانچوں گھی میں ہیں، اور سر کڑاہی میں ہے ؛

داروغہ۔ (اپنے دل میں) اچھے ملے۔ ہم سمجھے تھے۔ کہ بس ہم ہی ہم ہیں۔ مگر یہ ہمارے بھی گرو پیدا ہوئے۔ جب دیکھو، ساجھے کو مستعد۔ اچھا پیٹا مارا، مگر اب ان کے دن بھی پورے ہو گئے ؛

حکمتِ عملی

از پروفیسر محمد سجّاد مرزا بیگ دہلوی

تعلیمِ نسواں

موجوداتِ عالم میں کوئی شے اس وقت تک کامل نہیں خیال کی جا سکتی، جب تک اس کے تمام اجزاء کامل نہ ہوں۔ اگر کسی لمپ کی چمنی شکستہ یا میلی ہو تو خواہ وہ کیسا ہی قیمتی اور خوشنما لمپ ہو، اس کی روشنی پوری صاف نہ ہوگی۔ انسان کیسا ہی عالی خاندان، کیسا ہی نجیب الطرفین اور دولت و ثروت و حکومت کے لحاظ سے کیسا ہی عالی مرتبہ کیوں نہ ہو، بہ لحاظِ شرافت اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کا دماغ علم کی روشنی سے منوّر نہ ہو، جب تک کہ اس کے اخلاق و فضائل مسلّمہ، عمدہ اور قابل تعریف نہ ہوں۔ کوئی انسان کیسا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، اُس کی صحت

کامل نہیں تسلیم کی جائے گی، جب تک اس کے تمام اعضا اپنا اپنا کام اچھی طرح نہ ادا کرتے یا نہ ادا کر سکتے ہوں۔ یہی حال قوم کا ہے کہ کسی قوم کا تمدّن اُس وقت تک اعلیٰ نہ ہوگا۔ جب تک کہ اس کے اکثر افراد میں اعلیٰ قابلیت نہ ہو۔ اور کوئی قوم برگزیدہ، شریف اور ترقی یافتہ نہیں ہو سکتی، جب تک اُس کے اکثر افراد روشن خیال، نیک صفات اور دانشمند نہ ہوں۔ انسان کا گروہ مرد اور عورت سے مرکّب ہے اور ان کے تعلقات اس قدر قوی، ایسے ضروری اور با اثر ہیں کہ ایک کا وجود دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔ ایک کی آسائش، خوشی، انتظام، بقا دوسرے پر منحصر ہے۔ اور کوئی گھر جس میں صرف دو آدمی رہتے ہوں، اُس وقت تک گھر نہیں کہلایا جا سکتا، جب تک ان میں سے ایک عورت نہ ہو۔ پس انسان کا گروہ اس وقت تک شائستہ، مہذّب اور ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا، جب تک یہ دونوں افرادِ انسانی باہم ترقی نہ کریں۔ عورت و مرد تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور دونوں کی خوبی تصویر کا حُسن ہے۔ جس طرح قوائے انسانی کی تہذیب کے لئے دل و دماغ دونوں قوتوں کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے، اسی طرح سوسائٹی کی تہذیب کے واسطے عورت و مرد دونوں کی تعلیم کی حاجت ہے۔ مرد و عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیّے ہیں اور منزلِ مقصود تک صحیح و سلامت پہنچنے کے لئے دونوں پہیّوں کا استحکام لازم ہے۔ جو لوگ صرف مردوں کو تعلیم دے کر قوم کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ وہ شاید امید رکھتے ہیں کہ پرندے ایک پر سے آسمان پر اُڑ جائیں اور گاڑی ایک ہی پہیّے سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے ؛

فطرت نے جو کچھ پیدا کیا ہے، اس کے لئے ایک خاص غرض اور غایت معین فرمائی ہے۔ عورتیں دُنیا میں محض بے کار و فضول نہیں پیدا کی ہیں، بلکہ اُن کے لئے کرنے کے واسطے خاص کام ہیں۔ اور وہ اگرچہ مردوں کے کام سے مختلف قسم کے ہیں، لیکن ایسے ہی ضروری، ایسے ہی لابدی، ایسے ہی اہم اور ایسے ہی مشکل ہیں جیسے مردوں کے کام۔ اور ان کاموں کے لئے تعلیم و تربیت عقل و فراست، پیش بینی، انتظام کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ مردوں کو اپنے کاروبار کے لئے ان چیزوں کی حاجت ہے۔ عورتوں کے کام مرد اور مردوں کے کام عورتیں نہیں کر سکتیں۔ اور اگر یہ تفریق اُڑ جائے تو نظام تمدّن بگڑ جائیگا بلکہ ہر ایک کو اپنے اپنے کام باحسن الوجوہ پورے کرنے فرض ہیں۔ اور تمدّن کی

کی ترقی اور قومی حالت کی رفاہ بلکہ نسل انسان کی بہبودی کے لئے دونوں کی تعلیم برابر توجہ سے ہونی چاہیئے۔

عورت مرد کی ساتھی، مرد کی مشیر، مرد کی راز دار اور مرد کے گھر کی مالک اور اس کے ساتھ کی برابر کی حصّہ دار ہے۔ لیکن عورتیں مرد سے قوّت و زورِ جسم و توانائی میں بہت کم ہیں۔ مرد کے اعضا زیادہ سخت، زیادہ قوی، زیادہ بڑے ہیں۔ عورت کے اس کی نسبت چھوٹے، نازک، دُبلے پتلے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر مرد کی دماغی قوتیں عورت کی نسبت زیادہ ہیں تو عورت کے دل جذبات مرد سے زیادہ قوی ہیں۔ عقل، دور اندیشی، تدبیر میں خواہ وہ مرد کے برابر نہ ہو، لیکن اس کے دل میں محبّت، رحم، غم، غصّہ، خوشی و انفعال کا احساس مرد کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ مرد اگر سوسائٹی کا سر ہے تو عورت دل۔ اور جس طرح ایک شخصی تہذیب کے لئے دل و دماغ کے قواء کی تہذیب کی ضرورت ہے، اسی طرح نوعی تہذیب کے واسطے مرد و عورت کی تعلیم لازمی ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ مردوں کے دماغ اور عورتوں کے دل کی تہذیب کی جائے، بلکہ اس کے برعکس عورتوں کے دماغ اور مردوں کے دل کی تہذیب کی بھی حاجت ہے۔ بلکہ کمزور حصّے کو تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے۔ ایک مُردہ دل اور بے جر شخص سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں۔ اسی طرح ایک دیوانی عورت بھی گھر کے کام کی نہیں ہے۔ جس مرد کے دل میں خدا کا خوف، انسانی ہمدردی، انصاف نہ ہو، وہ خود غرض اور آزار دِہ ہوگا۔ اسی طرح جس عورت کے دماغ میں عقل و ذکاوت و فہم نہ ہو۔ وہ اگر خوبصورت سے خوبصورت بھی ہے۔ تو چینی کی مورت ہے۔ اس لئے عورتوں کی قوتِ عقل کو ترقی دینے کے لئے تعلیم کی حاجت ہے۔ تعلیم سے انسان کے قواء باطنی ایسے مکمل ہو جاتے ہیں کہ وہ مشاہدے اور تجربے سے صحیح صحیح نتائج استنباط کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور جو واقعات پیش نظر ہیں یا جو حالتیں گزر رہی ہیں، ان کی نسبت صحیح رائے قائم کر سکتا اور اس کا خیال اس کی صحیح کیفیت ظاہر کر سکتا ہے۔ نیز وہ اپنی معلومات کے وسیلے سے صحیح استدلال قائم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اہم فرائض کی حقیقت کو سمجھتا اور اس کو باحسن وجوہ انجام دے سکتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو بھی تعلیم کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی مردوں کو۔

لیکن یہ تعلیم ایسی بھی نہیں ہونی چاہیئے کہ عورتوں میں سے اس خصوصیت بلکہ اس جوہر کو کھو دے جو قدرت نے مصلحتاً ان کو عطا فرمایا ہے۔ بلکہ یہ تعلیم و تربیت اس قسم کی ہو کہ اگرچہ قواء دماغی کی تہذیب ہو لیکن قواء دلی کی وہ حالت جو فطرتاً پیدا کی گئی ہے اور زیادہ ترقی کرے۔ تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ انسان کے فطرتی خواص کو بدلے۔ بلکہ یہ منشا ہے کہ جو خاصیتیں قدرتاً پیدا کی گئی ہیں، اُن میں جلا اور صیقل ہو جائے۔ اس لئے اس سے پہلے کہ یہ سوچا جائے کہ عورتوں کو کیا تعلیم دی جائے، یہ دیکھنا چاہیئے کہ دُنیا میں عورتوں کو قدرت نے کیا مرتبہ دیا ہے۔ اور کس قسم کے کام اُن کے سُپرد کئے ہیں۔ عورتیں اگرچہ مردوں کی لونڈیاں نہیں ہیں، لیکن مردوں کو ان پر فضیلت حاصل ہے۔ سوسائٹی میں قدرتاً عورت کا رتبہ مرد کے بعد ہے۔ مرد اپنے بل پر کھڑا ہوتا اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کرتا ہے۔ مرد کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں صرف اپنے ہی کئے سے کچھ ہو سکتا ہے اور دنیا میں اُسے بلا کسی کے سہارے کے آگے بڑھنا چاہیئے۔ لیکن عورت بلا سہارے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ضرور ہے کہ عورت اپنے باپ، اپنے بھائی اپنے خاوند پر بھروسا کرے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بلکہ پیچھے پیچھے چلے۔ اگر عورتوں کو بلا سہارے چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک دن میں برباد ہو جائیں۔ اُن کی فطرتی نزاکت عموماً دنیا کے حوادثات اور سختیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مرد عورت کا محافظ ہے اور عورت مرد کی معاون۔ اور وہی تعلیم زیادہ عمدہ زیادہ مفید ہوگی۔ جو عورتوں میں اس معاونت کی قابلیت کو بڑھائے تاکہ سوسائٹی کا قوام نہ بگڑے اور ہر جنس اپنے اپنے کام کو اچھی طرح انجام دے۔ عورتوں سے یہ معاونت محبت اور مہربانی کی خدمتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ننھے ننھے بچوں کی پرورش آسان کام نہیں۔ اور عورت سے زیادہ دلچسپی سے اُسے کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ بیماروں کی تیمارداری جس سلیقے اور دلی جوش سے عورتیں کرتی ہیں اور جیسا آرام وہ بیمار کو پہنچاتی ہیں، مردوں سے ممکن نہیں۔ رنج، مصیبت، افلاس اور سختی کے زمانے میں جیسی تسکین عورتوں سے پہنچتی ہے اور جیسی خاموشی اور استقلال سے وہ مردوں کا ساتھ دیتی ہیں اور صبر و برداشت کرتی ہیں، وہ خاص انھی کا حصّہ ہے۔ انتظام خانہ داری میں عورت سے زیادہ

کسی شخص سے انسان کو وہ آرام و راحت نہیں مل سکتی۔ جو عورت سے ملتی ہے۔ اور گھر کا انتظام چھوٹی سی بات نہیں بلکہ ایسی شئے ہے جس پر انسان کی زندگی بھر کی راحت، خوشی بلکہ کامیابی کا دار و مدار ہے۔ اور جس شخص کے گھر کا انتظام بگڑا ہوُا ہے، اس کو خواہ امیر ہو یا غریب، دنیا میں چین نہیں ؛

عورتیں جسمانی طاقت میں مرد کی نسبت کمزور ہوتی ہیں۔ اور ان کے بدن بھی مردوں کی نسبت نازک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کی قوتِ ادراک اور فہم مرد کی نسبت کم اور ان کا دل بھی کمزور و نازک ہوتا ہے۔ عورتوں میں حیا اور اخلاق کے حاصل کرنے کی قابلیت مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے مذہبی عقائد بھی مردوں کی نسبت زیادہ مستحکم اور قوی ہوتے ہیں۔ لیکن اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی بھی بہت ہوتی ہے۔ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ باعصمت اور زیادہ پرہیزگار ہوتی ہیں۔ اور وہ اپنی عصمت کو عزت و آبرو کا باعث خیال کرتی ہیں۔ عورتوں میں محبّت اور نفرت کے دونوں مادّے مردوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی محبّت یا بغض کا دائرہ وسیع نہیں ہوتا۔ قومی کاموں میں عورتیں شاذ و نادر ہی حصّہ لیتی ہیں۔ ان کی محبّت اپنے بال بچّوں اور گھر والوں تک محدود رہتی ہے۔ لیکن ہمدردی اور شفقت کا مادہ عورتوں میں زیادہ تیز اور قوی ہوتا ہے اور مصیبت زدہ کے حال پر عورتوں کو زیادہ رحم آتا ہے۔ اور اکثر وہ اس کی مدد کرنے میں مردوں سے زیادہ تکلیف بھی برداشت کر لیتی ہیں۔ عام طور پر اُن کی حالت کا اقتضا یہ ہے کہ گھر کے کار و بار ان کے ہاتھوں میں دیئے جائیں اور مرد باہر کے کام انجام دیں۔ اگر عورت اور مرد کی ایک ایک ایسی تصویر کھینچی جائے۔ جس سے ان کے خصائل اچھی طرح معلوم ہو سکیں، تو مرد کی تصویر سے دلیری، ہمّت و تدبّر ظاہر ہوگا۔ اور عورت کی تصویر دیکھیں تو شرم حیا، خوف، بھروسہ، نرم دلی پائی جائے گی۔ اور یہی ایسی صفات ہیں جو عورت و مرد میں تمیز پیدا کرتی ہیں ؛

عورتیں صرف مردوں کے دل بہلانے کے لئے ہی نہیں پیدا کی گئی ہیں، بلکہ وہ دُنیا کے انتظام میں حصّے دار اور امن و آسائش کی کارپرداز ہیں۔ وہ زندگی کو خود اپنے لئے اور دوسروں کے لئے مفید اور بکار آمد

بناتی ہیں خداوند تعالےٰ نے ان کو دماغ اور قوّتِ متخیّلہ عطا فرمائی ہے۔ اگرچہ یہ قوّت مردوں کی نسبت کم ہو، لیکن یہ کمی اتنی کمی نہیں ہے کہ صفر کے درجے پر ہو۔ جو کام ان کو بطور فرض ادا کرنا پڑتے ہیں، اُن کے لئے ہمدرد دل اور فہم رسا کی ضرورت ہے۔ عورتوں کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا وقت آسائش و سنگھار میں صرف کریں۔ اور اگر ایسا کریں گی تو شائد حسن و صورت میں نظر فریبی پیدا کرلیں۔ لیکن زندگی کے کار و بار اس سے نہیں چل سکتے۔ بلکہ اس استعداد کے حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ تعلیم سے یہ مراد نہیں کہ مردوں کی سی تعلیم دی جائے۔ بلکہ اُن فنون کی تعلیم سے مراد ہے۔ جو عورتوں کے لئے ضروری اور بکار آمد ہیں۔ اور جن کی مقدار اسی قدر ہو جتنی کہ مردوں کی تعلیم کی، اگرچہ مضامین میں اختلاف ہو۔ تعلیم عقل کو روشن کرتی اور قواء دماغی کو جلا دیتی ہے۔ اور گھر کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں عورت کی دانش اور فراست سے اس کی عمدگی نہ بڑھتی ہو۔ تعلیم عورت میں خیالات کی بلندی اور پیش بینی پیدا کرتی ہے۔ اور تعلیم کے اثر سے عورت اس قابل ہو سکتی ہے کہ وہ گھر کا انتظام بلکہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کا انتظام سوچ سمجھ کر کرے اور انتظام خانگی کے عمدہ عمدہ اصول سوچے۔ تعلیم ہرطرح عورت کو ایسی تقویت دیتی ہے۔ جیسی کہ مردوں کو تقویت بخشتی ہے۔ تعلیم عورت کو دھوکے اور فریب سے بچاتی اور اس کو بہت سے جاہلانہ لالچوں اور اوہام پرستی سے محفوظ رکھتی ہے۔ تعلیم عورت کا اثر زیادہ قوی اور ساتھ ہی زیادہ مفید بھی کر دیتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ وہ کہتی یا کرتی ہے، وہ کہنے اور کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اور ہر دل اس کو نہ صرف بسُہولیت بلکہ بطیبِ خاطر منظور کرتا ہے۔ اگر عورتوں کے اخلاق کمزور اور ان کے دل ناپاک ہوں تو مرد ان کے اثر سے نہیں بچ سکتے کیونکہ انسان کی اخلاقی تعلیم زیادہ تر اس کے گھر کی حالت پر منحصر ہے۔ اس لئے عورتوں کی تعلیم نہ ان کی ذات کے لئے مفید ہے بلکہ قومی بہبودی اور ترقی کا زینہ بھی ہے۔ جس قدر عورت اور مرد دونوں کے قواء عقلی اور غضبی مہذّب اور شائستہ ہونگے، جس قدر ان کے دل آلائش سے پاک اور منزّہ ہوں گے اور جس قدر ان کے قواء کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہوگی، اُسی قدر سوسائٹی میں امن و ترقی، بہبودی اور آسائش

ہوگی۔اور اسی قدر انسان کا تمدّن اعلیٰ درجہ پر ہوگا۔ اس لیئے عورتوں کو تعلیم دینا گویا مردوں کو تعلیم دینا ہے اور عورتوں کا رویّہ اور عقل درست کرنا مردوں کا اخلاق درست کرنا ہے۔ جہاں کہیں عورتوں کی حالت خراب ہوگی، وہاں مردوں کی حالت خراب ہونی لازمی ہے۔کسی قوم کی حالت خراب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ممبروں کی حالت درست نہیں ہے۔اور لڑکوں کی ابتر حالت اس کا نتیجہ ہے کہ مائیں جاہل ہیں۔ بچّوں کی صحت، اخلاق، ابتدائی تعلیم سب ماؤں کی نگرانی میں ہوتی ہے۔خصوصاً صحت کا مسئلہ ایسا ہے کہ اخلاق اور تعلیم بھی اس کے تحت میں آ جاتے ہیں۔ جو عورتیں صحت کے اصول سے ناواقف ہیں۔یا اصول اخلاق سے جاہل ہیں، وہ اپنے بچوں کو کسی طرح عمدہ تربیت نہیں کر سکتیں اور اس وقت کے بے تربیتی یا فسادِ صحت آئندہ عمر بھر اپنا رنگ دکھلاتا ہے۔تعلیم یافتہ عورت ابتدا ہی سے اپنی اولاد میں حسن اخلاق کی جڑ قائم کر سکتی ہے۔

ہر چیز کی خصوصیّت اس کا جوہر ہے۔آفتاب کی تمازت اور تیز روشنی اس کا خاصہ ہے۔ماہتاب کی ہلکی اور ٹھنڈی روشنی ماہتاب کی دلآویزی اور خوشنمائی اور عام پسند ہونے کا باعث ہے۔اگر ماہتاب کی یہ خاصیت جاتی رہے اور وہ آفتاب کی ہمسری کرنے لگے تو رات کی بہار اور راحت ہٹ جائے اور ساتھ ہی ماہتاب بے قدر ہو جائے۔ اگر کوئی تعلیم عورتوں میں سے عورتوں کے جوہر مٹا دے تو وہ سوسائٹی کے راحت و آرام اور امن و آسائش کو کھو دیگی۔اور نہ صرف مرد ہی بلکہ عورتیں بھی مصیبت میں پڑ جائینگی۔ دنیا میں جو شخص جس کام کے واسطے پیدا کیا گیا ہے، اُسے پورے طور پر انجام دینا اس کی سعادت و عزّت کا باعث ہے۔ اور اس حد سے افراط و تفریط میں تجاوز کرنا اور دوسروں کی نقلیں اُتارنا اپنی عزّت کا کھو دینا ہے۔اگر کسی عورت سے کوئی ایسا کام بن جائے جو عموماً عورتوں کا حصّہ نہیں ہے تو بعض اوقات سوسائٹی کی غلط فہمی سے اس پر بہت واہ وا ہوتی ہے۔لیکن وہ صرف تعجب کا اظہار ہوتا ہے۔اور اُسی وقت تک رہتا ہے کہ ایک دوسے سرزد ہوا ہو۔گھوڑے کی صفت تیز رفتاری اور اطاعت سوار ہے۔ بندر کی طرح ناچنا اور کرتب دکھانا گھوڑے کی صفت نہیں ہے۔لیکن سرکس کے گھوڑے

کرتب دکھاتے ہیں اور تماشائی ان کی تعریف کرتے ہیں۔اسی طرح سوسائٹی میں بعض عورتیں غیر معمولی طور پر مردوں کے سے کام کرتی ہیں۔اور اُن کی تحسین و آفرین بھی ہوتی ہے۔لیکن وہ صرف اظہار تعجب ہے ۔

سوسائٹی پر عورتوں کے حقوق ہیں۔اور اُن میں سب سے بڑا حق یہ ہے کہ عورتوں کو تعلیم دی جائے۔لیکن فرض وہ تعلیم ہے جو عورتوں کے ذاتی جوہروں کو نہ صرف قائم رکھے بلکہ ترقی دے ۔

اوّل ۔مذہب کی تعلیم عورتوں کے لئے لازمی اور ضروری ہے مذہب کی تعلیم خدا کا خوف، ایمانداری، صداقت، پرہیزگاری، عصمت، رحمدلی، انصاف، فیاضی، رقت قلب، صبر و توکّل پیدا کرتی ہے۔اور یہ ایسے اوصاف ہیں جو ایک عورت میں لازمی طور پر ہونے چاہئیں ۔

عورتوں میں مذہبی تعلیم تمام سوسائٹی کو مذہب کی طرف مائل رکھتی ہے۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ جو کچھ وہ گھر میں دیکھتے ہیں۔وہی سیکھتے ہیں۔ اور جو مذہب ماں کے دُودھ کے ساتھ ان کو حاصل ہوتا ہے، وہ رگ رگ میں ایسا پیوست ہو جاتا ہے کہ پھر اُن کے دل سے اس کے اعتقادات نہیں بھول سکتے۔ماں کا اثر بچّوں کے رویے کو بہت کچھ بناتا یا بگاڑتا ہے۔جس طرح بچّے بچپنے میں عورت کے دُودھ سے پرورش پاتے اور اس کی گود میں پلتے ہیں، اسی طرح عالم طفولیت میں ماں کے اخلاق سے اس کی روح نشو و نما پاتی ہے۔اگر وہ دینداری کی ہوا میں پلتے ہیں تو ضرور بڑے ہو کر بھی ان کے دل میں مذہب کی چمک رہتی ہے۔اور جو بچّے اپنے گھر میں جہالت کا اندھیرا دیکھتے ہیں اور بے دینی اور لامذہبی کی باتیں بچپنے میں ان کے دل میں گھر کر چکتی ہیں تو بڑے ہو کر اگر ان کو علم دین پڑھایا جائے تو اس کی جڑ مضبوط نہیں ہوتی۔ عالم طفولیت میں بچوں پر عورت کا اثر اتالیق کی جہت سے ہوتا ہے۔جوان پر عورت مشیر، صلاح کار، ہمدم و ہمراز بن کر اپنا اثر ڈالتی ہے۔غرض کبھی ماں بہن کی جہت سے اور کبھی بیوی کی حالت میں مردوں پر عورتوں کا اثر رہتا ہے اور انسان کی قسمت میں یہ اثر اچھّا اور بُرا ہو سکتا ہے۔دیندار عورتوں کا اثر ہمیشہ اچھا ہمیشہ مفید اور قابل اعتماد ہوگا۔اور جہاں عورت کی بے دینی

اپنا اثر ڈال رہی ہو، وہاں کی نحوست اور بربادی کا کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

دوم۔ اپنی زبان کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ کلام کی شستگی اور لطافت عورتوں کی زبان کا جوہر ہے۔ اُن کے محاورے اور ادائے مطلب کی آسان اور دلکش ترکیبیں، ان کی ضرب الامثال زبان میں شیرینی اور شستگی پیدا کرتی ہیں۔ اور اس کی سادگی اور حسن کو قائم رکھتی ہیں۔ زبان کی آراستگی میں مردوں سے زیادہ عورتوں کا حصّہ ہے۔ کیونکہ جو صفائی اور شیرینی مرد بہ تکلف زبان میں پیدا کرتے ہیں۔ عورتیں بے ساختہ اور قدرتی طور پر اسے ادا کرتی ہیں۔ اس لئے اپنی زبان کی تعلیم عورتوں کو اعلےٰ درجے کی دینی چاہیئے۔ یہ تعلیم نہ صرف عورتوں کے جوہر کو ترقی دیگی بلکہ خود سوسائٹی کو اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ زبان میں وسعت اور لطافت پیدا ہوگی ؀

جو عورتیں اپنے عزیزوں یا خاوندوں سے دُور ہوتی ہیں اور جہالت کے سبب ان کو خط تک نہیں لکھ سکتیں۔ ان کی تکلیفیں اور دقتیں بھی زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ غیروں سے خط لکھوانے یا پڑھوانے پڑتے ہیں۔ اور کوئی بات خواہ کسی قدر راز کی کیوں نہ ہو پوشیدہ نہیں رکھ سکتیں۔ اپنی زبان پر اتنی قدرت کہ ہر طرح کے مضمون کو بہ آسانی ادا کر سکیں عورتوں کو حاصل ہونی چاہیئے۔ جو شخص اپنے مافی الضمیر کو مناسب الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا وہ گونگا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ اس کی بیوی اس کا مطلب نہ سمجھ سکے یا اپنا مطلب نہ ادا کر سکے۔ اسی طرح عورتوں کا خط بھی پاکیزہ اور پختہ ہونا لازم ہے۔ وہ اگر خوش نویس نہ ہوں تو صاف اور بالقرا ضرور لکھتی ہوں۔ حروف میں اس قدر خوش نمائی ہو کہ اچھے معلوم ہوتے ہوں۔ ذاتی کمالات کی خوشنمائی ظاہری اور عارضی بناؤ سنگھار سے زیادہ دلفریب اور قدر افزا ہوتی ہے۔ ایک عورت کے ہاتھ میں خوشنما خط کنگن اور چوڑیوں سے زیادہ دلکش ہے اور اس کی وقعت اور عزت کو بڑھا دیتا ہے ؀

سوئم۔ علم حساب۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ دفاتر کے محاسب اور تجارت پیشہ اشخاص کو ہی حساب میں مہارت ہو، بلکہ حساب ہر مرد اور ہر عورت کو جاننا چاہیئے۔ کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ انسان کو علم حساب

کے اصول سے کام نہ پڑتا ہو۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے گھر کے انتظام کے لئے بھی حساب جاننے کی ضرورت ہے۔ امیر آدمیوں کی بیویوں کو تو علم حساب سے ہر روز زیادہ کام پڑتا ہے کیونکہ ان کو اپنے گھر کا انتظام بڑے پیمانے پر کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ عورتیں علم حساب سے ناواقف ہوتی ہیں، اس سبب سے گھر کے کاروبار کے انتظام میں وہ اتنا حصہ نہیں لے سکتیں جتنا لینا چاہیئے اور اپنے مردوں کا خانگی انتظام میں ہاتھ نہیں بٹاتیں۔ بعض مردوں کی نسبت عورتوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ خرچ خود اٹھاتے ہیں۔ بے شک گھر کا خرچ اٹھانا عورتوں کا حق ہے۔ لیکن عورتوں کو اپنے تئیں اس لائق بنانا چاہیئے کہ وہ آمدنی کو سلیقے سے خرچ کر سکیں۔ اور آمد و خرچ کا حساب مرتب رکھ سکیں۔ جاہل عورتیں ذرا ذرا سی لین دین میں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ اور گھر کی آمدنی کا ایک حصّہ اپنی جہالت کے ہاتھوں برباد کرتی ہیں۔ عورتوں میں کاروبار کی قابلیت ایسی ہی ضروری ہے۔ جیسی کہ مردوں میں اور اچھے منتظم گھر میں آرام و فلاح قائم رکھنے کے لئے عورت میں کام کرنے کا سلیقہ ہونا لازم ہے۔ کام سے یہ مراد نہیں ہے کہ تجارت ہو۔ بلکہ زندگی کا معمولی کام جو روز مرّہ کیا جاتا ہے ایسا ہی ضروری ہے۔ جو چیز گھر کے استعمال کے لئے خریدی جائے یا گھر کی کوئی چیز فروخت کی جائے یا بنائی جائے، کام ہے۔ اور ان سب کے لئے علم حساب جاننے کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ دکانداروں کے لئے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہزاروں روپیہ خود عورتوں کو خرچ کرنا پڑتا ہے اور چھوٹی بڑی ہزاروں چیزیں خریدی اور بنائی جاتی ہیں۔ کیا ایسے وقت علم حساب کا جاننا ضروری نہیں ہے؟ علاوہ ازیں علم حساب طبیعت میں غور، محنت اور کفایت شعاری کی عادت ڈالتا ہے اور ترتیب، ہوشیاری، پابندی طریقہ اور صحیح نتیجہ نکالنا سکھاتا ہے۔ علم حساب کی ضرورت روپیہ پیدا کرنے کے لئے ہے۔ اور گھر کا روپیہ عورتیں ہی زیادہ خرچ کرتی ہیں ؛

چہارم۔ اصول خانہ داری۔ (تدبیر منزل) کے بیان میں خانہ داری کی لیاقت کی ضرورت پر کسی قدر وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔ شاید اس بات کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ عورت کو اصول خانہ داری

سے واقف ہونا لازم ہے۔ اور یہ ضرورت امرا کو غربا کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ جس قدر کسی گھر میں دولت زیادہ ہو، اُسی قدر گھر والی میں انتظام خانہ داری کی لیاقت زیادہ ہونی چاہیئے۔ اگر کسی انجنیئر کو فنِ تعمیر میں واقفیت نہ ہو یا ڈاکٹر کو علمِ طب سے آگہی نہ ہو یا سپاہی کو استعمالِ آلات حرب نہ آتا ہو تو وہ اپنا فرض ادا نہیں کر سکتا۔ جس عورت کو اصولِ خانہ داری سے آگہی نہ ہو، وہ خواہ مردوں کے سے کام کرے، بلکہ ان سے بہتر کرے، لیکن عورت کے کام انجام نہیں دے سکتی۔ کوئی کام کیوں نہ ہو، اس کا طریقہ آنا ضرور ہے۔ اور اسی کا نام سلیقہ ہے۔ علاوہ ازیں پیش بینی بھی سرانجامِ امور میں مدد دیتی ہے۔ اور پیش بینی اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب دماغ میں امور کے جانچنے سوچنے اور نتیجہ نکالنے کی قوّت ہو۔ اور علم و تجربے نے قوّتِ متخیّلہ کو قوت دی ہو۔ افسوس ہے کہ ملک میں اس وقت ایسی کتابیں رائج نہیں جو اصولِ خانہ داری سکھاتی ہوں۔ سینا پرونا، کھانا پکانا، گھر کا خرچ چلانا، نوکروں کی نگرانی، بچّوں کی نگہداشت اور پرورش، ان کی تربیت وغیرہ ایسے سہل کام سمجھے جاتے ہیں کہ اُن کی طرف ہمارے مصنفین نے ابھی تک التفات نہیں کیا اور اس آسائش و برکت کے حاصل کرنے میں مدد نہیں کی، جس کی ہر شخص کو ضرورت ہے۔ عورتوں کو ان کے مناسب حال تعلیم نہ دینا ایک غلطی سے نکال کر دوسری غلطی میں ڈالنا ہے۔ اُن کو دُنیا میں وہ کام نہیں کرنے جو مردوں کو کرنے ہیں۔ پھر دونوں کو ایک سی تعلیم کیا فائدہ دیگی؟ عورتیں تو عورتیں تمام مردوں کو ایک سی تعلیم مفید و بکار آمد نہیں ہو سکتی۔ اور اس زمانے میں قومی تنزل کا بڑا سبب یہی ہے کہ مردوں کو ضروریات زمانہ کے مطابق تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ سب تو نیب لکڑی ہانکا جاتا ہے۔ اگر اس گروہ میں عورتیں بھی شامل ہو گئیں تو سوسائٹی ترقی تو کرے گی۔ لیکن معکوس!

خانہ داری کا علم عورت کا خاص حصّہ ہے اگر دیگر علوم میں اسے کمال دستگاہ حاصل ہو لیکن خانہ داری کے اصول سے ناواقف ہو تو وہ عورت عالمہ و فاضلہ ہو سکتی ہے لیکن عورت نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص جو علمِ حساب سے ناواقف ہو تاجر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عورت خانہ داری کی قابلیت

کے بغیر عورت کہلانے کی مستحق نہیں ۔

عورت کو خواہ امیر ہو یا غریب ۔ جوان ہو یا بڑھیا، منکوحہ ہو یا غیر منکوحہ، ہر حال میں گھر کے ہر کام کرنے کی لیاقت اور ہر کام کو اچھی طرح انجام دینے کی استعداد حاصل ہونی لازم ہے کیونکہ یہ عورت کا بڑا فرض ہے اگر ان کاموں کا اسے علم نہ ہو تو یہ کام آسان نہیں بلکہ مشکل نظر آئینگے۔ اور مشکل بھی ایسے کہ نہ خود کرنے کی لیاقت اور نہ خادموں سے کام لینے کی قابلیت ۔

تعلیم نسواں کا جہاں ذکر کیا جاتا ہے، وہاں حروف کی شکلوں اور الفاظ کے معنی جاننے سے مراد لی جاتی ہے۔ لیکن تعلیم صرف اسی کا نام نہیں ہے، بلکہ ہر پیشے اور ہر کام کی تعلیم جو کسی خاص شخص یا فرقے کے لئے ضروری ہے، اُسے حاصل کرنی چاہئے۔ ورنہ وہ اس فن میں جاہل رہے گا۔ کسان اور زمیندار کو فلاحت و زراعت، باغبان کو باغبانی، معمار کو عمارت کا علم جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح انتظام خانہ داری کا علم عورت کے لئے فرض ہے اور تعلیم نسواں کے حامیوں کو سب سے پہلے یہ تعلیم دینی چاہئے۔ خصوصاً طفولیت کے زمانے میں اس میں مہارت پیدا کرنی لازم ہے۔ اگر ابتدائی عمر میں اس طرف توجہ نہ کی جائے تو آئندہ بھی اس کام میں دل نہ لگے گا۔ بعض عورتوں کی یہ تعریف کی جاتی ہے کہ وہ شعر خوب کہتی ہیں ۔ بعض ہارمونیم خوب بجاتی ہیں کسی نے کسی غیر زبان میں مہارت حاصل کی ہے۔ لیکن یہ اوصاف اسی وقت تک بہت عجیب اور مستحسن معلوم ہوتے ہیں، جب قوم کے کروڑوں افراد میں ایک دو نے یہ خصوصیت حاصل کی ہو۔ اگر تمام عورتیں صرف اسی طرف متوجہ ہو جائیں اور گھر بار کے کام چھوڑ دیں تو گھر کا شیرازہ بکھر جائے اور لوگوں کو جاہل لیکن سلیقہ مند عورتوں کی تلاش ہو۔ اگرچہ سلیقہ مند عورت کو جاہل کہنا زیبا نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ایسی عورت پسند کرے گا جو میاں بیوی اور بچوں کے کپڑے سینے تو درکنار اپنے کپڑے بھی سینے کے لئے درزی کو دے۔ اور اگر کبھی باورچی یا ماما پکانے والی نہ ہو تو اس دن گھر کے گھر کو فاقہ کرنا پڑے اور بجائے سینے اور پکانے کے اس نے میاں کے سنانے کو ایک عمدہ غزل کہہ کر رکھی ہو۔ اگر اوقات باقاعدہ صرف کئے جائیں، اگر ہر کام مناسب وقت پر اور مناسب طریقے سے کیا جائے تو عورتوں کو اتنا وقت

ملتا ہے کہ وہ گھر کے کام دھندے کے بعد لکھنا پڑھنا سیکھ سکیں اور بعض عورتیں کوئی خاص علم بھی اچھی طرح سیکھ سکتی ہیں۔ امیر آدمیوں کی بیویاں اور بیٹیاں گھر کے کام کرتے ہوئے اس سبب سے شرماتی ہیں کہ وہ کام اُن کے خلاف شان ہیں۔ لیکن یہ جھوٹی شرم ہے۔ جو کام جس کے کرنے کا ہے، اس کے کرنے میں ذلّت نہیں عزّت ہے۔ گھر کا کوئی کام عیب اور قابل شرم نہیں۔ بلکہ یہ کام نہ کرنے اور نہ سیکھنے قابلِ شرم ہیں۔ اور ان کاموں میں جس قدر اعلیٰ مہارت ہوگی۔ اُسی قدر وہ عورت زیادہ قابلِ قدر خیال کی جائے گی۔ اس سے عورت کے مذاق، اس کی ذہانت اور طبیعت کی کیفیت معلوم ہوتی ہے کیونکہ گھر کو بنانا اور سنوارنا آسائش اور زیبائش کا سبب ہے۔ عمدہ کھانا اور کپڑا تیار کرنا، صرف پکانا اور سینا ہی نہیں ہے۔ بلکہ جس کے واسطے کیا گیا ہو، اس کی محبّت کا اظہار اور اس کے واسطے تفریح اور راحت کا سامان ہوتا ہے؛

پنجم۔ علم حفظانِ صحّت۔ انسان کی صحت اور اس کا حُسن ہے اور عورت کا حُسن اس کی قیمت زیادہ کرتا ہے۔ عورتوں کو صحت و توانائی کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی مردوں کو۔ عورتوں کے ذِمّے خانہ داری کے کام ہیں۔ لیکن وہ کام آسان نہیں اور اُن کی نگرانی اور انجام دہی بغیر کامل صحت کے ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں صحت، قیام و ثباتِ ذات کا سبب ہے۔ اور کون کہ سکتا ہے کہ عورت کی ذات دُنیا میں ایسی ناکارہ ہے کہ اس کے قیام و ثبات کی نگہداشت نہ کی جائے۔ اس واسطے عورتوں کو اصولِ حفظانِ صحت کی تعلیم دینی لازم ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اگر کسی شخص میں خود اپنی صحت کی نگہداشت کی لیاقت نہ ہو تو ڈاکٹر اور حکیم اس کی صحت کی ذمہ داری کر سکیں۔ بعض موقعے اور حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہاں کسی عمدہ طبیب کا میسّر آنا ناممکن ہوتا ہے یا بعض بے احتیاطیاں بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ اور یہ بیماریاں اگرچہ ابتدا میں خفیف معلوم ہوتی ہیں، لیکن پھر عمر بھر کے لئے روگ لگا دیتی ہیں۔ جب تک خود انسان کو حفظِ صحت کے اصول معلوم نہ ہوں، وہ صحت جیسی نازک اور ضروری چیز کو اچھی طرح قائم نہیں رکھ سکتا۔ بچّوں کی صحت کا مسئلہ اور بھی زیادہ نازک ہے۔ اور ان کی پرورش بالکل عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ بے احتیاط اور ناواقف عورتیں بچّوں کی صحت کو ایسا خراب کر دیتی ہیں کہ وہ بڑے ہو کر ہمیشہ مریض اور ناتواں رہتے ہیں۔ اور اس واسطے لازم ہے کہ عورتوں کو

حفظانِ صحت کے اصول سے آگہی ہو۔ اس کے علاوہ بعض عورتوں کو طب و ڈاکٹری میں بھی پوری مہارت حاصل کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنی قوم اور ملک کی عورتوں کی خدمت کر سکیں۔ ..... عورتوں کی بعض بیماریاں اس قسم کی ہوتی ہیں کہ وہ ڈاکٹروں سے بیان کرتے شرماتی ہیں۔ بعض وقت بہ ضرورت آ پڑتی ہے کہ اگر کوئی عمدہ ڈاکٹر مشورہ اور مدد نہ دے تو ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ اور ان تمام موقعوں پر عورتوں کی خدمت کی زیادہ حاجت ہوتی ہے۔ عورتیں فرقۂ اناث کی ضروریات و مختصر حالات اور تکالیف سے خود واقف ہوتی ہیں۔ اس سبب سے اُن کے امراض اور کیفیت کو زیادہ سہولت سے سمجھ سکتی ہیں۔ اور چونکہ اس تکلیف کا احساس کر سکتی ہیں۔ ان کو قدرتاً بیمار سے زیادہ ہمدردی اور اُس کے حال پر زیادہ توجہ ہوتی ہے۔ ایک شریف عورت جس طرح ایک لیڈی ڈاکٹر سے اپنی کیفیت بیان کر سکتی اور آزادی سے اپنے تئیں اُس کے حوالے کر سکتی ہے۔ یہ گوارا نہیں کرتی کہ مردوں کو اُس کی خبر بھی ہو۔ اس زمانے میں ڈاکٹر عورتوں کی ضرورت اس قدر زیادہ ہے کہ غیر ملکوں سے ڈاکٹر عورتیں یہاں آکر ہندوستانی عورتوں کی خدمت کرتی ہیں۔ یہ ملک جس طرح تجارتی اشیاء میں دوسروں کا محتاج ہے، اسی طرح حفظِ صحت اور بقاءِ شخصی کے لئے بھی دوسروں کی معاونت کا حاجت مند ہے۔ یورپین و امریکین ڈاکٹر عورتوں کی تعداد اوّل تو اس قدر کافی نہیں ہے کہ اتنے بڑے ملک کی خدمات پورے طور پر انجام دے سکیں۔ بڑے شہروں میں صرف امرا ایسے ایسے نازک موقع پر اُن سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں کہ جب جان پر آ بنے اور ان کی طلب کے بغیر علاج ہی نہ ہو۔ باقی چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندے اور ہر طبقے کے اکثر اشخاص اُن کی خدمت سے محروم ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ غیر ممالک کی عورتیں ایسی ہمدردی اور دلسوزی سے توجہ نہیں کر سکتیں، جیسی اپنی قوم اپنے ملک اپنے مذہب کی عورتیں بکار آمد ہو سکتی ہیں۔ جن کو یگانگت کے سبب بہ سہولت اور ہر وقت طلب کرنا اور مشورہ لینا ممکن ہو۔ متوسط حال اور غربا تو یوروپین لیڈی ڈاکٹروں سے ادائیٔ فیس کی عدمِ استطاعت کے سبب رجوع نہیں کر سکتے اور جو کرتے بھی ہیں تو بیماری سے زیادہ اخراجات کی تکلیف سے مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔ اختلافِ زبان بھی پورے طور پر فائدہ حاصل کرنے

نہیں دیتا نہ یہاں کی عورتیں اپنے مطالب اور حالت کو اُن کی زبان میں ادا کر سکتی ہیں۔ نہ وہ یہاں کی زبان اچھی طرح سمجھتی ہیں۔اس طرح دونوں ایک دوسرے سے الگ اور ناواقف رہتے ہیں۔اور علاج جیسے نازک کام میں دقت واقع ہوتی ہے۔اگر اپنے ملک کی عورتیں طِب و ڈاکٹری میں مہارت حاصل کر لیں تو یہ دِقتیں رفع ہو جائیں اور ہزاروں جانیں تکلیف اور مصیبت سے بچ جائیں ؛

ششم۔عام واقفیت۔یہ ضرور نہیں۔کہ عورتوں کی تعلیم کو ان ہی مضامین پر محدود رکھا جائے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ یہ چیزیں تعلیم کا لازمی جزو ہیں۔اور ابتدا میں اُن سے واقفیت حاصل کرنی فرض ہے۔ جس طرح لباس زیور پر مقدم ہے۔اسی طرح یہ مضامین دوسرے مضامین پر مقدم ہیں۔ان میں جہاں تک کمال حاصل کیا جائے۔ بہتر ہے۔اس کے علاوہ اگر فرصت و موقع ہو تو علم و فضل میں زیادہ کمال حاصل کرنا اور قواء دماغی کو ترقی دینا شرافت و سعادت کی تکمیل ہے ؛

دربارِ اکبری
از شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد
راجہ مان سنگھ

سنہ ۹۶۳ھ پہلے سال جلوس میں دربار اکبری سے مجنوں خان قاق شال نلدنول پر حاکم ہو کر گیا۔ حاجی خان کہ شیر شاہ کا غلام تھا۔وہ مجنون خان پر چڑھ آیا۔راجہ بہاڑا مل راجہ آنبیر کہ اس وقت کچھواہہ خاندان کا چراغ روشن کرنے والا تھا۔ حاجی خاں کے ساتھ تھا۔ مجنوں خاں کی عقل و ہوش جاتی رہی۔ گھر گئے اور حالت تنگ ہوئی۔ خاندانی راجہ مردِ کہن سال مروّت و انسانیت کے جواہر سے خزانہ دار تھا۔اور بات کے نشیب و فراز انجام و آغاز کو خوب سمجھتا تھا۔اُس نے صلح کا بندوبست کر کے مجنوں خاں کو محاصرے سے نکلوایا۔اور عزّت و حرمت کے ساتھ دربار شاہی کو روانہ

کر دیا۔ یہی راجہ بہاڑا مل ہیں۔ جو راجہ بھگوانداس کے باپ اور مان سنگھ کے دادا تھے ؛

مجنوں خاں جب دربار میں پہنچا۔ تو راجہ کی مروّت۔ محبّت۔ اخلاص۔ عالی ہمّتی اور اس کے عالی خاندان کے حالات اکبر کے سامنے بیان کیئے۔ دربار سے ایک امیر فرمان طلب لے کر گیا۔ راجہ سامان معقول کے ساتھ حاضرِ دربار ہوُا۔ یہ وہی مبارک موقع تھا کہ اکبر ہیمو کی مہم مار کر دِلّی آیا ہوُا تھا۔ چنانچہ راجہ کی بڑی عزّت اور خاطرداری کی ؛

جس دن راجہ اور فرزند اور اس کے ہمراہی بھائی بندوں کو خلعت اور انعام و اکرام مل رہے تھے اور وہ رخصت ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلے تھے۔ اور ان کا تماشا دیکھتے تھے۔ ہاتھی مست تھا۔ اور جوش مستی میں جھُوم جھُوم کر کبھی ادھر کبھی ادھر جاتا تھا۔ لوگ ڈر ڈر کر بھاگتے تھے۔ ایک دفعہ ان راجپوتوں کی طرف بھی جھُکا۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ اسی طرح کھڑے رہے۔ بادشاہ کو ان کی دلاوری بہت پسند آئی۔ راجہ بھاڑا مل کی طرف متوجّہ ہو کر یہ الفاظ کہے "ترا نہال خواہم کرد۔ عنقریب مے بینی کہ اعزاز و افتخارت زیاد بر زیاد مے شود" اسی دن سے راجپوتوں کی خصوصاً راجہ بھاڑا مل اور اس کے متعلقوں اور متوسلوں کی قدردانی کرنے لگے۔ اور ان کی بہادری اور دلاوری روز بروز دِل پر نقش ہوتی گئی۔ اکبر نے مرزا شرف الدین حسین کو میوات کا حاکم کر کے بھیجا تھا۔ اس نے ادھر ادھر پھیلنا شروع کیا تھا۔ اور آنبیر کو لینا چاہا۔ راجہ بھاڑا مل کا ایک فتنہ پرداز بھائی۔ شرکتِ ریاست کے باعث مرزا سے آن ملا اور ساتھ ہو کر لشکر لے گیا۔ چونکہ گھر کی پھوٹ تھی۔ اس واسطے مرزا غالب آیا۔ اور راجہ کے چند بھائی بند گرو لے کر پھرا ؛

۹۶۸ھ میں بادشاہ زیارتِ اجمیر کو چلے۔ رستے میں ایک امیر نے عرض کی کہ راجہ بھاڑا مل جو دہلی میں حاضرِ دربار ہوُا تھا۔ اس پر مرزا نے بڑی زیادتی کی ہے۔ بیچارا پہاڑوں میں گھس کر گذارہ کر رہا ہے۔ وہ عالی ہمت با مروّت خاندانی راجہ ہے۔ اگر حضور کی توجّہ شاملِ حال ہوگی تو خدمات عظیم بجا لائے گا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تم خود جا کر لے آؤ۔ چنانچہ وہ لینے گیا۔ راجہ خود نہ آیا۔ عرضی کے ساتھ نذرانہ بھیجا۔ اور اس کا بھائی امیر مذکور کے ساتھ آیا۔ اکبر نے کہا کہ یہ صحیح نہیں ہے وہ خود آئے۔ راجہ بھاڑا مل نے بڑے بیٹے بھگوانداس کو اہل وعیال

کے پاس چھوڑا۔ اور سانگانیر کے مقام پر خود حاضر ہوا۔ بادشاہ نے بڑی محبّت اور دلداری سے اس کی تشفّی کی۔ اور دربار کے امرائے خاص میں داخل کیا۔ راجہ کے دل میں بھی ایسا محبّت اور وفا کا جوش پیدا ہوا کہ رفتہ رفتہ اپنے یگانوں میں اور اُس میں کچھ فرق نہ رہا۔ چند روز کے بعد راجہ بھگوانداس اور مان سنگھ بھی آگئے۔ اکبر نے ان دونوں کو ساتھ لیا۔ راجہ بھاڑا مل کو رخصت کیا۔ مگر دل مل گئے تھے۔ چلتے ہوئے کہ دیا کہ جلد چلے آنا۔ اور سامان کرکے آنا کہ پھر جانے کی تکلیف نہ کرنی پڑے ؎

باوجودیکہ رانا کے ساتھ ان کا خاندانی تعلّق تھا۔ مگر جب ۹۷۴ھ میں چتوڑ پر مہم ہوئی۔ تو راجہ بھگوانداس اکبر کے ساتھ تھے۔ اور ہر مورچے پر سپر کی طرح کبھی آگے تھے کبھی پیچھے ؎

۹۷۹ھ میں جب اکبر گجرات پر خود فوج لے کر گیا تو راجہ مان سنگھ بھی باپ کی رفاقت میں ہمراہ تھا۔ نوجوانی کا عالم۔ دل میں اُمنگ۔ دلاوری کا جوش۔ راجپوتی خون کہتا ہوگا کہ چنگیزی ترک جن کے دل فتحیابی نے بڑھائے ہیں۔ اس وقت باگ سے باگ ملائے ہیں۔ ان سے قدم بڑھا رہے۔ اور انہیں بھی دکھلا دو کہ راجپوتی تلوار کا کاٹ کیا رنگ دکھاتا ہے۔ کیا راہ میں۔ کیا میدانِ جنگ میں جدھر ذرا اکبر کا اشارہ پاتا تھا۔ فوج کا دستہ لیتا تھا اور اس طرح جا پڑتا تھا۔ جیسے شیر و پلنگ شکار پر جاتے ہیں ؎

اس عرصے میں خان اعظم احمد آباد میں گھر گئے اور چغتائی شہزادے افواجِ دکن کو ساتھ لے کر اس کے گرد چھا گئے۔ اکبر نے آگرے سے کوچ کیا۔ اور مہینے کی راہ سات دن میں طے کرکے احمد آباد جا پہنچا۔ راجہ بھگوانداس اور کنور مان سنگھ اس مہم میں ساتھ تھے۔ اور بادشاہ کے گرد اس طرح سے جان نثاری کرتے پھرتے تھے۔ جیسے شمع کے گرد پروانے ؎

چند روز بعد رانا پر فوج کشی ہوئی۔ سلیم (جہانگیر) کے نام سپہ سالاری ہوئی۔ مان سنگھ اور مہابت خان ساتھ ہوئے کہ شہزادہ ان کی صلاح پر چلے بادشاہی لشکر رانا کے ملک میں داخل ہوا اور چھوٹے موٹے مقابلوں کو ٹھوکریں مارتا آگے بڑھا۔ رانا ایک ایسے کڈھب مقام میں لشکر لے کر اڑا۔ جسے پہاڑوں کے سلسلوں اور گھاٹیوں کے پیچوں نے خوب مضبوط کیا تھا۔ ہلدی گھاٹ کا میدان پہاڑ کی گردن پر واقع ہے۔ اس لئے بے ڈھب مقام ہے۔ پہاڑ کے

اوپر اور نیچے راجپوتوں کی فوجیں جمی ہوئی تھیں۔ٹیلوں کے اُوپر اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھیل جو اصلی کیڑے ان پتھروں کے ہیں۔ تیر کمان لئے تاک میں بیٹھے تھے کہ جب موقع آئے۔ بھاری بھاری پتھّر حریف پر لڑکائیں ؂

غرض کہ یہاں ایک گھمسان کا کشت وخون ہوا۔کئی راجہ اور ٹھاکر جانوں سے ہاتھ اُٹھا کر آن گرے۔ اور اپنے بہادر رانا کے قدموں پر خون کے نالے بہائے۔گرم میدان میں رانا قرمزی جھنڈا لئے تیّار تھا کہ کسی طرح راجہ مان سنگھ نظر آئے۔اور اس سے دو دو ہاتھ ہوں۔ یہ ارمان تو نہ نکلا۔ لیکن جہاں سلیم (جہانگیر) ہاتھی پر کھڑا لشکر کو لڑا رہا تھا۔ وہاں جا پہنچا۔اور ایسا بے جگر ہو کر گیا کہ سلیم اس کے برچھے کا شکار ہو جاتا اگر ہودے کے فولادی تختے اس کی جان کی سپر نہ بن جاتے۔ پرتاپ جس گھوڑے پر سوار تھا۔اس کا نام چتک تھا۔ وفادار گھوڑے نے آقا کی بڑی رفاقت کی۔اس لڑائی کے مرقعے جو تاریخ میواڑ میں شامل ہیں۔ان میں گھوڑے کا ایک پاؤں سلیم کے ہاتھی پر رکھا ہوا ہے۔اور سوار اپنے حریف پر نیزہ مارتا ہے۔ فیلبان کے پاس بچاؤ کا سامان کچھ نہ تھا۔ وہ مارا گیا۔مست ہاتھی بے مہاوت رُک نہ سکا اور ایسا بھاگا کہ سلیم کی جان بچ گئی۔ یہاں بڑا بھاری رن پڑا مغل نمک حلال اپنے شہزادے کے بچانے میں اور میواڑ کے سورما اپنے سیناپتی کی مدد میں ایسے جان توڑ کر لڑے کہ ہلدی گھاٹ کے پتھر شنگرف ہو گئے۔ پرتاپ نے سات زخم کھائے۔ دشمن اس پر باز اور جرّوں کی طرح گرتے تھے۔مگر وہ راج کے چتر کو نہ چھوڑتا تھا۔تین دفعہ دشمنوں کے انبوہ میں سے نکلا۔اور قریب تھا کہ دب مرے۔ایک جھالا سردار دوڑا اور اس بلا سے رانا کو نکال کر لے گیا۔راج کا چتر ایک ہاتھ میں اور جھنڈا دوسرے میں لے کر ایک طرف بھاگا۔اگرچہ خود مع اپنے جاں نثاروں کے مارا گیا۔مگر رانا نکل آیا۔جب سے اُس کی اولاد میواڑ کے بادشاہی نشان اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور درباروں میں رانا کی داہنی طرف جگہ پاتی ہے۔راجہ خطاب ہوا ہے اور ان کا نقارہ دروازۂ قلعہ تک بجتا ہے۔یہ رتبہ دوسروں کو حاصل نہیں۔ یہ بہادری ایسے دشمنوں کے سامنے کیا پیش جاتی۔جن کے ساتھ بے شمار توپیں اور رہکلے آگ برساتے تھے۔اور اونٹوں کے رسالے آندھی کی طرح دوڑتے تھے۔فوج پر شکست پڑی۔ بائیس ہزار راجپوت میں سے فقط آٹھ ہزار جیتے بچے۔اگرچہ رانا کو شکست ملی۔مگر اس وقت بچ کر نکل جانا ہی بڑی فتح تھی۔

رانا پرتاپ اپنے چٹک گھوڑے پر سوار بھاگا۔اور دو مغلوں نے اس پر گھوڑے ڈالے۔وہ اس کے پیچھے گھوڑے لگائے آتے تھے۔کہ رستے میں ایک ندی آئی (پہاڑ) میں سے نکلی تھی، اگر چٹک ذرا جھجکتا تو پھنس ہی گیا تھا۔ وہ بھی گھائل ہو رہا تھا۔ مگر وہ ہرن کی طرح چاروں پتلیاں جھاڑ کر پانی پر اُڑ گیا۔شام ہو گئی تھی۔ ان کے نعل پتھروں سے ٹکرا کر پتنگے اُڑاتے تھے۔اس نے سمجھا کہ دشمن آن پہنچے۔ اتنے میں کسی نے اُس کی بولی میں پیچھے سے پکارا۔ او نیلے گھوڑے کے سوار!" پرتاپ نے پھر کر دیکھا تو سکٹ اس کا بھائی ہے۔یہ کسی گھر کے معاملہ میں بھائی سے خفا ہو کر نکل گیا تھا۔اکبر کی نوکری کر لی تھی۔اور اس لڑائی میں موجود تھا۔ جب دیکھا کہ میرا بھائی میری قوم کا نام روشن کرنے والا میرے باپ دادا کا نام روشن کرنے والا اس حالت کے ساتھ جان لے کر بھاگا ہے۔اور دو مغل اس کے پیچھے پڑے ہیں تو سب غصّہ جاتا رہا۔خون نے جوش مارا اور اس کے پیچھے ہو لیا۔موقع پا کر دونوں مغلوں کو فنا کیا۔اور بھائی سے جا ملا۔کس مدت کے بچھڑے بھائی کس طرح ملے۔گھوڑے سے اُتر کر خوب گلے ملے۔یہاں چٹک بیٹھ گیا۔سکٹ نے اُسے گھوڑا دیا۔ اس کا نام انگارد تھا۔ جب رانا نے اس کا اسباب اُتار کر دوسرے گھوڑے پر رکھا تو افسوس کہ چٹک کا دم نکل گیا۔یہاں اس کی یادگار میں ایک عمارت بنوائی ہے۔اودے پور کی آبادی میں آدھے گھر ہونگے۔جن کی دیواروں پر یہ تصویریں کھینچی ہیں۔سکٹ نے رانا بھائی سے چلتے ہوئے ہنس کر کہا۔بھائی جی جب کوئی جان بچا کر بھاگتا ہے تو دل کا کیا حال ہوتا ہے؟ پھر اس کی خاطر جمع کی کہ جب موقع پاؤں گا۔ پھر آؤں گا ؛

سکٹ وہاں سے ایک مغل کے گھوڑے پر چڑھا اور سلیم کے لشکر میں آیا۔ لوگوں نے کہا کہ پرتاپ نے اپنے دونوں پیچھا کرنے والوں کو مارا۔ ان کی حمایت میں میرا گھوڑا بھی مارا گیا۔ناچار میں ان میں سے ایک کے گھوڑے پر آیا ہوں۔ لشکر میں کسی کو یقین نہ آیا۔ آخر سلیم نے بلا کر عہد کیا کہ سچ کہ دوگے تو میں معاف کر دوں گا۔ سیدھے سپاہی نے اصل حال کہہ دیا۔سلیم اپنے عہد پر قائم رہا۔مگر کہا کہ اب تم اپنے بھائی کے پاس جا کر نذر دو اور وہیں رہو۔ چنانچہ وہ اپنے ملک میں چلا گیا ؛

رانا کیکا ملک میواڑ میں راج کرتا تھا۔اور ہندوستان کے مشہور راجاؤں

میں سے تھا۔ جب اکبر نے چتوڑ مار لیا تو رانا نے کوہستان ہندوارہ میں قلعہ کوکنڈہ تعمیر کیا۔ اس میں بیٹھا ملک کنبھل میر پر حکومت کرتا تھا۔ مقام مذکور ارولی پہاڑوں میں جانب شمال اودے پور سے ۴۰ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

ہندوستان کے اکثر راجہ اکبر کی اطاعت یا سلامت روی کے سلسلے میں آ گئے تھے۔ مگر رانا اپنی اکڑ تکڑ پر قائم تھا۔ چنانچہ ۹۸۳ھ میں اکبر مع لشکر اجمیر گیا۔ جب درگاہ ایک منزل رہی تو پیادہ ہوا۔ زیارت کر کے نذر نیاز چڑھائی۔ ایک دن درگاہ میں مان سنگھ کو بھی ساتھ لے گیا۔ دیر تک دعائیں اور التجائیں کیں۔ وہیں بیٹھے اور امرا بھی حاضر تھے۔ صلاح مشورے ہو کر فوج کشی قرار پائی۔ مان سنگھ کو خطاب فرزندی کے ساتھ سپہ سالاری عنایت ہوئی۔ پانچ ہزار سوار رقمی کہ کچھ خاصے کے اور کچھ ماتحت امرا کے تھے مدد کو دیے۔ کئی امیر جنگی تجربہ کار مع ان کے فوجہائے جرّار کے ساتھ روانہ کئے۔ اور ریاست رانا کی طرف متوجّہ کیا۔ دریائے لشکر طوفان کی طرح حدود اودے پور میں داخل ہوا۔ کنور نے مانڈل گڑھ پر ٹھیر کر لشکر کا انتظام کیا۔ اور بلدیو کی گھاٹی سے نکل کر کوکنڈہ پر جا پہنچا کہ وہیں رانا رہتا تھا۔

رانا تقریباً تین ہزار سوار کے ساتھ بادل کی طرح پہاڑ سے اُٹھا۔ دو فوج ہو کر آیا۔ ایک فوج نے ہراول شاہی سے ٹکّر کھائی۔ پہاڑی زمین تھی۔ گڑھے۔ جھاڑی۔ پہاڑیوں کے ایچ پیچ بہت تھے۔ ہراول اور کمک ہراول غٹ پٹ ہو گئے۔ بھگوڑی لڑائی لڑنی پڑی۔ بادشاہی لشکر کے راجپوت بائیں طرف سے اس طرح بھاگے جیسے بکریاں۔ ہراول کو لانگ پھانگ کر دائیں طرف کی فوج میں گھس آئے۔ ہاں سادات بارہ اور بعضے غیرت والے بہادروں نے وہ کام کئے کہ شاید ہی رستم سے ہوں۔ طرفین سے بہت آدمی کام آئے۔ جس فوج میں رانا تھا۔ اس نے گھاٹی سے نکلتے ہی قاضی خاں بدخشی کو لیا کہ دہانہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں اٹھا کر الٹتے پلٹتے قلب میں پھینک دیا۔ سیکری وال شیخ نادے تو اکٹھے ہی بھاگے۔ شیخ ابراہیم اس کے سردار تھے۔ بھاگنے میں ایک تیر اُن کی ران پر بیٹھا۔ مدّت تک دُکھ بھرا۔ قاضی خاں باوجود ملّائی کے بہادری سے لڑے ہاتھ پر ایک تلوار کھائی کہ انگوٹھا کٹ گیا۔ مگر ٹھیرنے کی جگہ نہ تھی۔ قاضی صاحب جوازِ فرار کی حدیثیں تلاوت کرتے ہوئے ہٹ کر قلب میں آ گئے۔

جو پہلے حملے میں بھاگے تھے۔ انہوں نے تو پانچ چھ کوس تک دم ہی نہ لیا تھا۔ ایک دریا بیچ میں تھا۔ اس سے بھی پار ہو گئے۔ لڑائی ترازو ہو رہی تھی۔ جو ایک سردار گھوڑا اُڑاتا نقارہ بجاتا آیا کہ بندگانِ بادشاہی یلغار کر کے آن پہنچے۔ لشکر بادشاہی سے شورِ قیامت کا غل اُٹھا۔ اور اس منتر نے بڑا اثر کیا۔ بھاگتے ہوئے تھم گئے۔ بھاگے ہوئے پلٹ پڑے۔ اور غنیم کے پاؤں اُکھڑ گئے ؛

راجہ رامساہ گوالیاری رانا کے آگے آگے بھاگا آتا تھا۔ اس نے مان سنگھ کے راجپوتوں کی جان پر عجب کار پردازی کی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ وہ تھے کہ ہراول کے بائیں سے بھاگ کر آئے تھے۔ مگر ایسے بدحواس آئے کہ آصف خاں کو بھی بھگوڑا کر دیا ہوتا۔ دائیں طرف پر سادات بارہ تھے۔ اُن میں پناہ لی۔ اگر سادات بارہ ثابت قدمی سے نہ اڑتے اور ہراول کی طرح نوک دُم بھاگتے۔ تو رسوائی میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ رانا نے ہاتھیوں کو بادشاہی ہاتھیوں سے آن ٹکرایا۔ ان میں دو مست دیو نژاد ٹکرم ٹکرا ہو گئے۔ حسین خاں بادشاہی فیلبان مان سنگھ کے آگے بیٹھا تھا۔ وہ گرا۔ مان سنگھ آپ مہاوت کی جگہ جا بیٹھا۔ اور اس استقلال سے ڈٹا۔ کہ اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ الحمد للہ کہ قلب قائم رہا۔ ادھر سے جو رامساہ بھاگا تھا۔ اس نے اپنے اور تین بیٹوں کے خون سے داغِ بدنامی دھو دیا ؛

فیلبان نے غنیم کی طرف سے رام پرشاد ہاتھی کو بڑھایا۔ یہ بڑا قوی ہیکل اور جنگی ہاتھی تھا۔ بہت سے جوانوں کو پامال کر کے صفوں کو چاک در چاک کر دیا۔ کمال خاں فوجدار شاہی نے ادھر سے گجراج ہاتھی کو سامنے کیا۔ دیر تک آپس میں ریلتے دھکیلتے رہے۔ بادشاہی ہاتھی دب نکلا تھا۔ اقبال اکبری نے رام پرشاد کے مہاوت کو قضا کی گولی ماری کہ اس دھکم دھکا میں زمین پر آ پڑا۔ بادشاہی فیلبان واہ رے تیری پھرتی! کود کر رانا کے ہاتھی پر جا بیٹھا۔ اور وہ کام کیا کہ کسی سے نہ ہو سکے۔ اتنے میں یکہ سوار جو مان سنگھ کی اردلی میں تھے رانا کی فوج پر ٹوٹ پڑے اور اس گھمسان کا رن پڑا کہ مان سنگھ کی سپہ سالاری اس دن معلوم ہو گئی ؛

رانا کے ساتھ مان سنگھ کا مقابلہ ہوا اور اوپر تلے کئی وار ہوئے۔ آخر رانا نہ ٹھیر سکا۔ مان سنگھ کے ہاتھ سے زخم کھایا سب کو وہیں چھوڑا اور بھاگا۔

اس کی فوج میں بھی کھلبلی پڑ گئی اور اس کے سردار بھاگ کر اس کی طرف ہٹنے لگے۔ آخر سب پہاڑوں میں گھس گئے۔ گرمی کا موسم آگ برسا رہا تھا۔ لُو چل رہی تھی۔ زمین آسمان تنور کی طرح بھڑک رہے تھے۔ بھیجے سر میں پانی ہو گئے صبح سے دوپہر تک لڑتے رہے۔ پان سو آدمی کا کھیت پڑا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ رانا بھاگنے والا نہیں۔ یہیں کسی پہاڑی کے پیچھے چھپ رہا ہے۔ پھر پلٹے گا۔ اس لیے تعاقب نہ کیا۔ خیموں میں پھر آئے۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہوئے ؁

دوسرے دن وہاں سے کوچ کیا۔ میدان میں ہوتے ہوئے ہر شخص کی کارگذاری کو دیکھتے ہوئے درے سے گذر کر گوکنڈہ میں آئے۔ مان سنگھ نے سرداروں کو جمع کر کے مقتولوں کی فہرستیں مرتب کیں۔ اور جن کے گھوڑے مارے گئے تھے۔ ان کی تفصیل طلب ہوئی۔ سیّد محمود خاں بارہ نے کہا کہ ہمارا تو نہ کوئی آدمی ضائع ہؤا نہ گھوڑا مرا۔ خالی اسم نویسی سے کیا حاصل؛

یہ کوہستان بہت کم زراعت ہے غلّہ نھڑ گیا۔ اور رسد پہنچتی نہ تھی۔ لشکر میں کہرام مچا ہؤا تھا۔ پھر کمیٹی ہوئی۔ ایسے موقعوں پر ایسا ہی ہوتا ہے ایک ایک امیر کو ایک ایک سردار فرض کر کے قرار پایا کہ باری باری سے غلّے کی تلاش میں نکلا کریں۔ پہاڑوں پر چڑھ جاتے تھے۔ جہاں جہاں ذخیرے یا آبادی کی خبر پاتے۔ وہاں جاتے۔ اناج سمیٹتے تھے۔ اور آدمیوں کو باندھ لاتے تھے۔ جانوروں کے گوشت سے گذارہ کرتے تھے۔ آم ایسی بہتات سے تھے کہ حد بیان سے باہر ہے ؁

بادشاہ کے بھی دل کو لگی ہوئی تھی۔ ایک سردار کو ڈاک بٹھا کر بھیجا کہ لڑائی کا حال دیکھ کر آئے۔ یہاں فتح ہو گئی تھی۔ وہ آیا حال احوال معلوم کر کے دوسرے دن رخصت ہؤا۔ خدمتیں سب قبول ہوئیں۔ باوجود اس کے چغل خوروں نے کہ دیا کہ فتح کے بعد کوتاہی ہوئی۔ ورنہ رانا گرفتار ہو جاتا۔ بادشاہ کو بھی خیال ہؤا۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہو گیا کہ شیطان طوفان ہے ؁

سنہ ۹۸۹ھ میں اس نے وہ دلاوری دکھائی۔ کہ ہندی لوہے نے ولایتی کے جوہر مٹا دیئے۔ ملک بنگال میں اکبری امرا نے بغاوت کی۔ یہ نمک حرام تمام نئے پرانے ترک اور بعض کابلی، افغان تھے۔ انہوں نے سمجھا کہ بادشاہ کی مخالفت کے لیئے جب تک کوئی بادشاہی ہڈی ہمارے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ہم باغی ہی

کہلائیں گے۔ اس لئے مرزا حکیم کو عرضیاں لکھیں۔ اور اس کے امرا کو خطوط اور زبانی پیغام بھیجے۔ خلاصہ یہ کہ آپ بھی ہمایوں بادشاہ کے لختِ جگر ہیں اور برابر کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ہمتِ شاہانہ کو حرکت دے کر ادھر سے آئیں تو غلامانِ قدیم ادھر سے جاں نثاری کے واسطے حاضر ہیں۔ اس کے پاس بھی ہمایوں کے خدمت گذار بلکہ بابری عہد کی کھُرچن باقی تھی۔ موقع کو غنیمت سمجھا اور پنجاب کا رُخ کیا۔ ایک سردار کو فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ پشاور سے یُوسف خاں نے اُس کے مقابلے کے لئے ایک منصبدار کو نامزد کیا۔ وہ ایسا آیا کہ فوج بھی ساتھ نہ لایا۔ اس حالت میں غنیم کو کیا روک سکے۔ مگر اکبری اقبال کا طلسم دیکھو کہ یہ ایک دن ادھر سے شکار کو نکلا۔ غنیم ادھر کے جنگل میدان دیکھتا تھا۔ رستے میں ٹکر ہوئی اور تلوار چلی۔ غنیم زخمی ہو کر بھاگ نکلا۔ اور پشاور آ کر مرگیا۔ اکبر نے یوسف خاں کو بُلا لیا۔ اور مان سنگھ کو سپہ سالار مقرر کرکے روانہ کیا۔

غرض مان سنگھ نے سیالکوٹ اپنی جاگیر میں آ کر مقام کیا اور فوج کا سامان درست کرنے لگا۔ ایک پھرتیلا سردار فوج دے کر آگے بھیجا کہ قلعۂ اٹک کا بندوبست رکھے۔ راجہ بھگوان داس نے لاہور کو مضبوط کیا۔ اُدھر مرزا حکیم نے جب سُنا کہ سردار مُردار ہوُا تو شادمان اپنے کوکہ کو عمدہ سپاہ کے ساتھ روانہ کیا۔ اس کی ماں نے مرزا کو جھولا ہلا ہلا کر پالا تھا۔ وہ مرزا کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوُا تھا۔ اور حقیقت میں دلاور جوان تھا۔ افغانستان میں اس کی تلوار نے جوہر دکھائے تھے۔ اور سرداری کا نام روشن کیا تھا۔ آیا اور جھٹ قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ مان سنگھ بھی پنڈی میں پہنچ گئے تھے۔ جو یہ خبر پہنچی۔ راجپوتی خون سینے میں اُبل پڑا۔ اور جب تک اٹک سامنے نظر نہ آیا۔ کہیں نہ اٹکا۔ شادمان خوابِ غفلت میں تھا۔ نقارے کی آواز سُن کر جاگا۔ اور محاصرہ اُٹھا کر بڑے حوصلے کے ساتھ سامنے ہوُا۔ کنور مان اور شادمان نے جگرداری اور سرداری کے ارمان نکال دئے۔ سورج سنگھ مان سنگھ کے بھائی نے ایسے حملہ ہائے مردانہ کئے کہ اُسی کے ہاتھ شادماں خاں زخم کھا کر خاکِ ہلاک پر گرا ؛

جب مرزا نے سنا کہ شادمان دنیا سے ناشاد گیا۔ تو سخت غمناک ہوُا۔ اور خود لشکر لے کر چلا۔ وہ بڑھتا بڑھتا لاہور تک آیا۔ راوی کے کنارے

باغ مہدی قاسم خاں میں آن اُترا۔ راجہ بھگوانداس اور کنور مان سنگھ۔ سیّد حامد بارہ اور چند امرائے دربار کے ساتھ شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ اکبر کے پیام پہنچ رہے تھے کہ خبردار حملہ نہ کرنا۔ مطلب یہ تھا کہ میں بھی لشکر لے کر جا پہنچوں۔ امرا چاروں طرف پھیل جائیں۔ اور اسے گھیر کر پکڑ لیں۔ کہ آیندہ کا قصّہ ہی پاک ہو جائے۔ شیر شہر میں بند تڑپتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ کہ حکم کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی شہر اور اطراف شہر کا انتظام استحکام کے ساتھ کر لیا تھا۔ اپنے اپنے مورچوں کو سنبھالے بیٹھے تھے اور مرزا کے حملوں کا جواب دندان شکن دیتے تھے۔ خبر لگی کہ لاہور کے مُلّا نے بلانا چاہتے ہیں۔ اور قاضی اور مفتی کاغذ کے چوہے دوڑا رہے ہیں۔ چنانچہ ان کا بڑی روک تھام سے بندوبست کیا۔ اکبر نے یہ خبر دلی میں سُنی۔ ہمّت کے گھوڑے پر سوار ہوُا اور باگ اُٹھائی۔

مرزا حکیم کو خیال تھا کہ بادشاہ بنگالے کی مہم میں مصروف ہے۔ ملک خالی پڑا ہے۔ باغ مذکور میں ۲۰ دن خوشی کی بہاریں منائیں۔ جب سُنا کہ اُدھر نمک حراموں کے کام بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور اکبر سرہند میں آن پہنچا۔ تو محاصرہ چھوڑا اور باغ مہدی قاسم خاں سے ایک کوس اوپر چڑھ کر پار ہوُا۔ اور جلال پور علاقۂ گجرات سے دریائے چناب اُترا۔ بھیرے کے قریب جہلم اُترا اور مقام مذکور کو لوٹا۔ وہاں سے بھی بھاگا۔ مقام گھیپ کے پاس دریائے سندھ اُتر کر کابل کو بھاگا۔ گھاٹیوں پر گھبراہٹ میں بہت سے آدمی بہ گئے۔ ساتھ ہی سرہند کے مقام سے اکبر کا حکم پہنچا کہ تعاقب نہ کرنا۔ دربار میں مصاحبوں سے بار بار کہتا تھا۔ بھائی کہاں پیدا ہوتا ہے گھبرا کر بھاگا ہے۔ اٹک دریا اُترنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ راستے میں کوئی صدمہ پہنچے۔

کنور مان سنگھ بموجب حکم کے معمولی راہ سے پشاور پر جا پڑے۔ اکبر نے لشکر شاہانہ ترتیب دے کر شاہزادہ مراد کو روانہ کیا کہ کابل تک پہنچے۔ اور مرزا کا پورا پورا بندوبست کر دے۔ بادشاہی امیر اور کہنہ عمل سپہ دار ساتھ گئے۔ مگر ان میں وہی چلتی تلوار فوج ہراول کا افسر قرار پایا۔ یہ لشکر چلا اور خود بادشاہ اقبال کا لشکر لے ان کی پشت و پناہ ہوُا۔

مان سنگھ جو شہزادے کو لئے آگے بڑھا تھا۔ اسے اور آگے بڑھا دیا۔ اور خود لشکر کو لے کر روانہ ہوئے برسات نے اٹک کا پُل باندھنے نہ دیا خود بادشاہ اور تمام لشکر کشتیوں پر اُتر گئے۔ بھاری سامان اٹک کے کنارے چھوڑے اور آپ جریدہ فوج لے کر چلے +

پشاور میں بوجھ بھار کے اسباب ڈال دئے۔ سلیم کو راجہ بھگوانداس کی حفاظت میں لشکر کے ساتھ چھوڑا۔ تجمل شاہانہ سے ہاتھ اٹھایا اور ہلکے ہوکر یلغار کے گھوڑوں کی باگیں لیں۔ بے ہمّت کچھ رہ گئے۔ کچھ رستے سے پھر گئے +

اب مرزا حکیم کی کہانی سنو۔ فتنہ انگیز اسے یہی کہے جاتے تھے کہ اکبر ادھر نہیں آئیگا۔ اور آئے گا تو اس قدر پیچھا نہ کرے گا۔ جب اس نے دیکھا کہ بے پُل اٹک سے پار ہوئے اور دریائے لشکر کے چڑھاؤ موج در موج چلے آتے ہیں۔ تو شہر کی کنجیاں بزرگانِ شہر کو دے دیں۔ عیال و اطفال کو بدخشاں روانہ کر دیا۔ آپ دولت و مال کے صندوق اور اسباب ضروری لے کر باہر نکل گیا۔ ایک ارادہ یہ تھا کہ فقیر ہو کر ترکستان کو چلا جائے۔ مصاحب صلاح دیتے تھے کہ بنگش کے رستے سے جا کر ہندوستان میں فساد برپا کرے یا افغانستان کے پہاڑوں میں سر پھوڑتا پھرے۔ اور جیسا ادھر کا معمول ہے لوٹ مار کرتا رہے +

اس شش و پنج میں تھا۔ جو خبریں پہنچیں کہ بادشاہ کے امرائے لشکر میں کوئی ادھر آنے کو راضی نہیں۔ فتنہ گروں کو دیا سلائی ہاتھ آئی۔ انہوں نے پھر آگ سلگائی۔ صورتِ حال بیان کی اور کہا کہ لشکر شاہی میں ہر قوم کے لوگ ہیں۔ ایرانی۔ تورانی۔ خراسانی۔ افغانی۔ کوئی آپ پر تلوار نہ کھینچے گا۔ جب مقابلہ ہوگا۔ سب آن ملیں گے۔ ہندو اور ہند کی تلوار شمشیر ولائتی کے آگے چل نہیں سکتی۔ اور ان کے دل یہاں کی سردی اور برف کے نام سے تھرّاتے ہیں۔ صلاح یہی ہے کہ ہمّت مردانہ کرکے ایک معرکہ کریں۔ اگر میدان ہاتھ آگیا۔ تو سبحان اللہ! کچھ نہ ہُوا تو جو رستے میں موجود ہیں۔ انہیں کوئی بند نہیں کرسکتا۔

کچھ ان لوگوں نے اکسایا۔ کچھ بابری خون میں دھواں اٹھا۔ نوجوان لڑکے کی رائے بدل گئی۔ اور کہا کہ بے مرے مارے ملک نہ دونگا۔ سرداروں کو روانہ کیا کہ حشری لشکر سمیٹتے چلے جاؤ اور جہاں موقع ملے۔ لشکر بادشاہی

پر ہاتھ مارتے جاؤ۔ افغانستان کے ملک میں اس طرح سے جمعیت بہم پہنچانا اور پہاڑوں کے پیچھے سے شکار مارتے جانا کچھ بڑی بات نہیں۔ وہ آگے رہے۔ پیچھے سے مرزا نے بھی ہمّت کے نشان پر پھریرا چڑھایا۔ بادشاہی لشکر کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے جہاں موقع پایا۔ پہاڑیوں کے پیچھے سے نکل نکل کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ مگر رہزنوں کی طرح۔ البتہ فرید خاں نے مان سنگھ کے لشکر کا پیچھا مارا۔ خزانہ بادشاہی کو لوٹ لے گیا۔ اور سرداروں کو پکڑ لیا۔ ڈاک چوکی کا افسر دورے کے طور پر بادشاہ کے لشکر سے مان سنگھ کے لشکر تک آتا جاتا تھا وہ اُس وقت پہنچا تھا کہ ہیر لٹ رہی تھی۔ اُنہی قدموں بھاگا۔ اور بادشاہ کو خبر پہنچائی۔ غرض دلاور بادشاہ امرائے رکابی کے ساتھ باگیں اُٹھائے چلا جاتا تھا۔ ہر قدم پر ہمّت گھوڑے کو قمچی اور حوصلہ ایڑ لگاتا تھا۔ سرخاب اور جگدلک کے بیچ میں تھے۔ جو فتح کی خوشخبری پہنچی۔ وہیں گھوڑے سے اُتر کر زمین پر سر رکھ دیا۔ اور دیر تک شکر الٰہی کے مزے لیتا رہا ؛

اب میدانِ جنگ کی کیفیت سننے کے قابل ہے۔ اگرچہ خزانۂ بادشاہی کے لوٹنے سے مرزا کا غرور بڑھ گیا تھا۔ لیکن دل گھٹا جاتا تھا۔ دن کی لڑائی سے جی چراتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ شبخون مارے مان سنگھ فوج لئے تیار تھا۔ اور خدا سے چاہتا تھا کہ کسی طرح حریف میدان میں آئے اور وہ کم ہمّت بے دل سپاہ و پیادہ جمع کئے جاتا تھا۔ سازش اور آمیزش کی غرض سے امرائے لشکر کے نام خطوں کے چوہے دوڑاتا تھا کہ بادشاہ ان سے بدگمان ہو۔ سپہ سالار شاہی شہزادہ مراد کو لئے خوود کابل پر پڑا تھا۔ مرزا سامنے پہاڑ پر تھا۔ ایک شب بہت زیادہ شورش معلوم ہوئی۔ رات کو سامنے نہایت کثرت سے آگیں جلتی نظر آئیں۔ سپاہِ ہند دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شب برات کی رات تھی یا دیوالی کا ہنگامہ۔ انہوں نے اپنے بندوبست ایسے پختہ کئے کہ حریف شبخون مارے تو پچتا کر پیچھے ہٹے۔ روشنیٔ صبح نے جنگ کے پیام پہنچائے۔ مرزا ایک گھاٹی سے فوج لے کر نکلا۔ اور لڑائی کا میدان گرم ہوا۔ نوجوان سپہ سالار ایک پہاڑی پر کھڑا افسوس کر رہا تھا کہ ہائے میدان نہیں ہراول نے بڑھ کر ٹکّر ماری۔ بڑا کشت و خون ہوا۔ مرزا بھی خوب جان توڑ کر لڑا۔ وہ بھی سمجھا ہوا تھا کہ اگر ہندوستانی دال خوروں کے سامنے سے بھاگا تو کالا منہ لے کر کہاں جاؤنگا۔ ادھر مان سنگھ کو بھی راجپوت کے نام

کی لاج تھی۔ خوب بڑھ بڑھ کر تلواریں ماریں اور ایسے جوش دکھائے کہ مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس معرکے میں ہراول کی ہمت نے ایسا کام کیا کہ اور لشکر کو حوصلہ نکالنے کا ارمان رہ گیا ۔

دوسرے دن صبح کا وقت تھا کہ فریدوں خاں مرزا کا ماموں پھر فوج لے کر نمودار ہؤا۔ مان سنگھ ہی کی فوج ٹھہرے پر تھی۔ تلواریں میان سے نکلیں۔ اور تیر کمانوں سے چلے بندوقوں نے آگ اگلی۔ اور توپیں دل میں ارمان لئے کھڑی تھیں کہ پہاڑی سرزمین تھی۔ غرض جا بجا لڑائی پڑ گئی۔ کابلی بہادر شیر تھے۔ مگر یہ بھی منہ کا نوالہ تو نہ تھے کہ نگل جاتے۔ ریل پیل ہو رہی تھی۔ کہیں یہ چڑھ جاتے تھے۔ کہیں وہ بڑھ آتے تھے۔ مان سنگھ ایک پہاڑی پر کھڑا دیکھ رہا تھا جدھر بڑھنے کا موقع دیکھتا تھا۔ ادھر فوج کو آگے بڑھاتا تھا۔ جدھر جگہ نہیں پاتا تھا ہٹاتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ زمین کی ناہمواری انتظام جمنے نہ دیتی تھی۔ دفعتہً غنیم زور دے کر آیا۔ ہراول کی فوج سینہ سپر کر کے سامنے ہوئی۔ مگر لڑائی دست و گریبان تھی۔ بعض نے جان دے کر نیکنامی حاصل کی۔ بعض نے ہٹنا مصلحت سمجھا۔ سپہ سالار تاڑ گیا کہ میری سپہ کا رنگ بدلا۔ تڑپ اٹھا۔ بھائی کو پہلو سے جدا کیا۔ سورما سردار تلوار لئے راجپوت آس پاس جمے ہوئے تھے۔ انہیں بھی حکم دیا اور موقع دیکھ کر فوج فوج کمک بھیجنی شروع کر دی۔ گجنالیں بھری تیار تھیں۔ ہاتھیوں کو ریلا اور توپوں کو مہتاب دکھائی کہ جنگل گونج اٹھا۔ اور پہاڑ دھواں دھار ہو گئے۔ بادشاہی ہاتھی حلقۂ خاصہ کے تھے۔ شیروں کے شکار پر لگے ہوئے تھے بادلوں کی طرح پہاڑیوں پر اڑنے لگے۔ یہ آفت دیکھ کر افغانوں کے بڑھے ہوئے دل پیچھے ہٹے۔ تھوڑی دیر میں قدم اکھڑ گئے۔ نشانچی نے نشان پھینکا۔ اور سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مرزا نے چاہا تھا کہ اگر فوج نے جان کی ہے تو میں اپنی جان کو ننگ و نام پر قربان کر دوں۔ مگر چند جاں نثاروں نے آ کر گھیر لیا۔ مرزا نے جھنجھلا کر انہیں ہٹایا تو حملے پر مستعد ہؤا۔ محمد علی باگ پکڑ کر گھوڑے سے لپٹ گیا اور کہا کہ پہلے مجھے مار لو۔ پھر اختیار ہے۔ خلاصہ یہ کہ مرزا بھی بھاگ گئے ۔

سورما راجپوتوں نے بڑا ساکھا کیا۔ اور دلاوروں نے خوب خوب کارنامے دکھائے۔ بھاگتوں کے پیچھے گھوڑے اٹھائے۔ تلواریں کھینچ لیں اور دُور تک

مارتے اور للکارتے چلے گئے۔ پھر بھی جو تعاقب کا حق تھا۔ اس کا ارمان نہ نکلا۔ اور خیال یہ بھی تھا کہ ایسا نہ ہو مرزا کسی ٹیلے کے پیچھے سے چکر مار کر فوج کا پیچھا مارے۔ بعضے بہادر گھوڑے مارتے ایسے گئے کہ کئی کوس آگے بڑھ کر ایک ٹیلے پر مرزا کو جا لیا۔ اور اس نے جان کو بچا لینا فتح عظیم سمجھا۔ سپہ سالار فتح کے دمامے بجاتا کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے اور اس دن بت خاک پر ڈیرہ تھا کہ مان سنگھ سرداروں کو لئے ساتھ پہنچے۔ سرخروئی کے ساتھ فتح کی مبارکباد ادا کی۔ بادشاہ نے کابل میں پہنچ کر ملک پھر مرزا حکیم کو عنایت کیا۔ اور پشاور اور سرحدی ملک کا انتظام اور اختیارات کنور مان سنگھ کے سپرد کر آئے (اور کنار اٹک پر قلعہ تعمیر کیا) اس قابلیت کی تعریف نہ زبان سے ہو سکتی ہے نہ قلم سے کہ ایک نوجوان ہندو راجہ نے افغانوں میں بہت اچھی رسائی پیدا کی اور سرحدی افغانوں کا بھی ایسا بندوبست کیا۔ کہ سرشوری کی گردنیں ڈھیلی ہو گئیں ؛

کابل سے خبریں آ رہی تھیں کہ محمد حکیم مرزا کو بادہ خواری برباد کر رہی ہے۔ ۹۹۴ھ میں اس نے کام تمام کر دیا۔ اکبر نے کنور مان سنگھ کو زیر دیوار لگا رکھا تھا۔ حکم پہنچا کہ فوراً فوج لے کر کابل میں جا بیٹھو۔ اس نے کابل پہنچ کر وہ ملک داری کی لیاقت دکھائی جو کہ اُسے بزرگوں کی صدہا سالہ فرمانروائی سے میراث میں پہنچی تھی۔ وہ کابل میں برس دن سے زیادہ رہا اور زور شور سے حکومت کرتا رہا۔ فقط راجپوت سردار اور راجپوت فوج اس کے ماتحت نہ تھی بلکہ ہزاروں ترک۔ افغانی۔ ہندوستانی اس کے ساتھ تھے۔ برفانی پہاڑ پر کیا گرمی کیا جاڑے شیر کی طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ اور جہاں خرابی پڑتی۔ اس کی اصلاح کرتا تھا ؛

افغانستان سے شکائتیں پہنچیں کہ راجپوت اہل ملک پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ اس لئے کنور مان سنگھ کو بہار کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ بنگالے میں افغانوں کی کھرچن کمینہ سرشور باقی تھی۔ مغلوں کی بغاوت کے زمانے میں بھی نکمے نہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے فتو جاٹ کو اپنا سردار بنایا اور ملک اڑلیسہ اور دریائے دامودر کے کنارے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ کنور مان سنگھ نے وہاں جا کر بندوبست شروع کئے۔ کئی برس پہلے بعض امرائے نمک حرام نے ملک بنگالہ میں علما و مشائخ کے فتوے ہاتھ میں لے کر بادشاہ پر بے دینی کا اشتہار دیا تھا اور تلواریں

کھینچ کر جا بجا بغاوت کے نشان کھڑے کر دیے تھے۔ ان کی گردنیں جنگی خونریزیوں سے توڑی گئی تھیں۔ مگر بعض ان میں سے اب بھی زمینداروں کے سائے میں سر چھپائے بیٹھے تھے اور جب موقع پاتے تھے فساد کرتے تھے۔ ان کے رستے بند کئے۔ راجہ پورن مل کندھوریہ عظیم الشان قلعہ بنا کر سمجھے تھے کہ ہم لنکا کے کوٹ میں بیٹھے ہیں۔ انہیں تلوار کے گھاٹ پر اُتار کر سیدھا کیا۔ لوٹ مار میں خزانے اور مال خانے بہت کچھ ہاتھ آئے۔ اپنے بھائی کے لئے اس کی بیٹی لی۔ صلح کے وقت تحفہ تحائف۔ میں رخصت کے وقت جہیز میں۔ سب کچھ پایا۔ سنگرام کو لوہے کی چوٹ سے دبایا۔ انند چردہ پر چڑھ گیا۔ اس سے اطاعت کے ساتھ تحائف گراں بہا لئے۔ نفائس و عجائب کے ساتھ ۵۴ ہاتھی دربار میں بھیجے ۔

بہار کے بندوبست سے مان سنگھ کی خاطر جمع ہوئی۔ مگر اکبری سپہ سالار سے کب بیٹھا جاتا تھا۔ ۹۹۷ھ میں اڑلیسہ کی طرف گھوڑے اُٹھائے۔ ملک مذکور سرحد بنگالہ کے پار واقع ہے۔ اوّل پرتاپ دیو وہاں کا راجہ تھا۔ نرسنگھ دیو اس کے ناخلف بیٹے نے باپ کو زہر سے مارا۔ اور جلد مارا گیا۔ سلیمان کرارانی دانش و دین کا پتلا اس وقت بنگالے میں فرمانروائی کرتا تھا۔ اس نے ملک مذکور کو مفت مار لیا۔ چند روز کے بعد زمانے نے اس کا ورق بھی اُلٹا ۔

اڑلیسہ قتلو خاں وغیرہ افغانوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس وقت مان سنگھ نے نشان فتح پر پھریرا چڑھایا۔ برسات دل بادل کے لشکر میں بجلی کی بیرق چمکا رہی تھی۔ مینہ برس رہے تھے۔ دریا چڑھے تھے۔ اُدھر سے قتلو آیا۔ اور ۲۵ کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈال کر میدانِ جنگ مانگا۔ مان سنگھ نے بڑے بیٹے کو مقابلے پر بھیجا۔ وہ باپ کا رشید فرزند تھا۔ مگر ابھی نوجوانی کا مصالح تیز تھا۔ ایسا گرما گیا کہ انتظام کا سررشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور فتح نے شکست کی صورت بدلی۔ سپہ سالار نے خود آگے بڑھ کر بگڑے کام کو سنبھالا۔ سرداروں کی دلجوئی کی۔ اور پھر فوج کو سمیٹ کر سامنے کیا۔ غیبی مدد یہ ہوئی کہ قتلو خاں مر گیا۔ افغانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ بہت سردار ٹوٹ کر آن ملے۔ جو باقی رہے وہ اس اقرار پر صلح کے خواہاں ہوئے کہ اکبری خطبہ پڑھا جائیگا۔ خراج و تحائف سالانہ پیشکش کیا کرینگے۔ جب حکم ہوگا ادائے خدمت کو حاضر ہونگے۔ سپہ سالار نے بھی صلح ہی میں مصلحت دیکھی۔ ۱۵۰ ہاتھی اور گرانمایہ

لے کر ارسال دربار کئے ۔

جب تک عیسیٰ (قتلو خاں کا وکیل) زندہ رہا۔ عہد و پیمان کا سلسلہ درست رہا۔ چند سال کے بعد نئے نوجوان افغانوں کی ہمّت نے زور کیا۔ انہوں نے اوّل جگن ناتھ کا علاقہ مارا۔ پھر بادشاہی ملک پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ مان سنگھ خدا سے چاہتا تھا کہ عہد شکنی کے لئے کوئی بہانہ ہاتھ آئے۔ فوراً فوج جرّار لے کر چلا۔ آپ دریا کے رستے بڑھا۔ سرداروں کو جھار کھنڈ کی راہ سے بڑھایا۔ انہوں نے دشمن کے علاقے میں ہو کر فتح و فیروزی کے نشان لہرا دیئے۔ افغان ہرچند صلح کی جھنڈیاں ہلاتے رہے۔ مگر اب یہ کب سنتا تھا۔ لڑائی کا میدان مانگا۔ ناچار انہوں نے بھی ہاتھ پاؤں سنبھالے۔ بڈھے اور جوان بڑے بڑے پٹھان جمع ہوئے۔ ہمسائے کے راجاؤں نے بھی رفاقت کی۔ اور شاہانہ لڑائی آن پڑی بہادروں نے ہمّت کے کارنامے دکھائے۔ بڑے بڑے رن پڑے۔ ملک مذکور قدرت کا فیل خانہ ہے۔ ہاتھی میدانِ جنگ میں مینڈھوں کی طرح لڑتے اور دوڑتے پھرتے تھے۔ اور اکبری بہادر انہیں تیر دوز کرکے خاک تودہ بناتے تھے۔ آخر سورما سپہ سالار نے فتح پائی۔ اور ملک کو بڑھاتے بڑھاتے دریائے شور تک پہنچا دیا۔ شہر شہر میں اکبری خطبہ پڑھا گیا۔ جگن ناتھ جی نے بھی اکبر بادشاہ پر دیا کی کہ اپنا مندر ملک سمیت دے دیا۔ مان سنگھ بھاٹی وغیرہ (مشرقی حصہ سندر بن) میں پھیلتا جاتا تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ ادھر ایک شہر حاکم نشین آباد کیا جائے۔ جہاں سے ہر وقت مدد پہنچ سکے۔ دریائی حملے سے محفوظ ہو۔ اور غنیمانِ بدنیّت کی چھاتی پر پتھر رہے۔ صلاحوں اور تلاشوں کے بعد آک محل کے مقام پر صلاح ٹھیری۔ مبارک ساعت دیکھ کر بنیاد کا پتھر رکھا اور اکبر نگر سے نام رہا (یہی راج محل مشہور ہے) اس گل زمین کو شیر شاہ نے اپنی گلگشت اور تفریح کے لئے نامور کیا تھا۔ اب تک بھی کوئی مسافر ادھر جا نکلتا ہے تو بکاولی اور بدرمنیر کی خیالی داستانیں مٹی تصویروں کی طرح صفحۂ خاک پر نظر آتی ہیں ۔

سنہ ۱۰۰۲ھ کے جشن سالانہ میں اکبر نے خسرو جہانگیر کے بیٹے کو باوجود خردسالی کے پنج ہزاری منصب پر نامزد کر کے اڑیسہ اس کی جاگیر میں دیا۔ اور بعض سردارانِ راجپوت کے حقوق اس میں شامل گئے۔ راجہ مان سنگھ کو اتالیقی کا اعزاز بخشا۔ اور اس کی سرکار کا انتظام بھی راجہ ہی کے سپرد کیا۔ راجہ کو ملک

بنگالہ دے کر ادھر روانہ کیا اور اسی ملک پر اس کی تنخواہ مُجرا کر دی۔ نوجوان جگت سنگھ اب ایسا ہو گیا تھا کہ بذات خود بادشاہی خدمتوں کا سرانجام کر سکے۔

سنہ ۱۰۰۲ھ میں کوچ بہار کے راجہ نے سورما سپہ سالار کے دربار میں اکبری اطاعت کا سجدہ ادا کیا۔ ملک مذکور کا طول .. کوس۔ عرض چالیس اور سو کے بیچ میں پھیلتا سمٹتا چلا جاتا ہے۔ چار لاکھ سوار۔ دو لاکھ پیادے۔ سات سو ہاتھی ہزار جنگی کشتیاں جان نثاری کو حاضر رہتی تھیں۔ اگرچہ اس کے بیٹے جگت سنگھ کو سنہ ۱۰۰۵ھ میں کوہستان پنجاب کا انتظام سپرد ہوا۔ مگر مان سنگھ پر یہ سال نہایت منحوس تھا۔ ہمّت سنگھ اس کے بیٹے نے امتلا سے اسہال اور اسہال سے بدحال ہو کر انتقال کیا۔ ہچکی لگ گئی تھی۔ اسی میں جان نکل گئی۔

اسی سنہ میں عیسیٰ خاں افغان نے بغاوت کی۔ مان سنگھ نے دُرجن سنگھ اپنے بیٹے کو فوج دے کر بھیجا۔ سرداروں میں ایک نمک حرام غنیم سے ملا ہوا تھا۔ اور خبر پہنچا رہا تھا۔ دشمن ایک جگہ پر بے خبر آن پڑا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ درجن سنگھ مارا گیا۔ اور بہت جانیں ضائع ہوئیں۔ تمام مال خلانے لُٹ گئے۔ پھر عیسیٰ خاں اپنے کئے پر پچتایا۔ جو کچھ مال لیا تھا ہزاروں ندامت اور عذر و معذرت کے ساتھ واپس کیا۔

سنہ ۱۰۰۷ھ میں مان سنگھ کا اقبال پھر نحوست کی سیاہ چادر اوڑھ کر نکلا۔ صورت یہ ہوئی کہ اکبر کو جس طرح سمرقند و بخارا کے لینے کی آرزو تھی اسی طرح رانائے میواڑ سے اطاعت لینے کا ارمان تھا۔ چنانچہ عبداللہ خاں ازبک والی توران کے مرنے سے بڑے بڑے ارادوں کے منصوبے باندھے اور شطرنج پر مُہرے پھیلائے ارادہ یہ تھا۔ کہ ادھر کے منصوبے جیت کر خاطر جمع سے ملک موروثی پر چلیئے۔ شہزادہ دانیال۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ شیخ ابوالفضل کو دکن پر بھیجا تھا۔ اور پیچھے پیچھے آپ تھا۔ جہانگیر کو مہم رانا پر روانہ کیا۔ مان سنگھ کو پرانے پرانے امیروں کے ساتھ سپہ سالار کر کے ہمراہ کیا۔ اور بنگالہ اس کی جاگیر جگت سنگھ اس کے ولیعہد کو عنایت کی۔ نوجوان کنور خوشی خوشی روانہ ہوا۔ آگرے میں جا کر سامان میں مصروف تھا کہ (جگت سنگھ) دفعتہً مر گیا۔ قوم کچھواہہ کے گھر گھر میں ماتم پڑ گیا۔ اکبر کو بھی بہت رنج ہوا۔ مہان سنگھ اس کے بیٹے کو باپ کی جگہ دی اور روانگی کا فرمان روانہ کیا۔ سرشور افغانوں نے اس موقع

کو غنیمت سمجھا۔طوفان ہو کر اُٹھے۔مہاں سنگھ جرأت کر کے آگے بڑھا۔مگر نوجوانی کی دوڑ تھی۔ ٹھوکر کھائی باغیوں نے مقام بھدراک پر لشکر بادشاہی کو شکست دی اور پانی کی طرح پھیل کر بڑا حصّہ بنگالے کا دبا لیا ؛

راجہ بغاوتِ بنگالہ کی خبر سنتے ہی شیر کی طرح جھپٹا۔جب وہاں پہنچا تو پُرنیہ۔کھنگر وال۔ بکرم پور وغیرہ مکانات مختلفہ میں غنیموں نے خودسری کے نشان کھڑے کئے ہوئے تھے۔اس نے جا بجا فوجیں روانہ کیں۔اور جہاں ضرورت دیکھی۔ وہاں خود یلغار کر کے پہنچا۔اکبری اقبال کی برکت اور راجہ مان سنگھ کی ہمّت اور نیک نیّت نے ایک عرصے کے بعد بغاوت کی آگ بجھائی اور ڈھاکے میں آکر خاطر جمع سے حکمرانی کرنے لگا ؛

جب تک اکبر رہا۔مان سنگھ کا ستارہ سعد اکبر (مشتری یعنی برہسپت) رہا۔ جب وہ مرض الموت کے بستر پر لیٹا۔اسی وقت سے اس کا ستارہ بھی ڈھلنا شروع ہوا۔اوّل خسرو کے خیال سے خود اکبر کو واجب تھا کہ اُسے آگرے سے سرکا دے۔ چنانچہ حکم ہوا کہ اپنی جاگیر پر جاؤ۔مطیع الفرمان نے کل آرزوؤں کو اپنے پیارے آقا کی خوشی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ فوراً بنگالے کو روانہ ہوا۔اور خسرو کو ساتھ لیا۔جب نیا بادشاہ تخت پر بیٹھا۔پرانے امرا سب حاضر دربار ہوئے۔نوجوان بادشاہ مستِ الست تھا۔مگر یہ بات اس کی بھی قابل تعریف ہے کہ پہلی باتوں کو بالکل بھول گیا۔خود لکھتا ہے کہ اس نے بعض باتیں ایسی کی تھیں کہ اپنے حق میں اس عنایت کی اُمید نہ رکھتا تھا۔پھر بھی خلعت چارقب۔ شمشیر مرصّع اسپ خاصہ بازین زریں دے کر اکرام و اعزاز بڑھایا اور بنگالے کا صوبہ دوبارہ اپنی طرف سے مرحمت کیا۔مگر طالع کی گردش کو کون سیدھا کر سکے۔ چند مہینے گزرے تھے کہ خسرو باغی ہو گیا۔آفرین ہے جہانگیر کے حوصلے کو کہ مان سنگھ کے کاروبار میں کوئی تغیّر کا اثر ظاہر نہ کیا۔مان سنگھ کو بھی آفرین کہنی چاہیئے۔کیونکہ بھانجے کا بھلا تو ضرور چاہتا ہوگا۔مگر اس موقع پر کوئی ایسی بات بھی نہیں کی۔جس سے بے وفائی کا الزام لگا سکیں ؛

مستِ الست بادشاہ جلوس کے ایک برس آٹھ مہینے کے بعد خود لکھتا ہے۔مگر درد آلود عبارت ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ دردناک دل سے نکلی ہے۔ راجہ مان سنگھ نے قلعہ رہتاس سے آکر ملازمت کی کہ ملک پٹنہ میں واقع ہے۔ چھ سات فرمان گئے۔ جب آیا ہے۔ وہ بھی خان اعظم کی طرح منافقوں

اور اس سلطنت[1] کے پرانے پاویوں میں سے ہے۔ جو انہوں نے مجھ سے کیا اور مجھ سے ان کے ساتھ ہؤا۔ خدائے راز داں جانتا ہے کہ کوئی کسی سے اس طرح نہیں گزارہ کر سکتا۔ راجہ نے سو ہاتھی نر و مادہ پیشکش گذرانے ایک بھی اتنی بات نہ تھی کہ فیلان خاصہ میں داخل ہو سکے یہ میرے باپ کے بنائے ہوئے نوجوانوں میں سے ہے اس کی خطائیں اس کے منہ پر نہ لایا۔ اور عنایت بادشاہانہ سے سرفراز کیا۔ پونے دو مہینے کے بعد پھر لکھتا ہے۔ ایک گھوڑا میرے سارے گھوڑوں کا سردار تھا۔ عنایت کی نظر سے راجہ مان سنگھ کو مرحمت کیا۔ اور گھوڑوں اور تحائف لائق کے ساتھ شاہ عباس نے منوچہر خاں کی ایلچی گری میں حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو بھیجا تھا۔ منوچہر شاہ کا غلام معتبر ہے۔ جب یہ گھوڑا میں نے عنایت کیا تو مان سنگھ مارے خوشی کے اس طرح لوٹا جاتا تھا کہ اگر میں کوئی سلطنت اُسے دے دیتا تو معلوم نہیں کہ اتنا خوش ہوتا۔ یہ گھوڑا جب آیا تھا تو تین چار برس کا تھا۔ ہندوستان میں آکر بڑا ہؤا اور یہیں ساری خوبیاں نکالیں۔ تمام بندہائے درگاہ مغل اور راجپوت نے بالاتفاق عرض کی کہ ایسا گھوڑا کبھی ایران سے ہندوستان میں نہیں آیا۔ جب والد بزرگوار نے خاندیس اور صوبہ دکن بھائی دانیال کو مرحمت کیا۔ اور آگرے کو پھرنے لگے تو محبّت کی نظر سے اُسے کہا کہ جو چیز تجھے بہت پسند ہو۔ مجھ سے مانگ۔ اس نے موقع پاکر یہ گھوڑا مانگا اس سبب سے اُسے دیا تھا +

آزاد۔ بھلا ۲۰ برس کے بڈھے گھوڑے پر خوش کیا ہونا تھا؟ یہ کہو کہ وقت کو دیکھتے تھے۔ آدمی کو پہچانتے تھے۔ اور تھے مسخرے۔ کیا یہ کیا خان خاناں مست کو دیوانہ بناتے تھے۔ بڈھے ہوئے تو ہو جائیں۔ طبیعت کی شوخی تو نہیں جاسکتی۔ اکبر کے عہد میں دانش و داد۔ ہمّت و حوصلہ و جرأت و جاں نثاری کا زمانہ تھا۔ اسے ان باتوں سے خوش کرتے تھے۔ اور اسے دیکھا کہ اس ڈھب کا نہیں۔ اِسے اس ڈھب سے تسخیر کر لیا +

خانجہاں وغیرہ اُمرائے بادشاہی دکن میں کارنامے دکھا رہے تھے۔ ہمّت اور لیاقت کو میدان میں جولانی کرنے کا ضرور شوق ہؤا ہوگا۔ اور جاں نثاری کی عادت نے اس مصلحت کو جوش دیا ہوگا۔ لیکن خسرو کے سبب سے اس کا معاملہ ذرا نازک تھا۔ اس لئے وطن گیا۔ اپنے پرانے اہل کاروں سے صلاح

[1] او ہم مثل خان اعظم از کہنہ گرگانِ ایں دولت است +

کرکے جہانگیر سے عرض کی اور لشکر لے کر دکن پہنچا۔ دو برس تک وہاں رہا اور ۱۰۲۳ھ میں وہیں سے ملکِ بقا کو کوچ کر گیا ؛

اس نے ملک گیری اور ملک داری کے تمام اوصاف سے پورا پورا حصہ پایا تھا۔ جدھر لشکر لے کر گیا۔ کامیاب ہوا۔ کابل میں آج تک بچہ بچہ اس کا نام جانتا ہے۔ اور اس کی بابت کہاوتیں زبانوں پر ہیں۔ مشرق میں اکبری حکومت کا نقارہ دریائے شور کے کنارے تک جا بجایا۔ اور بنگالے میں اپنی نیکی سے ایسے گلزار لگائے ہیں۔ جو آج تک سرسبز ہیں۔ اس کی عالی ہمتی اور دریا دلی کے چشمے زبانوں پر جاری ہیں اور زمانوں تک رہینگے۔ اس کی سرکار میں سو ہاتھی فیل خانے میں جھومتے تھے۔ بیس ہزار لشکر جرّار اس کی ذات کا نوکر تھا۔ جن میں معتبر سردار۔ ٹھاکر اور امرائے عالی شان کی سواریاں امیرانہ جلوس سے نکلتی تھیں۔ تمام سپاہی بیش قرار تنخواہوں اور سامانوں سے آسودہ تھے۔ ہر فن کے صاحب کمال اس کے شاہانہ دربار میں حاضر رہتے تھے۔ اور عزّت اور خوشحالی کے عالم میں رہتے تھے ؛

باوجود اس کے خوش اخلاق۔ ملنسار۔ شگفتہ مزاج تھا۔ اور جلسے میں تقریر کو انکسار و تواضع سے رنگ دیتا تھا۔ جب وہ مہم دکن پر گیا تو خانجہاں لودھی سپہ سالار تھا۔ پندرہ پنج ہزاری صاحب علم و نقارہ موجود تھے۔ جن میں خان خاناں۔ خود راجہ مان سنگھ۔ آصف خاں۔ شریف خاں امیر الامرا وغیرہ شامل تھے۔ اور چار ہزاری سے پانصدی تک ایک ہزار منصب دار فوجیں لئے کمربستہ موجود۔ بالاگھاٹ کے مقام پر لشکر شاہی کو سخت تکلیف پیش آئی۔ ملک میں قحط پڑ گیا۔ اور رستوں کی خرابی سے رسد بند ہونے لگی۔ امرا روز جمع ہو کر جلسۂ مشورت جماتے تھے۔ کوئی نقشہ نہ جمتا تھا۔ ایک دن مان سنگھ نے سرِ دیوان اٹھ کر کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا تو ایک وقت تم صاحبوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا۔ اب کہ ڈاڑھی سفید ہو گئی ہے۔ کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔ ایک پان ہے۔ آپ صاحب قبول فرمائیں۔ سب سے پہلے خانجہاں نے دلداری کا ہاتھ سینے پر رکھا اور مان کا پان سمجھ کر سب نے قبول کر لیا۔ چنانچہ پنج ہزاری سے لے کر صدی کے منصبدار تک حسب حیثیت نقد اور جنس لوازم ضیافت برابر ہر شخص کی سرکار میں پہنچ جاتا تھا۔ ہر تھیلے اور خریطے پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا۔ تین چار مہینے تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ایک دن ناغہ نہیں ہوا۔ بنجاروں

نے رسد کا تانتا لگا دیا۔ بازارِ لشکر میں ہر شے کے انبار پڑے تھے اور جو آنبیر میں نرخ تھا۔ وہی یہاں نرخ تھا۔ ایک وقت کا کھانا بھی سب کو ملتا تھا۔ کنور اس کی رانی بڑی عقلمند اور منتظم بی بی تھی۔ گھر میں بیٹھی تھی۔ اور سب کار وبار کے انتظام برابر کرتی تھی۔ یہاں تک کہ کوچ و مقام کے موقع پر مسلمانوں کو حمام و مسجد کی وضع کے خیمے بھی تیار ملتے تھے ؛

خوش اخلاق راجہ ہمیشہ شگفتہ مزاج اور خوش رہتا تھا۔ **لطیفہ** - دربار میں کوئی سید صاحب ایک برہمن سے الجھ پڑے۔ اور اخیر میں کہا کہ جو راجہ صاحب کہ دیں۔ وہ صحیح ہے۔ راجہ نے کہا کہ مجھے علم نہیں جو ایسے معاملے میں گفتگو کر سکوں۔ مگر ایک بات دیکھتا ہوں۔ کہ ہندوؤں میں کیسا ہی گنوان پنڈت یا گیانی دھیانی فقیر ہو۔ جب مرگیا تو جل گیا۔ خاک اُڑ گئی۔ رات کو وہاں جاؤ تو آسیب کا خطرہ ہے۔ اسلام میں جس شہر بلکہ گاؤں میں گزرو۔ کئی بزرگ پڑے سوتے ہیں۔ چراغ جلتے ہیں۔ پھول مہک رہے ہیں۔ چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ لوگ ان کی ذات سے فیض پاتے ہیں ؛

لطیفہ۔ ایک دن یہ اور خانخاناں شطرنج یا چوپڑ کھیل رہے تھے۔ شرط یہ ہوئی کہ جو ہارے۔ وہ جیتنے والے کی فرمائش کے موجب ایک جانور کی بولی بولے خان خاناں کی بازی دبنی شروع ہوئی۔ مان سنگھ نے ہنسنا شروع کیا اور کہا کہ بلی کی بولی بلواؤں گا۔ خان خاناں ہمت کئے گئے۔ آخر چار پانچ چالوں کے بعد مایوس ہوگئے۔ مگر بڑے چالئے تھے۔ گھبرا کر اُٹھنا چاہا۔ اور کہا "اے ہا! از خاطرم رفتہ بود۔ خوب شد کہ حالا ہم بیاد آمد" مان سنگھ نے کہا "کجا کجا؟" انہوں نے کہا۔ جہانبانی چیزے فرمودہ بودند۔ حالا یادم آمدہ بروم کہ زود تر سر انجامش کنم" اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ راجہ نے کہا۔ "نمے شود" خان خاناں نے کہا "حالا مے آیم"۔ راجہ نے دامن پکڑ لیا اور کہا "خوب است۔ صدائے پشک بکنید و بروید" انہوں نے کہا "شما دامنم بگذارید مے آیم۔ مے آیم" وہ بھی ہنس پڑے۔ واہ کیا بات ہے۔ اتنی بات کہی اور اپنی بات پوری کر دی ؛

مان سنگھ کی تاریخ زندگی میں اس بیان پر پھول برسانے چاہئیں کہ اس نے اور اس کے کل خاندان نے اپنی ساری باتوں کو اکبر کی خوشی پر قربان کر دیا۔ مگر مذہب کے معاملے میں بات کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جن دنوں میں دینِ الٰہی اکبر شاہی کا زیادہ زور ہوا۔ اور ابوالفضل اس کے خلیفہ ہوئے۔ بیربل برہمن

کہلاتے تھے۔ انہوں نے سلسلۂ مریدی میں چوتھا نمبر حاصل کیا۔ لیکن مان سنگھ سنجیدگی اور عقل کے نکتے سے بال بھر نہیں ہٹتا۔ چنانچہ ایک شب بعض مہمات سلطنت کے باب میں جلسۂ مشورت تھا۔ ان کو حاجی پور پٹنہ جاگیر عنایت ہوا۔ بعد اس کے خلوت خاص تھی۔ خان خاناں بھی موجود تھے۔ اکبر مان سنگھ کو ٹٹولنے لگے کہ دیکھوں یہ بھی مریدوں میں آتا ہے یا نہیں۔ تقریر کا سلسلہ اس طرح چھیڑا کہ جب تک دو چار باتیں نہیں ہوتیں تب تک اخلاص کامل نہیں ہوتا۔ سپاہی راجپوت نے صاف اور بے تکلّف جواب دیا۔ کہ حضور اگر مریدی سے مراد جان نثاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر کچھ اور ہے اور حضور کی مراد مذہب سے ہے۔ تو ہندو ہوں۔ فرمائیے مسلمان ہو جاؤں! اور رستہ جانتا نہیں۔ کون سا ہے کہ اختیار کروں۔ اکبر بھی ٹال گئے ؞

ایک فقیر نے بیگھہ بھر زمین کے لئے دربار اکبری میں سوال کیا۔ وہاں سینکڑوں ہزاروں بیگھہ کی حقیقت نہ تھی۔ عطا ہو گئی۔ سند اس کی سب اُمراء کے دفتروں میں سے دستخط ہوتی چلی آئی۔ مان سنگھ کے سامنے جب کاغذ آیا تو اس نے زعفران زار کشمیر کو مستثنیٰ کر دیا۔ فقیر نے جب دیکھا تو سند پھینک کر چلا گیا کہ اب کیا کرنی ہے۔ اگر بیگھہ بھر زمین لینی ہوتی تو جہاں چاہتا بیٹھ جاتا۔ خدائی میدان کھلا پڑا ہے۔ بعض اہلِ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ ٹوڈر مل کی جزرسی تھی ؞

راجہ مان سنگھ! اخلاقی تاریخ میں تمہارا نام سنہری حروف میں قیامت تک روشن رہے گا۔ اخلاق اور بے تعصبی تمہارے مبارک نام پر ہمیشہ پھول اور موتی برسائے گی۔ تمہارا سر ایسے پھولوں کے ہاروں سے سجا ہے۔ جن کی مہک قیامت تک دماغ عالم کو معطر رکھے گی ؞

مولینا وحید الدّین سلیم

تلمیحات

تلمیح اور اصطلاح سے کیا مُراد ہے؟ زبان کے ابتدائی دَور میں چھوٹے

چھوٹے سادہ خیالات اور معمولی چیزوں کے بتانے کے لئے الفاظ بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انسان نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا۔ لمبے لمبے قصّوں اور واقعات و حالات کی طرف خاص خاص لفظوں کے ذریعے سے اشارے ہونے لگے۔ جہاں وہ الفاظ زبان پر آئے، فوراً قصّے یا واقعے آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ جن کی طرف وہ اشارہ کرتے تھے۔ ایسا ہر اشارہ "تلمیح" کہلاتا ہے۔ پھر علمی مسئلوں یا اصولوں کے بتانے کے لئے بھی خاص خاص الفاظ معیّن کئے گئے۔ ان میں سے ہر لفظ "اصطلاح" کہلاتا ہے ٭

دُنیا کی جو زبانیں ترقی یافتہ ہیں، اُن میں تلمیحیں اور اصطلاحیں کثرت سے ہیں۔ تلمیحوں اور اصطلاحوں کی فرہنگیں الگ الگ تیار کی گئی ہیں۔ جن میں ہر تلمیح اور ہر اصطلاح کی تشریح کی گئی ہے۔ طویل قصّوں اور کہانیوں اور علمی مسئلوں اور اصولوں کے بار بار بیان کرنے میں جو وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ اس سے ان تلمیحوں اور اصطلاحوں نے بچا دیا ہے ٭

جو حضرات اصطلاحیں وضع کرنے کے وقت اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر اصطلاحی لفظ سے پورا مفہوم ادا ہونا چاہیئے۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ دُنیا میں کوئی اصطلاح ایسی نہیں ہے جس سے پورا مفہوم ادا ہوتا ہو، اور وہ پُورا علمی مسئلہ یا اصول سمجھ میں آتا ہو جس کے لئے وہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ یہ حضرات ترقی زبان کے رستے سے پیچھے ہٹنا چاہتے ہیں۔ اور اس منزل کی طرف پھر جانا چاہتے ہیں، جہاں پورے علمی مسئلے یا اصول کو بار بار دُہرانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اور ہر دفعہ ایسا کرنے میں بے انتہا وقت ضائع کرنا پڑتا تھا۔ تضیع اوقات ہی سے بچنے کے لئے یہ اشارے ایجاد کئے گئے ہیں۔ جن کا نام اصطلاحات ہے۔ اور یہ اُس وقت کی ایجاد ہے۔ جب کہ انسانی عقل کی ترقی کے ساتھ زبان بھی ترقی کی بلندی پر پہنچ گئی تھی ٭

جو حال اصطلاحوں کا ہے، وُہی تلمیحوں کا۔ "طوفان نوح" کہتے ہی وہ تمام طوفانی واقعات آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں جو حضرت نوح کے زمانے میں پیش آئے تھے۔ "صور اسرافیل" کا لفظ زبان پر لاتے ہی وہ تمام ہیبت انگیز واقعات دل میں پھرنے لگتے ہیں جو آغازِ قیامت کے وقت پیش آئیں گے۔ ان میں سے پہلا اشارہ گزرے ہوئے واقعات کے ایک خوفناک منظر کو یاد دلاتا

ہے۔ دوسرا اشارہ آنے والے واقعات کے ایک پُر ہول نظارے کو آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ ان اشاروں کے لئے جو الفاظ مقرر کئے گئے ہیں، وہ کسی طرح گزشتہ اور آئندہ واقعات کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتے ؛

بلاغت کے معنی یہ ہیں کہ کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ معنے سمجھے جائیں۔ یہ بات جس قدر تلمیحات میں پائی جاتی ہے، الفاظ کی دیگر اقسام میں نہیں پائی جاتی۔ جس زبان میں تلمیحات کم ہیں یا بالکل نہیں ہیں، وہ بلاغت کے درجے سے گری ہوئی ہے۔ ایسی زبانوں میں بولنے والوں، لکھنے والوں اور شعر کہنے والوں کو اپنے مطالب کے ادا کرنے میں بہت زیادہ دقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ سُننے والے ایک ہی واقعے کو بار بار سُننے سے اکتا جاتے ہیں۔ اگر وہ واقعہ ایک مختصر لفظ سے تعبیر کیا جائے تو اس کا دُہرانا اجیرن نہیں ہوتا، بلکہ ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ ضمیر اسم کی قائمقام ہوتی ہے۔ وہ اسی لئے وضع کی گئی ہے کہ بار بار کسی اسم کو دہرانا نہ پڑے اور سننے والوں کو ناگوار نہ ہو تلمیحات کو اور تلمیحات کے ساتھ اصطلاحات کو اسی قدرتی ضرورت پر مبنی سمجھو ؛

عام تلمیحات۔ عام بول چال میں جو تلمیحات مستعمل ہیں، اُن میں سے بعض تاریخ سے لی گئی ہیں۔ بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور اوہام سے ماخوذ ہوئی ہیں۔ بعض ان دونوں قوموں کی خاص خاص رسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بعض کی بنیاد ان فرضی قصّوں پر ہے جو عام طور سے مشہور ہیں۔ ان میں سے بعض تلمیحیں محاوروں کی شکل میں ہیں اور بعض مثلوں کے پیرائے میں۔ ایسے محاوروں کو ہم تلمیحی محاورے اور ایسی مثلوں کو ہم تلمیحی مثلیں کہتے ہیں۔ ماخذوں کے لحاظ سے یہ تلمیحیں ملی جلی ہیں۔ ہندو مسلمان ان میں برابر کے شریک ہیں ؛

مندرجہ بالا چاروں قسم کی تلمیحات کی مثالیں ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں جو حسب ذیل ہیں :۔

اوّل۔ وُہ تلمیحیں جو تاریخ سے لی گئی ہیں :۔

ڈھائی دن کی بادشاہت یا اڑھائی دن کی بادشاہت سے تھوڑے دنوں کی حکومت یا ناپائدار حکومت مُراد ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے اس واقعے سے آگاہ ہیں کہ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر دریا

میں کود پڑا تو نظام سقّہ نے اُس کو ڈوبتے بچایا تھا۔ اور اس کے بدلے میں اُس نے ہمایوں بادشاہ سے ڈھائی دن کی حکومت مانگی تھی۔ نظام نے اس قلیل دورِ حکومت میں چمڑے کا گول روپیہ سونے کی کیل جڑ کر چلایا تھا۔ اس واقعے سے ایک دُوسری تلمیح پیدا ہوتی ہے ؛

چام کے دام چلانا۔ اس محاورے سے جُوتے کے زور سے حکومت کرنا اور جبراً کام لینا مُراد ہے ؛

اورنگ زیبی ایک طبّی تلمیح ہے۔ یہ ایک سوداوی مادّے کا پھوڑا ہے، جو اکثر کئی سال تک ہرا رہتا ہے اور اچھا ہونے میں نہیں آتا۔ جب اورنگ زیب عالمگیر نے گولکنڈے کا محاصرہ کیا اور محاصرے نے طُول کھینچا تو آب وہوا کی خرابی سے اکثر اہل لشکر کے پھوڑے نکل آئے۔ اور باوجود علاج کے وہ مُدّت تک ہرے رہے۔ اسی پھوڑے کو اورنگ زیبی کہتے ہیں ؛

سلطنت مُغلیہ کے زمانے میں بادشاہوں کے جلوس کے ساتھ بائیس اضلاع کی فوج رہتی تھی۔ یہ فوج بائیسی کہلاتی تھی۔ بائیسی ٹوٹنے کا محاورہ اسی سے نکالا گیا ہے۔ جس سے مُراد ہے ساری فوج سے حملہ کرنا۔ یا تمام زور صرف کر ڈالنا ؛

ٹوپی والے وہ قزلباش سپاہی کہلاتے ہیں، جو اوّل نادر شاہ کے ساتھ پھر شاہ ابدالی کے ساتھ آئے تھے۔ تُرکی زبان میں قزل کے معنی سُرخ اور باش کے معنی ہیں سر۔ یہ سپاہی سروں پر لال لال ٹوپیاں رکھتے تھے۔ اسی سبب سے قزلباش کہلاتے تھے۔ دلّی والوں نے ان کا نام "ٹوپی والے" رکھا ؛

ایک زمانے میں دلّی میں افغان بادشاہوں کی حکومت تھی۔ اس زمانے کی یادگار پٹھانوں کی وہ چھوٹی چھوٹی مسجدیں ہیں جو پاس پاس بنائی گئی ہیں۔ پٹھان تند مزاجی کے سبب کسی کا احسان اپنے سر لینا اور غیر کی بنائی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا ایک تلمیحی محاورہ ہے جو اس واقعے کی یاد دلاتا ہے ؛

رادھا کو یاد کرو۔ ایک محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ "جاؤ اپنا کام کرو"۔ سُری کرشن کی ایک محبوبہ کا نام رادھا اور ایک کا نام کُبجا تھا۔ کُبجا بے تکلفی اور شوخی سے یہ کلمہ زبان پر لایا کرتی تھی ؛

کالے کلوٹے آدمیوں کو محاورے میں راون کی سینا کہتے ہیں۔ راون جو لنکا کا راجہ تھا۔ اور رام چندر جی کے ساتھ نبرد آزما ہوا۔ اس کی فوج کے لوگ سیاہ فام تھے۔ اُن کی وردیاں سیاہ رنگ کی تھیں۔ اسی سبب سے رام لیلا میں جو اس واقعے کی نقل ہے۔ راون کی فوج کے سپاہیوں کو سیاہ لباس پہنایا جاتا ہے ؞

رُستم محاورے میں بہادر کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ جیسے بس ایک تم ہی تو رُستم ہو۔ یہاں تمہاری رستمی کیوں نہ چلی۔ رستم کا بچّہ اور رُستم کا سالا وغیرہ الفاظ بھی بولے جاتے ہیں ؞

چھُپا رُستم ایک اور محاورہ ہے جس کے دو معنی لئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ شریر آدمی جو ظاہر میں غریب نظر آتا ہو۔ دوسرے وہ شخص جو کامل الفن ہو اور وقت پر اُس کا ہنر ظاہر ہو ؞

افلاطون جو یونان کا مشہور حکیم ہے کشتی کے فن میں کامل تھا۔ اس بنا پر جہاں زور آور زبردست کے معنوں میں رستم کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وہیں افلاطون اور افلاطون کا بچّہ وغیرہ الفاظ بھی رائج ہیں ؞

تانا شاہی مزاج کا لفظ اُس نازک مزاجی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ابوالحسن تانا شاہ والیٔ گولکنڈہ میں تھی ؞

تختِ طاؤس شاہ جہان کے تخت کی تلمیح ہے جس پر چھ کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ اور جو جواہرات سے مرصّع تھا اور جس کے اوپر ایک مور پنکھ پھیلائے کھڑا تھا ؞

اخفش ایک مشہور صرفی تھا۔ اُس نے ایک بکری پال رکھی تھی۔ عربی افعال کی گردانیں اُس بکری کے سامنے دہرایا کرتا تھا۔ اگر وہ بکری سر ہلا دیتی تھی تو سمجھتا تھا کہ سبق یاد ہو گیا، ورنہ پھر اس سبق کو رٹنا شروع کر دیتا تھا۔ جس وقت اس بکری کو ذبح کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے سر میں بھیجا ندارد ہے۔ اس سبب سے ایسے آدمی کو جو بے سمجھے گردن ہلا دے بزِ اخفش کہتے ہیں ؞

لکھ بخش یا لکھ داتا اُس شخص کو کہتے ہیں، جو انتہا درجے کا فیّاض ہو۔ یہ اصل میں قطب الدین ایبک کا لقب ہے جو شہاب الدین غوری کا غلام تھا۔ اور اس کے مرنے پر خود بادشاہ ہو گیا تھا۔ اُس کی فیاضی کی داستانیں آج

تک زبان زد عالم ہیں۔ ہندو آج تک اُسے پُوجتے ہیں۔ ان میں سے اکثر جا بجا تھان بنا کر اُس کی پُوجا کراتے ہیں ؂

ہلاکو۔ ظالم اور سفاک آدمی کو کہتے ہیں۔ یہ تلمیح ہلاکو خاں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جو چنگیز خاں کا پوتا تھا۔ اور اسی نے بغداد کو تاخت و تاراج کیا ؂

تورہ والی مغرور عورت کو کہتے ہیں۔ تورہ جتانا شیخی کرنا ہے۔ شرع تورہ بھی محاورہ ہے۔ جس سے دین داری کا اظہار اور بات بات میں مذہبی روک ٹوک مُراد ہے۔ تورہ اصل میں چنگیز خاں کے مجموعہ قوانین کا نام تھا جس میں قانون کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ یہ سب محاورے اسی لفظ تورہ سے لئے گئے ہیں ؂

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ راون کے بھائی بھولیشن نے راجہ رام چندر سے مل کر اُن کو قلعہ لنکا کے بہت سے بھید بتائے تھے اور اس کے فتح کرنے میں مدد دی تھی۔ اب اس مثل سے مطلب یہ ہے کہ راز دار کی دشمنی بڑا نقصان پہنچاتی ہے ؂

دوم۔ وہ تلمیحیں جو عام عقائد اور اوہام سے ماخوذ ہیں:۔

جب کوئی شخص سفر کو سدھارتا ہے تو مسافر کے بازو پر روپیہ وغیرہ باندھ دیا جاتا ہے۔ جب وہ خیر و عافیت سے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے تو وہ رقم سیّدوں کو بانٹ دی جاتی ہے۔ اس کو امام ضامن کا روپیہ کہتے ہیں۔ یہاں امام سے حضرت علی رضا آٹھویں امام مُراد ہے۔ عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر آپ کے نام کا روپیہ مسافر کے بازو پر باندھ دیا جائے۔ تو آپ اس کی سلامتی کے ضامن ہو جاتے ہیں ؂

اندر کا اکھاڑہ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں ناچنے گانے والی حسین عورتیں جمع ہوں۔ ہندو راجہ اندر کو بہشت کا مالک مانتے ہیں، جس کے سامنے حُوریں گاتی اور ناچتی رہتی ہیں۔ یہ محاورہ اسی خیال پر مبنی ہے ؂

بجلی کی تلوار اُس تلوار کو کہتے ہیں جو بہت کاٹ کرنے والی ہو۔ عوام کا خیال ہے کہ بعض مقامات میں بجلی اکثر گرا کرتی ہے۔ وہاں کے لوہار بہت سا لوہا جمع کر کے میدان میں رکھ دیتے ہیں تاکہ اُس پر بجلی گرے اور وہ آبدار ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ جو تلوار اس لوہے سے بنائی جاتی ہے، اس کا

مقابلہ آبداری اور کاٹ میں کوئی تلوار نہیں کر سکتی ؛

عام لوگوں کا خیال ہے کہ جس رستے سے بلّی نکلے ، اگر کوئی شخص بلّی کے نکل جانے کے بعد اس رستے سے گزرے تو اُس کو لڑائی جھگڑا ضرور پیش آتا ہے۔اِسی سبب سے بلّی اُلانگنا ایک محاورہ ہو گیا ہے ، جس کے معنے ہیں" لڑنے جھگڑنے کو آنا"۔ جو شخص آتے ہی ٹیڑھی ترچھی باتیں کرنے لگے ، اس کی نسبت کہتے ہیں کہ تم بلّی اُلانگ کر تو نہیں آئے ؛

بھیروں ہندوؤں کے نزدیک شیو جی کا ایک نام ہے۔اور یہ اُس وقت کے لئے ہے جب کہ وہ غضبناک ہوں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اُن کی خفگی سے تباہی اور بربادی آتی ہے۔اسی عقیدے سے **بھیروں ناچنا** ایک محاورہ بنایا گیا ہے ، جس کے معنی ہیں ویرانی چھا جانا ؛

جاہل مسلمان عورتیں اکثر پیروں ، ولیوں اور پریوں کے نام لیتی اور اُن کو مانتی ہیں۔مثلاً لال پری۔ سبز پری۔ زرد پری۔ سیاہ پری۔ آسمان پری۔ دریا پری۔ نور پری۔ زین خاں۔ صدر جہاں۔ ننھے میاں۔ شاہ دریا۔ شاہ سکندر۔ شیخ سدّو۔ ماموں الہ بخش۔ سید برہنہ۔ پیر ہٹیلے۔ شاہ مدار۔ پیر غیب۔ چالیس تن یا چہل ابدال جن کے دم قدم سے یہ دُنیا قائم ہے۔عورتیں ان پریوں اور ان بزرگوں کی رُوحوں میں سے کسی روح کو اپنے سر پر بُلاتی ہیں۔ جو عورت یہ کام کرتی ہے وہ جمعرات کے دن خوشبو ، زیور اور عمدہ پوشاک سے آراستہ ہو کر بیٹھ جاتی اور گانا سُنتی ہے۔ جب کوئی پری یا رُوح اُس کے سر پر آتی ہے تو وہ اپنا سر ہلانے لگتی ہے۔ دوسری عورتیں اپنی اپنی حاجتیں اُس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اور وہ ہر ایک کے سوال کا جواب دیتی جاتی ہے۔ اس طریقے سے رُوحوں کے بُلانے کو **بیٹھک دینا** یا **حاضرات کرنا** کہتے ہیں۔ اس تلمیح میں عورتوں کے اس خاص عقیدے کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا ذکر کیا گیا ؛

ادنے درجے کے ہندو بھی اس طرح کسی دیوی ، دیوتا یا بیر کو اپنے سر پر بلاتے ہیں۔ اُن میں جو مرد اس کام کو انجام دیتا ہے اس کو "بھگت" کہتے ہیں اور عورت کو "بھگتانی" ؛

بیر اس جنّ یا خبیث رُوح کو کہتے ہیں جس کو جادوگر کسی کو ضرر پہنچانے

کے لئے اس پر مسلّط کرتے ہیں۔مسلمان اس رُوح کو "مؤکّل" کہتے ہیں۔اس سے بیر بٹھانا اور بیر دوڑانا دو محاورے پیدا ہوئے ہیں ؀

اُڑن کھٹولا اور بوان یا بمان کے الفاظ ہندوؤں کے اس عقیدے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دیوتا ایک تخت رواں پر سوار ہوکر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے تھے۔اس تخت کو ہوا اُڑا کر لے جایا کرتی تھی ؀

پاتال ہندی میں زمین کے سب سے نیچے کے طبقے کو کہتے ہیں۔ہندوؤں نے پاتال کے سات طبقے قرار دئے ہیں۔ ہر طبقے میں ایک زندہ مخلوق آباد ہے۔ پاتال تک کی خبر لانا اسی تلمیح سے ایک محاورہ بنایا گیا ہے ؀

پارس ایک خیالی پتھر کا نام ہے، جس کی نسبت عام لوگوں میں یہ خیال پھیلا ہؤا ہے کہ اگر یہ پتھر لوہے سے چھوا جائے تو اُسے سونا بنا دیتا ہے ؀

"پچھلپائی" کا لفظ جس سے بُھتنی یا چڑیل مُراد ہے عوام کے اس خیال کو یاد دلاتا ہے کہ چڑیلوں یا بُھتنیوں کے پاؤں میں پنجہ پیچھے کی طرف اور ایڑی آگے کی طرف ہوتی ہے ؀

پری ایک خیالی حسین مخلوق ہے جس کا سارا جسم عورت جیسا ہوتا ہے۔مگر بازو پَردار ہوتے ہیں۔ پرستان اس جگہ کا نام رکھا گیا ہے جہاں پریاں آباد ہیں۔ پری مادہ اور دیو یا پری زاد نر ہوتے ہیں۔ پرستان یا پریوں کا اکھاڑہ محاورے میں اس محفل کو کہتے ہیں جہاں بہت سے خوبصورت آدمی جمع ہوں ؀

بیر کی طرح پون بھی ان خبیث روحوں کو کہتے ہیں جنہیں جادوگر کسی شخص کے ضرر پہنچانے کے لئے بھیجتے ہیں۔ پون بٹھانا اور پون دوڑانا یا چلانا وہ محاورے ہیں جو اس لفظ سے بنائے گئے ہیں ؀

بھُوت وہ رُوحیں ہیں جو جسموں سے جُدا ہوکر دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ مرد کی رُوح بھُوت اور عورت کی رُوح بُھتنی کہلاتی ہے۔بھُوت لوگوں کے سروں پر آتے ہیں۔ یہ عام خیال ہے۔ بھُوت چڑھنا کے ساتھ بھُوت اُتارنا بھی محاورے میں آگیا ہے۔کیونکہ عام خیال یہ بھی ہے کہ منتر کے زور سے بھوت کسی کے سر سے اُتارا بھی جا سکتا ہے ؀

مسلمانوں کے نزدیک سات سمندر سے مُراد بحیرۂ شام۔ بحیرۂ قلزم۔ بحیرۂ عرب۔ بحیرۂ عمان۔ بحیرۂ فارس اور بحیرۂ اسود ہیں۔مگر ہندوؤں کے سات سمندروں

نیں سے ایک سمندر نمک کا ہے۔ دوسرا دودھ کا۔ تیسرا گھی کا۔ چوتھا دہی کا۔ پانچواں شراب کا۔ چھٹا گنّے کے رس کا۔ ساتواں شہد کا ہے ؛

سفلی عمل جادو کی وہ قسم ہے جو شیاطین و جنّات کی مدد سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے **علوی عمل** وہ ہے۔ جس میں ستاروں اور فرشتوں سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ جادو کی نسبت عام لوگوں کا جو عقیدہ ہے اس کو یہ دونوں الفاظ ظاہر کرتے ہیں ؛

خدا کے اسماء دو قسم کے ہیں۔ ایک جلالی، جن سے غصّے اور جلال کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے جمالی، جن سے رحم و لطف نمایاں ہے۔ جب خدا کا کوئی جلالی اسم ننگی تلوار کی پشت پر پڑھ کر پھونکتے ہیں، تو اس سے مقصد ہوتا ہے کہ دشمن ہلاک ہو۔ اس عمل کو **سیفی** کہتے ہیں۔ اگر اسم مذکور کے پڑھنے میں بے احتیاطی ہو تو کہتے ہیں کہ یہ عمل اُلٹا عامل کے لئے تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اس حالت کو **سیفی کا اُلٹ جانا** کہتے ہیں ؛

سانپ کا من عوام کے اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ جب سانپ خوش ہوتا ہے تو وہ ایک روشن جوہر مُنہ سے باہر نکال کر جنگل میں رکھ دیتا ہے۔ اس کی روشنی چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوتی ہے۔ سانپ اس روشنی میں کوسوں سیر کرتا پھرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جس کسی کے پاس سانپ کا من ہو وہ تمام آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ نہ آگ اُسے جلا سکتی ہے نہ پانی اُسے ڈبو سکتا ہے ؛

شب چراغ بھی ایک ایسا ہی لفظ ہے۔ کہتے ہیں، کہ یہ ایک جواہر ہے۔ دریائی گائے رات کے وقت چرنے نکلتی ہے تو اُس جواہر کو مُنہ سے نکال کر رکھ دیتی ہے اور اس کی روشنی میں چرتی پھرتی ہے، چر چکنے کے بعد اس کو اپنے مُنہ میں رکھ کر دریا میں غوطہ لگا جاتی ہے ؛

شب برات میں لفظ برات کے معنے روزی کے ہیں۔ اس لفظ سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ اس رات کو یعنی شعبان کی چودھویں یا پندرھویں رات کو فرشتے انسانوں کی روزی اور عمر کا حساب آئندہ کے لئے لگاتے اور روزی تقسیم کرتے ہیں ؛

ست جُگ ہندوؤں کے نزدیک دُنیا کا پہلا دَور ہے جس میں سچ اور راستی کے سوا دوسری بات کا نام نہ تھا۔ اس دَور کی میعاد سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار

برس قرار دی گئی ہے۔ اس کے مقابل ایک دور کل جُگ کہلاتا ہے۔ یہ دور چار لاکھ بتیس ہزار برس کا ٹھیرایا گیا ہے۔ اس زمانے میں پاپ اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوگا ؛

لچھمی ہندوؤں کے اعتقاد میں دولت کی دیوی ہے لچھمی گھر میں آنا ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں صاحب اقبال ہونا ؛

لنکا میں جو چھوٹا سو باون ہی گز کا یا لنکا سے جو نکلا سو باون گز کا۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ اس موقعہ پر بولی جاتی ہے جہاں چھوٹے بڑے سب شریر اور فتنہ پرداز ہوں۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جزیرۂ لنکا میں دیو رہتے تھے، جو بہت بڑے بڑے قد کے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے بچّے بھی باون گز سے کم قد نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کا مزاج نہایت سرکش اور شریر واقع ہوا تھا ؛

میر بھجڑی کی کڑاہی ایک تلمیح ہے جو ہیجڑوں سے لی گئی ہے۔ میر بھجڑی جسے میر بھُوجی بھی کہتے ہیں ہیجڑوں کے سلسلے کا بانی تھا۔ ہیجڑے اس کی نیاز دلواتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ اگر کوئی اس نیاز کی کڑھائی کا حلوا کھالے تو وہ ناچنے تھرکنے اور ہیجڑوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ اور جب تک ہیجڑا نہ بن جائے اُسے کل نہیں پڑتی ؛

یوہا یا یوحی عوام کے خیال میں ایک قسم کا سانپ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس گزرنے پر وہ ایک آواز نکالتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے۔ تیسری دفعہ یعنی تین ہزار برس کے بعد یہ قدرت اُسے حاصل ہو جاتی ہے کہ جس شکل اور جس روپ کا چاہے بن جائے۔ یعنی انسان یا حیوان بننے کی طاقت اُسے حاصل ہو جاتی ہے ؛

عام لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک جنّ پیدا ہوتا ہے جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کو ہمزاد کہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو خاص عمل کے ذریعے سے اس کو قابو میں لا سکتے ہیں، اور اپنی مرضی کے مطابق اس سے کام لے سکتے ہیں ؛

ہندوؤں کے خیال میں ایک فرضی وجود ہے جو دکھائی نہیں دیتا اور دُنیا کے گرد حرکت کرتا رہتا ہے۔ کبھی کسی طرف ہوتا ہے کبھی کسی طرف۔ مثلاً شنبے کے دن وہ مشرق میں ہوتا ہے۔ پنج شنبے کے دن جنوب میں۔ منگل کے دن شمال

ہیں ۔ اتوار کے دن مغرب میں ۔ علیٰ ہذا القیاس اس فرضی وجود کا نام ہندوؤں نے دساسول رکھا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ جس روز وہ جس سمت میں ہو، اُس روز اس سمت پر سفر کرنا نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ سفر کرنے والے پر واجب ہے کہ دساسول کو بائیں طرف یا اپنی پشت کی طرف رکھے ۔ اس کا سامنے پڑنا یا دائیں ہاتھ پر ہونا از حد منحوس خیال کیا جاتا ہے ؛

الوپ انجن ایک قسم کا سُرمہ ہے جس کے لگانے سے آدمی آپ تو سب کو دیکھتا ہے ، مگر اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اِسے سرمۂ سلیمانی بھی کہتے ہیں ؛

گٹکا پارے کی ایک طلسمی گولی ہے جسے جوگی تیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس گولی کو مُنہ میں رکھ لینے سے قوّتِ پرواز آ جاتی ہے ۔ اور اس کی مدد سے جوگی جہاں چاہتے ہیں اُڑ کر چلے جاتے ہیں ؛

سوم ۔ وہ تلمیحیں جو خاص خاص رسموں کی طرف اشارہ کرتی ہیں:۔

مسلمان عورتوں میں دستور ہے کہ نکاح کے بعد وہ دولہا دلہن کو آمنے سامنے سر سے سر ملا کر اور ایک سُرخ دوپٹہ اُڑھا کر بٹھا دیتی ہیں اور اُن دونوں کے بیچ میں ایک آئینہ اور قرآن شریف میں سے سُورۂ اخلاص نکال کر رکھ دیتی ہیں ۔ اس رسم کو آرسی مصحف کہتے ہیں ۔ آرسی سے مُراد آئینہ ہے۔ آئینہ رکھنے سے یہ مطلب ہے کہ دولہا دلہن ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ لیں۔ سُورۂ اخلاص سے غرض یہ ہے کہ میاں بیوی میں ہمیشہ اخلاص بنا رہے ؛

دیو اُٹھان ہندوؤں کی ایک رسم ہے جو کاتک سُدی اکادشی کو منائی جاتی ہے۔ وِشنُو ہندوؤں کے نزدیک چار مہینے سے اس تاریخ تک سوتے رہتے ہیں۔ ہندو اس تاریخ کو ایک معین جگہ لیپ پوت کر کھریا اور گیرو سے اس پر نقش ونگار بناتے ہیں ۔ اور وہاں پوجا کی چیزیں رکھ کر اُن کو ایک تھالی سے ڈھک دیتے ہیں۔ گھر کی کوئی عورت یا کوئی برہمنی ہاتھوں سے اس تھالی کو بجاتی جاتی ہے۔ اور یہ کہہ کر "اُٹھو دیو اُٹھو" وِشنو کی تعریف کے فقرے گاتی جاتی ہے ؛

سوئمبر ہندوؤں کی ایک قدیم رسم کا نام ہے۔ جب راجاؤں یا عالی خاندان کے لوگوں میں کسی لڑکی کے لئے بر درکار ہوتا تھا تو تمام راجاؤں اور امیروں کو پہلے سے اطلاع دی جاتی تھی ۔ تاریخ معین پر سب جمع ہو جاتے تھے۔ لڑکی بھرے جلسے میں آ کر شہزادوں اور امیر زادوں کے کرتب دیکھتی تھی۔ اور ان میں سے جس کو اپنا شوہر بنانا پسند کرتی تھی ، اُس کے گلے میں اپنے

ہاتھ سے پھولوں کا ہار ڈال دیتی تھی ؛

موچھوں کا کونڈا مسلمان عورتوں کی ایک رسم کی تلمیح ہے۔ جب کسی لڑکے کی مسیں بھیگتی ہیں، تو اس خوشی میں اس کی ماں حضرت خاتونِ جنّت کی نیاز دلواتی ہے۔ اور اس میں رشتے دار جمع کیے جاتے ہیں ؛

آمین ایک رسم ہے جو قرآن کے ختم ہونے یا اس کا کوئی حصّہ ختم ہونے پر ادا کی جاتی ہے۔ لڑکا جس مکتب میں قرآن کی تعلیم پاتا ہے، اُس کے تمام شاگرد اور اُستاد اس لڑکے کے مکان پر پہنچ کر ایک خاص نظم بہ آواز بلند پڑھتے ہیں۔ ایک لڑکا پڑھتا ہے۔ باقی سب لڑکے ہر شعر پر پکار پکار کر آمین کہتے جاتے ہیں۔ نظم پڑھنے کے بعد دُعا مانگی جاتی ہے۔ شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔ اور اُستاد کو لڑکے کے ماں باپ حسبِ توفیق نذر دیتے ہیں ؛

رت جگا ایک اور رسم ہے جو بیاہ۔ سالگرہ۔ بسم اللہ یا کسی اور تقریب پر منائی جاتی ہے۔ اِس موقعے پر عورتیں جمع ہوتی ہیں۔ اور رات بھر جاگتی ہیں۔ رات کو کڑھائی ہو کر دن کو گلگلوں اور رحم پر اوّل اللہ میاں کی سلامتی پڑھی جاتی ہے۔ پھر زردے یا خشکے پر حضرت فاطمہؓ کی نیاز دلوائی جاتی ہے ؛

مسلمان عورتوں میں شادی کے وقت ایک خاص رسم ہے جسے نو باتیں چبوانا کہتے ہیں۔ "نو بات" نبات سے بگڑا ہے۔ جس کے معنی ہیں مصری کی نو ڈلیاں۔ دُلہن کے دونوں مونڈھوں۔ کہنیوں۔ گھٹنوں۔ پیٹھ اور ہاتھوں پر رکھی جاتی ہیں۔ دولہا سے کہا جاتا ہے کہ اُن ڈلیوں کو ایک ایک کرکے مُنہ سے اُٹھاؤ اور ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ حقیقت میں ایک ٹوٹکا ہے جس سے غرض یہ ہے کہ دُولہا ہمیشہ دلہن کا فرمانبردار رہے ؛

تارے دکھانا ایک اور رسم ہے جو ایّامِ زچگی میں ادا کی جاتی ہے۔ زچہ کو رات کے وقت چھٹی کے روز دالان سے باہر لا کر تارے دکھاتے ہیں۔ دو عورتوں کے ہاتھ میں تلواریں ہوتی ہیں۔ اور وہ اس کے ساتھ محافظ بن کر آتی ہیں۔ زچّہ بچے کو گود میں اور قرآن شریف کو سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی ہے۔ اور سات تارے گنتی ہے۔ عورتوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے زچّہ کو جنّ یا پری کا خوف نہیں رہتا ؛

بیوی کی صحنک ایک اور رسم ہے۔ اکثر شادی یا کسی مُراد کے بر آنے پر عورتیں حضرت فاطمہؓ کی نیاز دلواتی ہیں۔ اس میں بڑی احتیاط کی جاتی ہے۔

سہاگن اور پارسا عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی عورت دو خاوند کر چکی ہو تو اس کو شریک نہیں کرتیں۔ بلکہ سیدانیوں کو اس نیاز کا کھانا کھلانا اولیٰ سمجھتی ہیں۔ جہانگیر کے زمانے سے یہ رسم جاری ہوئی تھی ؛

پھول ہونا ایک اور رسم ہے جو مرنے سے تیسرے دن ادا کی جاتی ہے ہندوؤں میں دستور ہے۔ مرنے سے تیسرے دن مُردے کی ہڈیاں جنہیں وہ پھول کہتے ہیں، چُنی جاتی اور دریائے گنگا میں بہائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں میں بھی تیسرے دن مردے کی فاتحہ ہوتی ہے۔ چنوں کے دانوں پر کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ کہ مُردے کی روح کو ثواب پہنچایا جائے۔ فاتحہ کے وقت کچھ ارگجا اور کچھ پھول لائے جاتے ہیں۔ سُورۂ فاتحہ پڑھ کر ہر ایک حاضر مجلس ارگجے کے پیالے میں پھول ڈالتا ہے۔ اور یہ پھُول اور خوشبو مُردے کی قبر پر بھیجی جاتی ہے ؛

ان کے علاوہ اور بھی رسمیں ہیں۔ مثلاً بسم اللہ۔ چھٹی۔ چوتھی۔ منگنی۔ ستوالنسا۔ مہندی۔ بری یا ساچق۔ چالیسواں وغیرہ ؛

چہارم۔ وہ تلمیحیں جن کی بنیاد فرضی قصّوں پر ہے :-

غتربود کرنا ایک محاورہ ہے جسے عام آدمی بولتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں، مطلب خبط کرنا، اس کا قصّہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک بے وقوف آدمی بوستان پڑھتا تھا۔ جب سعدیؒ کے اس شعر پر پہنچا ؎

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود　　در ایّام بو بکر بن سعد بود

تو اُس نے اُستاد سے پوچھا۔ غتربود کے کیا معنے ہیں ؟ بلاغت میں سے اس نے "بلا" کو جُدا کر کے دوسرے لفظ ربود سے ملا دیا اور غتربود کو ایک لفظ سمجھا ؛

ٹیڑھی کھیر کے معنی ہیں مشکل کام۔ کہتے ہیں کہ ایک اندھے سے کسی شخص نے پوچھا۔ حافظ جی ! کھیر کھاؤ گے ؟ اندھے نے کہا۔ کھیر کیسی ہوتی ہے ؟ اُس نے کہا۔ سفید۔ پوچھا۔ سفید کیسی ؟ کہا جیسے بگلا۔ اندھے نے کہا۔ بگلا کیسا ہوتا ہے ؟ اس نے ہاتھ ٹیڑھا کر کے دکھایا کہ ایسا۔ اندھے نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے ٹٹول کر کہا۔ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ہم سے نہیں کھائی جائیگی؛

چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی زمیندار کے ہاں بھینس کی چوری کی تھی۔ قاضی نے تمام مشتبہ آدمیوں کو جن میں چور بھی تھا سامنے کھڑا کر دیا پھر اپنے ایک پیادے سے کہا۔ میں

جس کی طرف اشارہ کروں تم اسے گرفتار کر لینا۔ پھر اس نے کہا۔ دیکھو! چور کی ڈاڑھی میں تنکا ہے۔ چور کے دل میں ڈبکا تھا ہی۔ اس نے فوراً اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ ڈالا۔ اور اس حرکت سے وہ شناخت ہو کر پکڑا گیا ؛

نیبو نچوڑ۔ بن بلائے مہمان کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک سرائے میں ایک مفت خور ٹھیرا ہوا تھا۔ اُس کا دستور تھا کہ جب کوئی مسافر کھانا کھانے بیٹھتا تو ایک نیبو لے کر دسترخوان پر پہنچ جاتا۔ مسافر کے آگے سالن دیکھ کر کہتا کہ حضرت! نیبو اس کا بناؤ ہے اس کو نچوڑ کر مزا دیکھیے۔ وہ بے چارہ مروّت میں آ کر اس کو بھی کھانے میں شریک کر لیتا ؛

طفیلی کا لفظ بھی اسی طرح پیدا ہوا ہے۔ طفیل کوفے کا ایک شاعر تھا۔ اُس کی عادت تھی کہ جب لوگوں کو کسی دعوت میں جاتے دیکھتا تو یہ بھی ان کے ساتھ ہو لیتا اور بے تکلف دعوت میں شریک ہو جاتا ؛

ناؤ میں خاک اُڑانا ایک محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں جھوٹا الزام لگانا کہتے ہیں کہ ایک شیر اور بکری دونوں کشتی میں سوار تھے۔ شیر نے اس کو کھانے کی نیّت سے کہا کہ تو کشتی میں کیوں خاک اُڑاتی ہے؟ اُس نے کہا۔ جناب! یہاں خاک کہاں ہے جسے میں اُڑاؤں۔ شیر نے غصّے میں آ کر کہا۔ تو ہماری بات کو جھٹلاتی ہے۔ دیکھ تو میں تیری گستاخی کا کیا مزا چکھاتا ہوں۔ یہ کہ کر اس پر حملہ کیا اور چیر پھاڑ کر اُسے کھا گیا ؛

نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ بے دریغ نیکی کر۔ اس بات کی پروا نہ کر کہ اس کا انعام بھی کچھ ملے گا یا نہیں۔ حاتم طائی کے قصّے میں لکھا ہے کہ ایک شخص دریا میں ہر روز دو روٹیاں ڈالا کرتا تھا۔ خدا نے اس کی محنت بھی ضائع نہیں کی۔ اس کا مفصل قصّہ حاتم طائی کے قصّے میں دیکھنا چاہیئے ؛

اُود بلاؤ کی ڈھیری اُس جھگڑے کو کہتے ہیں، جو کبھی فیصل نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ جب کئی اُود بلاؤ مل کر مچھلیاں پکڑتے ہیں تو دریا کے کنارے ڈھیر لگاتے جاتے ہیں۔ پھر ہر ایک کا حصّہ الگ الگ لگاتے ہیں۔ مگر کوئی نہ کوئی اُود بلاؤ اپنے حصّے کو کم سمجھ کر سارے حِصّوں کو گڈ مڈ کر دیتا ہے۔ پھر از سرِ نو حصّے لگائے جاتے ہیں اور اس تقسیم کا انجام بھی یہی ہوتا ہے۔ غرض کہ ان میں برابر جھگڑا ہوتا رہتا ہے اور کسی طرح فیصلہ ہونے میں نہیں آتا ؛

نمازی کا ٹکا اس ناشائستہ بات کو کہتے ہیں جس کا بدلہ کہیں نہ کہیں ضرور مل کر رہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شریر نماز پڑھنے میں لوگوں کی ٹانگیں گھسیٹ لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب سجدہ کرتے وقت اس نے کسی نمازی کی ٹانگ گھسیٹی تو اس نے ملامت کرنے کی بجائے سلام پھیر کر چکنے سے ایک ٹکہ اس کے حوالے کیا تاکہ یہ مزا پڑ جائے تو وہ کہیں نہ کہیں اس کی سزا بھی پائے۔ اُسے تو ٹکے کی چاٹ لگ ہی گئی تھی۔ اتفاق سے ایک جلاّد پٹھان کے ساتھ بھی یہی حرکت کی۔ اُس نے سلام پھیرتے ہی تلوار میان سے نکالی اور اُس شریر کی گردن اُڑا دی :

آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ بہت سا کام ہو چکا ہے تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک سوداگر بچّے کی دوستی کسی جادوگرنی سے تھی۔ وہ اس کی بیوی کے نام سے جلا کرتی تھی۔ ایک روز اُس نے جادو کی ایک پُڑیا سوداگر بچے کے گھر میں اس کی بیوی کو مارنے کو بھکوا دی۔ پڑیا بجائے اس کے۔ کہ اس نیک بخت بیوی کو کچھ ضرر پہنچائے، خود سوداگر بچّے کے بدن پر جا پڑی۔ اس کا پڑنا تھا کہ اس کے سارے تن بدن میں سوئیاں ٹھک گئیں۔ سوداگر بچّہ اس تکلیف کے مارے بے ہوش ہو گیا۔ بیوی نے صبح کی نماز پڑھ کر میاں کی یہ حالت دیکھی تو وہ فوراً سوئیاں نکالنے میں مشغول ہو گئی۔ ہاتھ سے سوئیاں نکالنے میں تکلیف ہونے لگی تو اس نے ہونٹوں سے نکالنی شروع کیں۔ تھوڑی سی سوئیاں نکالنی باقی تھیں کہ ظہر کا وقت آ گیا، اس نے باندی سے کہا کہ میں ظہر کی نماز پڑھتی ہوں۔ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ اب میری جگہ تو کام کر۔ باندی سوئیاں نکالنے لگی۔ بیوی ظہر کی نماز سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ سوئیاں سب نکال لی گئیں۔ سوداگر بچے کو ہوش آ گیا۔ اُس نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ تو بیوی اُس کے پاس نہ تھی۔ باندی اُس کی خدمت کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کو بیوی سے نفرت ہو گئی۔ اس نے باندی کو بیوی بنا لیا اور بیوی کو باندی کی خدمت پر مامور کر دیا :

بھیگی بلّی بتانا ایک تلمیحی محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بیجا عذر کرنا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص اپنے مکان کے دالان میں شب کے وقت پردے ڈالے سو رہا تھا۔ اسی دالان میں اس کا نوکر بھی ایک طرف پڑا تھا۔ نوکر کو اس

کے آقا نے کئی دفعہ کام کے لئے باہر بھیجنا چاہا۔ ہر دفعہ نوکر نیا عذر تراش کر بیان کر دیتا کہ اسے باہر نہ جانا پڑے۔ آخر میں آقا نے کہا (باہر آنگن میں بارش ہو رہی تھی)، ذرا باہر جا کر تو دیکھ، اب بارش تھم گئی یا ہو رہی ہے؟ نوکر نے جواب دیا، کہ ابھی بارش ہو رہی ہے۔ آقا نے پوچھا۔ تو نے کس طرح معلوم کیا؟ اس نے کہا۔ باہر سے بلی اندر آئی تھی۔ میں نے اس پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو وہ بھیگی ہوئی تھی ÷

جون پور کا قاضی محاورے میں احمق آدمی کو کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شہر کے کسی مکتب میں اس مکتب کا اُستاد اپنے ایک شاگرد پر خفا ہو رہا تھا۔ اثنائے خفگی میں اس نے کہا۔ نالائق! تو میرا احسان نہیں مانتا کہ میں نے تجھے گدھے سے آدمی بنایا۔ ایک کمہار نے جو اس مکتب کے قریب گزر رہا تھا یہ بات سُنی فوراً مکتب میں آیا اور اُستاد سے کہا کہ میرے پاس بھی ایک گدھا ہے۔ اگر آپ اُسے آدمی بنا دیں تو بڑا احسان ہو۔ اُستاد اس کی حماقت کو تاڑ گیا۔ اُس نے ہنسی کے طور پر کہا۔ اگر تم سو روپیہ دو اور اپنا گدھا میرے پاس چھوڑ جاؤ تو سال بھر کے بعد میں اس کو آدمی بنا دوں گا۔ کمہار اس شرط پر راضی ہو گیا۔ گدھا اُستاد صاحب کے پاس چھوڑ گیا اور سو روپیہ بھی دے گیا۔ سال بھر کے بعد آیا تو اُستاد اس گدھے کو فروخت کر کے دام کھرے کر چکے تھے۔ اس نے کہا میرا گدھا جسے آپ نے آدمی بنا دیا ہوگا واپس کیجئے۔ اُستاد صاحب نے کہا۔ میں نے اس کو آدمی ہی نہیں بنایا بلکہ لکھا پڑھا کر عالم بھی بنا دیا ہے۔ اب وہ جون پور میں قاضی کے عہدے پر مامور ہے۔ یہ سُن کر کمہار خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔ فوراً چھٹی، پلانا ہمراہ لے جون پور کو روانہ ہوا۔ قاضی صاحب عدالت کر رہے تھے۔ کوئی مقدمہ ان کے سامنے پیش ہو رہا تھا۔ کمہار ان کے سامنے ذرا دُور کھڑا ہو گیا۔ اور قاضی صاحب کو چھٹی پلانا دکھانے لگا تاکہ وہ اپنے مالک کو پہچان لیں اور اس کے پاس چلے آئیں۔ قاضی صاحب نے یہ عجیب حرکت دیکھی تو آدمی بھیج کر اس حرکت کا سبب دریافت کیا۔ کمہار نے سارا ماجرا اوّل سے آخر تک کہ سُنایا۔ جب قاضی صاحب کو یہ حال معلوم ہوا تو اس خیال سے کہ لوگوں میں اُس کی ہنسی نہ اُڑے، اس کو ایک معقول رقم دے کر ٹالا اور اس سے خدا خدا کر کے اپنا پیچھا چھڑایا ÷

شیخ چلّی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو دُور از کار منصوبے باندھے۔ یہ ایک فرضی شخص لوگوں نے گھڑ لیا ہے اور اس قسم کی تمام باتیں جو دُور از کار منصوبوں اور تجویزوں سے تعلق رکھتی ہیں اس کے نام کے ساتھ چپکا دی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ شیخ جی کو ایک شخص نے مزدوری پر لگایا۔ ایک ٹوکرے میں شیشے کے آلات بھر کر ان کو دیے کہ فلاں جگہ اس ٹوکرے کو پہنچا دو۔ شیخ جی نے رستے میں ایک جگہ ٹوکرے کو الگ رکھ کر سوچنا شروع کیا کہ آج جو مزدوری مجھے وصول ہوگی، اس سے ایک مُرغا اور ایک مُرغی خرید کرونگا۔ مرغی کو انڈوں پر بٹھاؤں گا۔ اس سے بہت سے بچّے حاصل ہوں گے۔ جب بہت سی مُرغیاں ہو جائیں گی تو ان کو بیچ کر ایک بکری اور ایک بکرا خرید کرونگا۔ اور اس کی نسل بڑھاؤں گا۔ بکریوں کا گلّہ جب بڑھ جائے گا۔ تو اس کو فروخت کرکے گائے لوں گا۔ گائے کی نسل اچھی طرح ترقی کرے گی۔ گایوں کا گلّہ بیچ کر بھینس لوں گا۔ جب بہت سی بھینسیں ہو جائیں گی، تو ان کی تجارت سے میں امیر کبیر ہو جاؤنگا۔ ایک بڑے گھرانے میں شادی کروں گا۔ بیوی ایسی تلاش کرونگا جو حسین ہو۔ میں اس کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھوں گا۔ اگر وہ نافرمانی کریگی تو میں اس کی کمر پر زور سے ایک لات اس طرح جڑوں گا۔ شیخ جی اس وقت غصّے میں تھے۔ خیالی بیوی کی جگہ آپ کی لات ٹوکرے پر پڑی۔ اور تمام شیشے چُور چُور ہو گئے۔

لال بجھکّڑ اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر بات کا جواب دینے اور ہر معاملے میں رائے دینے پر تیار رہتا ہو۔ اصل میں تو احمق ہو مگر اپنے تئیں سب سے زیادہ عقلمند خیال کرتا ہو۔ شیخ چلّی کی طرح لال بجھکّڑ بھی لوگوں نے ایک فرضی شخص تراش لیا ہے۔ اور اس قسم کی تمام رائیں جو حماقت پر مبنی ہوں اس کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جس گاؤں میں لال بجھکّڑ رہتا تھا، اُس کے رہنے والوں نے ہاتھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ ہاتھی اس گاؤں سے گزرا۔ اس کے پاؤں کے نشان زمین پر پڑے۔ گاؤں والوں نے ہاتھی کو تو نہیں دیکھا، اس کے پاؤں کے نشان ضرور دیکھے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ نشان زمین پر کیونکر ہو گئے؟ لال بجھکّڑ کو وہ نشان لا کر دکھائے۔ اور ان کی حقیقت دریافت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ "ارے بیوقوفو! میرے سوا

کوئی اس معمّے کو نہیں سمجھ سکتا۔ لو سُنو! ہرن چکی کے پاٹ چاروں پاؤں سے باندھ کر کُودا ہے اور اس سے یہ نشان زمین پر بنے ہیں۔" اسی طرح ایک دفعہ ایک لڑکا گھر کے ایک ستون کو ہاتھوں کے حلقے میں لئے کھڑا تھا۔ اس اثنا میں اس کا باپ باہر سے چنے چباتا ہُوا آیا۔ لڑکے نے اسی حالت میں اس سے چنے مانگے۔ باپ نے اس کی مٹھی میں چنے دے دیئے مگر اب یہ مشکل پیش آئی کہ ستون سے ہاتھ کیونکر نکالے۔ اگر ہاتھ جُدا کرے تو چنے زمین پر گریں گے۔ اور یہ اُسے منظور نہ تھا۔ لڑکا رونے لگا۔ باپ کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی۔ وہ دوڑا لال بجھکڑ کے پاس پہنچا، اور اس کو سارا ماجرا کہ سُنایا۔ اس نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ "بھلا میرے سوا کون اِس تدبیر کو بتا سکتا ہے۔ جاؤ گھر کی چھت کو اُدھیڑ ڈالو۔ ستون پر سے چھت ہٹ جائے گی تو لڑکے کو آسانی سے تم چھت پر کھینچ لوگے۔ مٹّھی سے چنے بھی گرنے نہ پائیں گے۔ اور لڑکا بھی صحیح سلامت ستون سے نکل آئے گا ؛

یک نہ شد دو شد۔ یہ ایک تلمیحی مثل ہے یہ اُس موقعہ پر بولی جاتی ہے جب کہ ایک عجیب امر کے بعد دوسرا عجیب امر واقع ہو۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو ایک ایسا منتر معلوم تھا کہ اس کے ذریعے سے وہ مُردے کو جگا سکتا اور اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ دوسرا ایک اور منتر بھی معلوم تھا کہ جس کے ذریعے سے وہ مُردے کو باتیں کرنے کے بعد پھر قبر میں سُلا دیتا تھا۔ اگر کسی مُردے کے گھر والوں کو راز کی کچھ باتیں مُردے سے پُوچھنی ہوتیں تو اس عامل سے جا کر التجا کرتے۔ وہ اپنے عمل سے مُردے کو جگا کر سب کچھ پوچھ دیتا۔ پھر اس کو دوبارہ سُلا دیتا۔ مرتے وقت اُس نے ایک شاگرد کو وہ دونوں منتر بتائے۔ شاگرد نے بطور آزمائش کے ایک قبر پر پہلا منتر پڑھا۔ مُردہ جاگ اُٹھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اور اس نے ہر سوال کا جواب دیا۔ مگر دوسرا منتر اتفاق سے یاد نہیں رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مُردہ اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اُس نے گھبرا کر اُستاد کو قبر سے اُٹھایا تاکہ وہ پہلے منتر کا اُتار دوبارہ بتلائے۔ مگر اس عالم میں وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ پہلے مُردے کی طرح یہ نیا مُردہ بھی اب اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس موقعہ پر بے ساختہ اُس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا۔ اس مثل کی طرح ایک اور فارسی تلمیحی مثل اُردو میں مستعمل ہے ؛

گربہ کشتن روزِ اوّل۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رُعب پہلے ہی دن جمانا چاہیئے۔ کہتے ہیں کہ دو دوستوں نے ایک ساتھ شادی کی دونوں کی بیویاں بدمزاج نکلیں۔ ایک کی بیوی خاوند پر غالب آئی۔ دوسرے کی نہایت فرمانبردار ثابت ہوئی۔ پہلے دوست نے دوسرے سے دریافت کیا کہ تم نے اپنی بدمزاج بیوی کو کس طرح مطیع کیا؟ اُس نے کہا۔ اوّل ہی روز جب ہم میاں بیوی کھانے پر بیٹھے تو ایک بلّی بھی دسترخوان پر آ بیٹھی۔ میں نے کہا چلی جا۔ وہ نہ گئی۔ تب میں نے فوراً اُٹھ کر اُسے مار ڈالا۔ اس واقعے سے میری بیوی پر میرا رعب چھا گیا۔ وہ ڈرنے لگی کہ جس نے ذرا سی بات نہ ماننے پر بلّی کو مار ڈالا، وہ خُدا جانے میرا کیا حال کرے گا۔ یہ سُن کر دوست نے بھی اس پر عمل کیا۔ مگر چونکہ اس کی بیوی اس کی عادت سے واقف ہو چکی تھی، اس لئے کچھ پیش نہ گئی۔ اس کا حال معلوم کر کے دوست نے کہا۔ "بھائی! گربہ کشتن روزِ اوّل بعد کا رُعب جمانا کام نہیں دیتا"۔

کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔ یہ بھی ایک تلمیحی مثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امیر غریب کی نسبت نہیں۔ مگر تقدیر کے نزدیک کوئی بات عجیب نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب راجہ بھوج پر مصیبت پڑی اور راج پاٹ چھن گیا تو وہ مارا مارا پھرتا تھا۔ ایک دفعہ مانگتا کھاتا ایک رانی کے پاس جا نکلا۔ ابھی وہ محل ہی میں تھا کہ ایک کاٹ کی مورتی رانی کا کھونٹی پر لٹکا ہوا ہار نگل گئی۔ رانی نے بھوج کو چور سمجھ کر راجہ کے پاس بھیج دیا۔ اس نے چوری کی سزا میں اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دِئے۔ وہ اسی بے چارگی کی حالت میں تھا کہ گنگا تیلی اُدھر آ نکلا۔ گھر میں اولاد نہ تھی۔ اس لنڈ منڈے کو غنیمت سمجھ کر اپنے گھر پر لے گیا۔ علاج کیا تو اچھّا ہو گیا۔ کولھو چلانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ ایک دن رات کو کولھو چلا رہا تھا اور دیپک راج گا رہا تھا۔ راجہ کی بیٹی نے اس وقت محل کا چراغ گل کرنے کا حکم دیا۔ مگر چراغ جب بُجھائے جاتے تو راگ کے سُروں کے اثر سے جل اُٹھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ گنگا تیلی کے گھر میں کوئی شخص دیپک راگ گا رہا ہے۔ صبح کو اس نے راجہ کے سر ہو کر شادی کا پیغام گنگا تیلی کے گھر بھجوایا چنانچہ شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد تقدیر سے ہاتھ پاؤں بھی نکل آئے۔ کاٹ کی مُورتی نے

بھی ہار اُگل دیا۔ راج پاٹ بھی دوبارہ نصیب ہوا۔ راج ملنے کے بعد راجہ بھوج نے گنگا تیلی کو ہمیشہ اپنا باپ سمجھا اور اُس کو مالامال کر دیا ؛

مضامینِ فرحت
از مرزا فرحت اللہ بیگ
کہانی

زندگی کے بس دو ہی پہلو ہیں۔ زندہ دِلی اور مُردہ دِلی۔ ایک وہ لوگ ہیں جو مصیبت میں بھی ہنستے ہیں دوسرے وہ ہیں جو خوشی میں بھی روتے ہیں۔ ایک مرنے کو جینا سمجھتے ہیں۔ اور دُوسرے جینے کو مرنا۔ زندگی کے انہی دونوں پہلوؤں نے کبھی مذہب کی شکل اختیار کی اور کبھی فلسفے کے مکتبوں کی صورت۔ غرض دُنیا بھر کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک روتی صورت دوسرے ہنستی صورت۔ کوئی انشاؔ بنا اور کوئی میرؔ ؛

پہلے زمانے کے لوگوں کا کیا کہنا۔ وہ تو بچّوں کو شروع ہی سے سکھاتے تھے کہ ہنستے کھیلتے عمر گزار دو۔ کہانیاں کہتے تھے تو ایسی کہ بچّوں کو زندہ دِلی سے محبت اور مُردہ دِلی سے نفرت ہو۔ پُرانے قصّے کہانیاں اب خود قصّے کہانیاں ہو گئیں۔ ان کو اس لئے چھوڑ بیٹھے کہ پُرانی ہر بات۔ فضول ہے۔ خیر کوئی سُنے یا نہ سُنے۔ میں تو ایک پُرانی وضع کی کہانی کہے دیتا ہوں۔ ذرا دیکھنا کس خوبی سے زندگی کے دونوں پہلو دکھا کر زندہ دِلی کی ترغیب دی ہے ؛

گرمی کا موسم ہے۔ چاندنی رات ہے۔ صحن میں پلنگ بچھے ہیں۔ کھانا وانا کھا کر سب ابھی لیٹے ہیں۔ ایک پلنگ پر دو لڑکیاں سعیدہ اور حمیدہ لیٹی کھسر پُسر کر رہی ہیں۔ دوسرے پلنگ پر ان کے دو چھوٹے بھائیوں احمد اور محمود میں کشتم کشتا ہو رہی ہے۔ ان کی والدہ تختوں پر جا نماز بچھائے عشاء کی نماز پڑھ رہی ہیں۔ ان کی نانی نے ابھی نماز سے فارغ ہو کر پاندان کھولا ہے۔ پاندان کی آواز سُنتے ہی احمد اور محمود لڑائی وڑائی چھوڑ پلنگ سے اُٹھے اور نانی سے آ کر لپٹ گئے۔ احمد نے کہا۔" نانی امّاں!

کہانی!" محمود نے کہا۔"نانی اماں کہانی!" یہ سُننا تھا کہ سعیدہ اور حمیدہ اُٹھ بیٹھیں۔ اور اُنھوں نے بھی نانی سے کہانی کا تقاضا کیا۔ بڑی بی بہت کچھ کہتی رہیں۔"ارے بھئی! میرے سر میں درد ہے۔ کل کہوں گی دیکھو غل نہ مچاؤ۔ تمہاری اماں کی نماز میں ہرج ہوتا ہے۔" مگر کون سُنتا تھا۔ آخر گھسیٹ گھساٹ بڑی بی کو پلنگ پر لا ہی بٹھایا۔ دو ایک پہلو میں لیٹ گئے دو دوسرے پہلو میں۔ اور اب بحث شروع ہوئی کہ کون سی کہانی کہی جائے۔ میاں محمود سب سے چھوٹے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ طوطا مینا کی کہانی کہو۔ لڑکیاں سر تھیں۔ کہ رانی کیتکی کا قصّہ سناؤ۔ بڑی بی پریشان تھیں کہ کون سی کہوں، کون سی نہ کہوں آخر کہنے لگیں۔"تم سوچنے تو دیتے ہی نہیں۔ کہوں تو کیا خاک کہوں۔" ذرا دم لو میں سوچ تو لوں۔" یہ سُن کر بچے چپ ہوگئے۔ بڑی بی نے دماغ پر ذرا زور ڈالا اور اس طرح کہنا شروع کیا:۔

"تو ہاں بھئی خُدا تمہارا بھلا کرے۔ ایک تھی بُڑھیا۔ بچاری کے ہاں ایک ہی بچّہ تھا۔ مصیبت کی ماری سارے دن سُوت کاتتی۔ شام کو جا گدڑی میں بیچ آتی دینا بنئے کے ہاں۔"

سعیدہ۔"نانی اماں! وہی دینا نا، جس کے ہاں سے ہمارا اناج آتا ہے؟"

احمد۔"نانی اماں! دینا۔ پودینہ۔ باجرے کی روٹی۔ ٹکا جہینہ۔"

بڑی بی نے بچّوں کو ڈانٹا کہ "نہ تم سُنتے ہو۔ نہ کہنے دیتے ہو۔ چلو جاؤ۔ اپنی اماں سے جا کر کہانی سُنو۔ وہ نماز پڑھ چُکی ہیں۔ مجھ سے سُننا ہے تو چُپکے لیٹے رہو۔"

خیر پھر اقرار مدار ہُوئے اور بڑی بی نے کہا۔"ہاں میں نے کہاں تک کہا تھا؟"

حمیدہ۔"دینا بنئے کے ہاں سے۔"

بڑی بی۔"ہاں دینا بنئے کے ہاں سے تھوڑی سی دال تھوڑا سا آٹا۔ تھوڑا سا نمک مرچ لاتی۔ پکاتی۔ خود کھاتی۔ بچّے کو کھلاتی۔ اسی طرح کئی برس گزر گئے۔ بچّہ خاصہ سیانا ہو گیا۔"

احمد۔"نانی اماں! سیانا کیا؟"

نانی: "سیانا یعنی بڑا ہوشیار"

میاں محمود جوش میں آکر اُٹھ بیٹھے اور کہا۔ "نانی امّاں! جیسے میں"۔ بہنوں نے میاں محمود کو پکڑ دھکڑ زبردستی لٹا دیا۔ اور پھر کہانی شروع ہوئی۔

نانی: "جب ذرا سیانا ہوا تو میاں جی کے پاس پڑھنے بٹھا دیا"

احمد۔ نانی امّاں! تختی پہ تختی۔ میاں جی کی آئی کم بختی"

نانی: "نا بیٹا! ایسی بُری باتیں نہیں کیا کرتے۔ مولوی صاحب باپ کے برابر ہوتے ہیں"

اِن کو بھی بھائی بہنوں نے زبردستی خاموش کیا اور کہانی کا پھر سلسلہ چھِڑا۔

نانی۔ "بھئی وہ لڑکا تو ایسا نکلا۔ ایسا نکلا کہ سبحان اللہ! تھوڑے ہی دنوں میں پڑھ پڑھا خاصا مولوی ہو گیا۔ عرضی پُرزہ کر کچہری میں دس پندرہ روپے کا نوکر بھی ہو گیا۔ اب بڑی بی کے دن پھرے۔ اچھے اچھے کھانے پکاتیں۔ اچھے اچھے کپڑے بناتیں۔ مزے سے دونوں ماں بیٹے رہتے۔ جب ہوتے ہوتے تھوڑا بہت روپیہ بھی جمع ہو گیا تو بڑی بی کو بچّے کی شادی کی سُوجھی ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک لڑکی چندے آفتاب چندے مہتاب بیاہ لائیں۔ بڑے چاؤ سے بہو کو گھر میں اُتارا۔ اچھے سے اچھا کھانا بہو کو کھلاتیں۔ اچھے سے اچھّا کپڑا پہناتیں۔ مگر بہو تھی کہ کوئی چیز اس کے بھاویں ہی نہ آتی تھی۔ جب تک گھونگھٹ رہا، اس وقت تک کسی نہ کسی طرح گُزرے گئی۔ گھونگھٹ اُٹھنا تھا کہ ساس پر مصیبت آگئی۔ زبان سے ہوتے ہوتے ہاتھ پر اُتر آئی۔ خود ہی بڑھیا کو مارتی اور خود ہی ٹسوے بہانے بیٹھ جاتی۔ خاوند سے وہ وہ لگائی بجھائی کی کہ ایک دن بیٹے نے بھی ماں کو خوب مارا"

حمیدہ اُچھل پڑی اور کہا۔ "اے ہے امّاں کو مارا۔ مُوئے کو بُڑھیا پر ہاتھ اُٹھاتے شرم بھی نہ آئی"

نانی۔ ہاں بیٹا! اچھی بیٹیاں ساس کو ماں کے برابر سمجھتی ہیں۔ نوج دُور پار! اگر شریفوں کی بیٹیاں ایسی باتیں کرنے لگیں تو پھر شریفوں اور چوہڑے چماروں میں کیا فرق رہ جائے۔ ہاں تو بیٹے نے مار پیٹ بُڑھیا کو گھر سے نکال دیا۔

محمود۔ "اور ہلدی چونا نہیں لگایا؟"

نانی۔ ہلدی چُونا لگانا ہوتا، تو مارتے ہی کیوں۔ تو خیر بچاری بڑھیا روتی رلاتی جنگل بیابان میں جہاں آدم نہ آدم زاد، ایک بڑ کے درخت کے نیچے جا بیٹھی اور لگی مُنہ ڈھانک کر رونے۔ خُدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ انہی دنوں میں جاڑا، گرمی، برسات میں جھگڑا ہوُا۔

جاڑا کہتا مَیں اچھّا۔ گرمی کہتی میں اچھی۔ برسات کہتی ہیں اچھی۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ چلو چل کر کسی آدم ناد سے پوچھیں۔ ان کا جو ادھر گزر ہوُا تو تینوں نے کہا: "لو بھئی وہ سامنے ایک بُڑھیا بیٹھی رو رہی ہے۔ چلو اس سے پُوچھیں۔"

سب سے پہلے میاں جاڑے آئے گوری گوری رنگت۔ گلے ایسے جیسے انار کا دانہ، سفید ڈاڑھی۔ موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔

حمیدہ۔ "نانی اماں! وہ کہاوت کیا ہے۔ دگلا سب سے اگلا"۔

نانی۔ "دگلہ سب سے اگلا۔ پہنو تو گرم۔ بچھاؤ تو نرم۔ باندھو تو بُغچی کا بھرم۔"

"تو ہاں موٹا سا روئی کا دگلہ پہنے۔ خوب اوڑھے لپیٹے آئے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑی بی کو تھرتھری چھوٹ گئی۔ میاں جاڑے نے آ کر کہا۔ "بڑی بی سلام"۔ بڑی بی نے کہا۔ "بیٹا جیتے رہو بال بچّے خوش رہیں۔ مگر بیٹا ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ مجھے تو تمہارے آنے سے کپکپی سی لگ گئی ہے"۔

خیر میاں جاڑے ذرا ہٹ کر کھڑے ہُوئے اور کہا۔ "بڑی بی! ایک بات پُوچھوں؟ بڑی بی نے کہا۔ "ہاں بیٹا! ضرور پوچھو"۔ میاں جاڑے نے کہا۔ "بڑی بی جاڑا کیسا ہے؟" بڑی بی نے کہا۔ "بیٹا! جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ! مہاوٹ برس رہے ہیں۔ دالانوں کے پردے پڑے ہیں۔ انگیٹھیاں سُلگ رہی ہیں لحافوں میں دبکے بیٹھے ہیں۔ چائیں بن رہی ہیں۔ خود پی رہے ہیں۔ دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ صبح ہوئی اور چنے والا آیا۔ گرم گرم چنے لئے۔ پہلے پھولے پھولے چنے کھائے پھر کُڑ کُڑ ٹھڈیاں چبا رہے ہیں۔ حلوا پوریاں اُڑ رہی ہیں۔ بچّے ہیں کہ جیبوں میں چبینا ڈالے پھرتے پھر رہے ہیں۔ کابل سے طرح طرح کے میوے آ رہے ہیں۔ سب مزے لے لے کر کھا رہے ہیں"۔

سعیدہ۔ نانی اماں! حلوا سوہن بن رہا ہے"۔

نانی۔ہاں حلوا سوہن بن رہا ہے۔ گاجر کی تری تیار ہو رہی ہے۔باجرے کا ملیدہ بن رہا ہے۔ رس کی کھیر پک رہی ہے۔اِدھر کھایا اُدھر ہضم۔ خون ہے کہ چلّوؤں بڑھ رہا ہے۔ چہرے سرخ سرخ ہو رہے ہیں۔ بیٹیا! جاڑا۔ جاڑے کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ!"

میاں جاڑے تھے کہ اپنی تعریفیں سُن سُن کر پھُولے نہ سماتے تھے۔ جب بڑی بی چپکی ہوئیں، تو میاں جاڑے نے کہا۔"بڑی بی! خُدا تم کو زندہ رکھے، تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ لو یہ ایک ہزار اشرفی کی تھیلی۔ خرچ ہو جائے تو اگلے جاڑے میں مجھ سے آکر اور لے جانا"۔

میاں جاڑے ہٹے اور بی گرمی مٹکتی ہوئی سامنے آئیں۔کوئی ۱۵-۱۶ برس کا سن۔ سُرخ سُرخ گال ان پر ہلکا ہلکا پسینہ۔ روشن آنکھیں۔لمبی کالی چوٹی۔ گلے میں موتیا کا کنٹھا۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں۔سر پر کرن ٹکی ہوئی۔ باریک ہوا ڈوریے کی پیازی اوڑھنی۔ غرض بڑی شان سے آئیں، اور آتے ہی کہا۔"نانی جان! سلام"۔ بڑی بی نے کہا۔"بیٹیا! جیتی رہو۔ بوڑھ سہاگن ہو۔ کہو۔تم بھی کچھ پوچھنے آئی ہو؟ ابھی تمہارے ابّا تو آکر پوچھ گئے ہیں"۔ بی گرمی نے کہا۔"نانی جان! وہ میرے ابّا نہیں۔ بڑے بھائی ہیں۔ ہاں تو میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ نانی جان! گرمی کیسی؟" بڑی بی نے کہا۔"بیٹا! گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ! دن کا وقت ہے۔خس خانوں میں پڑے ہیں۔ پنکھے جھلے جا رہے ہیں۔کٹورے پر کٹورا شربت کا اُڑ رہا ہے۔ بچّوں کے ہاتھوں میں ہزارے ہیں۔ ایک دوسرے پر چلا رہے ہیں۔ برف کی قلفیاں (قفلیاں) کھائی جا رہی ہیں۔فصل کے میوے آ رہے ہیں۔پتلی پتلی گنڈیریاں ہیں۔ لوکاٹ ہیں۔ آڑو ہیں"۔

حمیدہ۔"نانی امّاں! انگور ہیں۔ سیب ہیں"۔

نانی۔"واہ بھئی واہ! انگور اور سیب جاڑے میں ہوتے ہیں یا گرمی میں۔ تم جب بولتی ہو، بے تکی بولتی ہو۔ ہاں تو شام کو اُٹھے۔ نہائے۔ دھوئے۔ سفید سفید کپڑے پہنے۔ خس کا عطر ملا۔ گلے میں موتیا کے کنٹھے ہیں۔ ہاتھوں میں مولسری کی لڑیاں ہیں۔صحن میں چھڑکاؤ ہو گیا ہے۔ گھڑونچیوں پر کورے کورے مٹکے رکھے ہیں۔قلعی دار بجھیروں پر سوندھی صراحیاں جمی ہیں۔

گھڑوں اور صراحیوں کے مُنہ پر لال لال صافیاں لپٹی ہیں۔ ارد گرد کاغذی آبخورے لگے ہوئے ہیں۔ فالودے اور برف کا زور ہے۔ رات ہوئی۔ کوٹھوں پر پلنگ بچھ گئے۔ سفید سفید چادریں بچھی ہیں۔ اُوپر پھول بڑے ہوئے ہیں۔ خس کی پنکھیاں ہاتھوں میں ہیں۔ کوئی بھیگے ہوئے بان کے پلنگ پر لوٹ مار رہا ہے "۔

احمد۔ "نانی اماں! کہانیاں ہو رہی ہیں "۔

نانی۔ "ہاں! کہانیاں ہو رہی ہیں۔ لوگ ہیں کہ رات کو فالیز پر جا رہے ہیں۔ خربوزے، تربوز کھا رہے ہیں "۔

محمود۔ "کبڈّی ہو رہی ہے "۔

نانی۔ "ہاں کبڈّی ہو رہی ہے۔ ریتی میں لوٹ رہے ہیں۔ صبح نہائے دھوئے مزے مزے گھر آ گئے۔ بیٹا! گرمی۔ گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ "۔

بی گرمی کا یہ حال تھا کہ تعریفیں سُنتی جاتی تھیں، اور نہال ہوئی جاتی تھیں۔ جب بڑی بی تعریفیں کرتے کرتے تھک کر چُپ ہو گئیں تو بی گرمی نے، چپکے سے نکال کر ایک ہزار اشرفی کی تھیلی اُن کے ہاتھ میں دی اور کہا۔ "نانی جان! خدا تمہارا بھلا کرے آج تم نے میری لاج رکھ لی۔ ورنہ بڑے بھائی صاحب تو مارے طعنوں کے مجھے جینے بھی نہ دیتے۔ میں ہر سال آیا کرتی ہوں۔ جب آؤں، بے کھٹکے جو لینا ہو مجھ سے لے لیا کیجئے۔ بھلا آپ جیسے چاہنے والے مجھے کہاں ملتے ہیں "۔

بی گرمی ذرا ہٹی تھیں کہ برسات خانم چھم چھم کرتی آ پہنچیں۔ سانولا نمکین چہرہ۔ چمک دار، روشن آنکھیں۔ بھورے بال۔ ان میں سے پانی کی باریک باریک بوندیں اس طرح ٹپک رہی تھیں جیسے موتی۔ ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں جسم پر بادلہ ٹکا ہوا۔ آبی رنگ کا باریک دوپٹہ۔ غرض ان کے آتے ہی برکھا رُت چھا گئی۔ اُنھوں نے بڑھ کر کہا۔ "اماں جان! سلام"۔ بڑی بی نے کہا۔ "بیٹا! جیتی رہو۔ پیٹ ٹھنڈا رہے۔ ہو نہ ہو تم بھی بی گرمی کی بہن برسات خانم ہو "۔ بی برسات نے کہا۔ "جی ہاں! میں پوچھنے آئی ہوں کہ میں کیسی ہوں؟" بڑی بی نے کہا۔ "بی برسات! تمہارا کیا کہنا ہے۔ تم نہ ہو تو لوگ جئیں کیسے۔ مینہ چھم چھم برس رہا ہے۔ باغوں میں کھم گڑے ہیں۔ جھولے پڑے ہیں۔ عورتوں کے ہاتھوں میں مہندی رچی ہے۔ سُرخ سُرخ جوڑے دھانی چوڑیاں پہنے جھول

رہی ہیں کچھ جھلا رہی ہیں۔ ملار گائے جا رہے ہیں۔ ایک طرف کڑاہی چڑھی ہے۔ دوسری طرف پوری پراٹھے پک رہے ہیں۔ مرد ہیں کہ تیراکی کا میلہ دیکھنے گئے ہیں۔ لوگوں کے جمگھٹ ہیں۔ دریا چڑھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی طرح تیر رہا ہے۔ کوئی کسی طرح۔ اودی اودی گھٹائیں آئی ہوئی ہیں۔ پھوار پڑ رہی ہے۔ نوروز ہو رہے ہیں۔ حوضوں میں آم پڑے ہیں۔ آم کھا رہے ہیں۔ گٹھلیاں چل رہی ہیں۔ برسات۔ بھئی برسات کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ! بی برسات نے بھی ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بڑی بی کے نذر کی اور رخصت ہوئیں۔ شام ہوتی چلی تھی۔ بڑی بی تھیلیاں سمیٹ سماٹ خوشی خوشی گھر آئیں۔ ان کی بہو نے دیکھا کہ بڑھیا بسترا بغل میں دابے چلی آ رہی ہے۔ آگ بگولا ہو گئی۔ کہنے لگی "بڑھیا! تو میرے گھر میں کیوں گھسی؟ کیا اپنا کفن لے کر آئی ہے۔ اب نکلتی ہے یا دھکے دے کر نکالوں"۔ بڑھیا نے کہا۔ "بیٹا! خفا کیوں ہوتی ہے۔ میں خالی ہاتھ تھوڑی آئی ہوں۔ تین ہزار اشرفی لائی ہوں۔ نکالتی ہے نکال دے۔ میں اپنا الگ گھر لے کر رہ جاؤں گی"۔ بہو نے جو پوٹلی دیکھی اور تین ہزار اشرفی کا نام سنا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگی۔ "اماں جان! کیا سچ مچ تین ہزار اشرفیاں لائی ہو؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔ تم صبح سے کہاں چلی گئی تھیں؟ آپ کا انتظار کرتے کرتے خدا جھوٹ نہ بلائے، تو تین بجے کھانا کھایا ہے۔ وہ بھی آپ ہی کو ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں"۔ اتنے میں بیٹے صاحب بھی آ گئے۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بیوی نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اب کیا تھا تھیلیاں کھولی گئیں۔ کئی کئی دفعہ اشرفیاں گنی گئیں۔ دو سو نکال لیں۔ باقی گڑھا کھود کر دبا دیں۔ اوپر بیٹے بہو نے اپنا بستر کر دیا۔ رات ہی کو نانبائی کے ہاں سے اچھے سے اچھا کھانا، حلوائی کے ہاں سے اچھی سے اچھی مٹھائی آئی۔ سب نے مزے مزے سے کھائی۔ صبح ہوئی تو بیٹے صاحب جا اپنے اور بیوی کے لئے اچھے سے اچھے تھان لائے۔ کپڑے بننے شروع ہوئے۔ بڑی بی کے پیجاموں کے لئے آٹھ آنے گز والی چھینٹ۔ انگیا کرتی کے لئے چار آنے گز والی ململ۔ لال نری کی گول پنجے کی جوتی۔ سر میں ڈالنے کو دھوئی تلی کا تیل۔ کانوں کے لئے ملمع کی چار چار بالیاں۔ ہاتھوں کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ ماشے کے دو چھلّے۔ غرض بہت کچھ آیا۔ بہو اور بیٹا بہت خوش تھے کہ بڑھیا قارون کا خزانہ لے آئی۔ بڑھیا خوش تھی کہ بہو اور بیٹے

نے مان تو سمجھا۔ چلو سب ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔ بی ہمسائی نے جو یہ چہل پہل دیکھی تو ان سے نہ رہا گیا۔ ایک دن پوچھا۔ "بہن! میں ایک بات پوچھوں، بُرا تو نہ مانوگی؟" بُڑھیا کی بہو نے کہا۔ "شوق سے پوچھو۔ بُرا ماننے کی کون سی بات ہے؟" بی ہمسائی نے کہا۔ "بہن! آخر ہم سے بھی تو کہو کہ یہ تمھاری ساس کہاں سے روپیہ لے آئیں؟ کہیں ایسا ویسا تو نہیں ہے؟ بہن زمانہ بہت بُرا ہے اگر چوری کا نکلا تو بڑھیا کے ساتھ کہیں تم بھی لپیٹ میں نہ آجاؤ۔ حق ہمسایہ ماں کا جایا ہم کہے دیتے ہیں آگے تم جانو تمھارا کام جانے۔" بڑھیا کی بہو نے کہا۔ "نا بہن! یہ بڑھیا چوری کے قابل رہی ہے؟ اس کو تو یہ روپیہ جاڑے۔ گرمی۔ برسات نے دیا ہے۔" بی ہمسائی نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔ "اوئی بوا۔ اپنے ہوش کی دوا کرو۔ بھلا جاڑا گرمی۔ برسات کہیں روپئے بانٹتے پھرتے ہیں۔ تم نے مجھے دیوانہ سمجھا ہے؟ جو ایسی اڑان گھائیاں بتاتی ہو۔ بتاتی ہو بتاؤ۔ نہیں بتاتی نہ بتاؤ! ہمارا سمجھانے کا کام تھا۔ سمجھا دیا۔" بُڑھیا کی بہو ڈری کہ بی ہمسائی اِدھر اُدھر کچھ کی کچھ نہ لگاتی پھریں۔ ساس پر جو جو گزری تھی پوری سُنا دی۔ بی ہمسائی سُنتی رہیں۔ سب کچھ سن سنا کھڑکی بند کر اپنے میاں کے پاس پہنچیں اور ان کو سارا قصہ سُنا دیا۔

بیٹے صاحب نے جو سُنا تو کہا لاؤ ہم بھی لگے ہاتھوں اپنی بُڑھیا کے ذریعے سے روپیہ سمیٹ لیں۔ ان کی بھی ماں تھیں وہ بڑھیا کیا تھی آفت کی پُڑیا تھی۔ گھر بار کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ذرا بگڑی اور بہو کی سات پُشت کو تو م ڈالا۔ بہو نے کچھ کہا اور قیامت آگئی۔ بہو کو آج موقع ملا۔ میاں کو سمجھا بجھا کر بُڑھیا کی خوب کندی کرائی۔ اور ڈنڈا ڈولی کر جنگل میں اُسی بڑ کے نیچے ڈال آئے۔ بڑھیا نے چیخ چیخ کر سارا جنگل سر پر اٹھا لیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے کہ جاڑا۔ گرمی برسات تینوں اس دن پھر ملے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ "کہو بھئی! بڑھیا نے کیا تصفیہ کیا؟"

جاڑے نے کہا۔ "اُس نے مجھے اچھا بتایا۔" گرمی نے کہا۔ "مجھے اچھا بتایا۔" برسات نے کہا۔ "مجھے اچھا بتایا۔" جاڑے نے کہا۔ "بھئی! وہ بڑھیا آفت کی پرکالہ تھی۔ یہ نہیں بتایا کہ تینوں میں کون اچھا ہے۔ سب ہی کی تعریفیں کر مفت میں تین ہزار اشرفیاں مار لیں۔ غرض تینوں جلے بھُنے اُسی بڑھ کی

طرف آئے۔ دیکھا کہ ایک بڑھیا بیٹھی رو رہی ہے۔ پہلے میاں جاڑے پہنچے۔ ان کا آنا تھا کہ بڑھیا سردی سے تھر تھر کانپنے لگی۔ جاڑے نے کہا "بڑی بی! سلام۔ مزاج تو اچھا ہے؟" بڑھیا بولی "چل بڈھے! پرے ہٹ۔ بڑی بی ہوگی تیری میّا۔ اب جاتا ہے یا نہیں۔ خود تو روئی کا بنولہ بن کر آیا ہے اور اس جاڑے میں غریبوں کا مزاج پوچھتا ہے چل سامنے سے ہٹ۔ دھوپ چھوڑ۔" میاں جاڑے نے کہا۔ "بڑی بی! میں جاڑا ہوں۔ سچ بتانا میں کیسا ہوں؟" بڑی بی نے کہا "آپ اس بڑھاپے میں بھی اپنی تعریف چاہتے ہیں۔ لو اپنی تعریف سنو! آپ آئے۔ اس کو فالج ہوا۔ اس کو لقوہ ہوا۔ ہاتھ پاؤں پھٹے جا رہے ہیں۔ ناک سُر سُر بہ رہی ہے۔ دانت ہیں کہ کڑ کڑ بج رہے ہیں۔ کپڑے ادھر پہنے ادھر میلے ہوئے۔ رضائی ہے کہ لٹکتی پڑتی ہے۔ لحاف ذرا کھلا اور سر سے ہوا گھسی بچھونے ہیں کہ برف ہو رہے ہیں۔ کھانا اِدھر اُترا اُدھر جما۔ اور جو خدا نخواستہ مہاوٹوں میں کہیں اولے پڑ گئے تو غضب ہی ہو گیا۔ سی سی کر رہے ہیں۔ بتیسی بج رہی ہے۔ ناک معلوم ہوتا ہے کہ مُنہ پر ہے ہی نہیں۔ انگلیاں ہیں کہ ٹیڑھی ہوئی جاتی ہیں۔ آنکھوں سے پانی بہا جا رہا ہے۔ نہ کام ہو سکتا ہے نہ کاج۔ آخر کہاں تک کوئی آگ تاپے اور دھوپ سینکے۔ توبہ توبہ آگ کی بھی تو گرمی جاتی رہتی ہے۔ لیجئے اپنی تعریف سُنی یا اور سناؤں؟" جاڑا جلا ہُوا تو پہلے ہی کا تھا۔ اب جو بڑھیا کی یہ جلی کٹی باتیں سُنیں تو اور جل کر کوئلہ ہو گیا۔ اپنی ٹھوڑی پکڑ ڈاڑھی کی جو ہوا دی تو بڑھیا کو لقوہ ہو گیا۔ چلتے چلتے دو تین ٹھوکریں بھی رسید کر دیں۔ ذرا فاصلے پر بی گرمی اور بی برسات کھڑی تھیں۔ ان سے کہا۔ "لو جاؤ بڑھیا سے اپنا تصفیہ کرا لو۔ ہم تو ہار گئے"۔ بی گرمی خوشی خوشی بڑھیا کے پاس آئیں اور کہا۔ "نانی امّاں سلام۔ بڑھیا نے کہا "چل نگوڑی میں تیری نانی کیوں ہونے لگی۔ آج مجھے نانی بنایا ہے۔ کل کسی کو خصم بنالے گی۔ اے ہے تو ایسی جوان جان۔ اور جنگل جنگل پھر رہی ہے۔ آوارہ ہو گئی ہو جو ماں باپ نے گھر سے نکال دیا اور نکالا بھی ایک کڑے سے اچھا ہوا تم جیسے دلدّروں کے ساتھ ایسی ہی کرنی چاہیئے۔" بی گرمی نے کہا "نانی اماں! میں ہوں گرمی۔ تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ گرمی کیسی؟" یہ سُننا تھا کہ بڑھیا کے تو آگ لگ گئی۔ کہنے لگی "اوہو۔

جوتی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ۔ ابھی تمہارے بھائی صاحب اپنی تعریف سُن گئے ہیں۔ لو تم بھی سن جاؤ۔ گرمی! گرمی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ۔ واہ واہ! پسینہ بہ رہا ہے کپڑوں میں سے بُو آ رہی ہے۔ صُبح کپڑے بدلے۔ شام تک چیکٹ ہو گئے۔ کھانا کھایا ہے۔ کسی طرح ہضم نہیں ہوتا۔ سینے پر رکھا ہے۔ صبح ہوئی اور لُو چلنی شروع ہوئی۔ اس کو لُو لگی۔ اس کو ہیضہ ہوُا۔ مُنہ جھلسا جاتا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی ہے۔ پانی پیتے پیتے جی بیزار ہوُا جاتا ہے۔ پانی کیا! تھرڑے کا پانی ہے۔ سینے پر اونٹ رہا ہے۔ زمین آسمان تپ رہے ہیں۔ دن بھر آگ برستی ہے۔ نیند غائب ہے۔ نہ اس کروٹ چین آتا ہے نہ اُس کروٹ۔ پنکھا ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ذرا ہاتھ رُکا اور دم گھٹنے لگا۔ ذرا خدا خدا کرکے نیند آئی اور کھٹمل نے چٹکی لی آنکھ کھل گئی اور پھر وہی مصیبت۔ ہاں بیگم صاحب! کیوں نہ ہو۔ گرمی ہو۔ تمہاری جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چل دور ہو میرے سامنے سے۔ نہیں تو ایسی بے نقط سناؤنگی کہ تمام عمر یاد رکھیگی۔" بڑھیا کی باتیں سن کر بی گرمی تو آگ بگولا ہو گئیں۔ کہا "ٹھیر بڑھیا! دیکھ تجھے اس بد زبانی کا کیسا مزا چکھاتی ہوں۔ خبر نہیں مجھے تو کیا سمجھتی ہے۔" یہ کہ کر جو پھونک ماری تو ایسا معلوم ہوُا کہ لو لگ گئی۔ بڑھیا۔ تو "ہائے مری" کہتی رہی۔ بی گرمی پیٹھ پر ایک دوہتڑ مار چلتی بنیں۔

جب ان کو بھی رونکھی صورت بنائے آتے بی برسات نے دیکھا تو دل میں بہت خوش ہوئیں اور سمجھیں۔ چلو میں نے پالا مار لیا۔ بڑی مٹکتی مٹکاتی بڑھیا کے پاس گئیں اور کہا "نانی جان! سلام۔ کہئے مزاج تو اچھا ہے؟" بڑی بی نے کہا۔ "بابا! مار لو۔ مار لو۔ پھر مزاج پوچھنا۔ دو تو اپنے دل کی بھڑاس نکال گئے۔ تم کیوں لگی لپٹی رکھتی ہو۔ بے وارثہ سمجھ لیا ہے۔ جو آتا ہے مار جاتا ہے۔" بی برسات نے کہا "نانی جان! خدا نہ کرے۔ میں کیوں مارنے لگی۔ وہ تو دونوں موئے ایسے ہی ہیں۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے بچاری بڑی بی کا مار مار پلیتھن نکال دیا۔ نانی جان! آپ بے خوف رہیئے۔ میں ایسا بدلہ لونگی کہ وہ دونوں بھی تمام عمر یاد ہی کریںگے۔" یہ سُن کر ذرا بڑھیا کے حواس درست ہوئے آنکھ اُٹھا کر کیا دیکھتی ہے کہ ایک جوان لڑکی نہائی دھوئی آب رواں کا دوپٹہ اوڑھے سامنے کھڑی ہے۔ کہنے لگی "لڑکی! کیا دیوانی

ہے۔ جو اس طرح گیلے بالوں سے شام کے وقت جنگل میں آئی ہے اور تیرا کوئی والی وارث بھی ہے یا نہیں ؟ جو اس طرح اکیلی ماری ماری پھرتی ہے۔ جا اپنے گھر جا کر بیٹھ۔ کیوں باپ دادا کا نام بدنام کرتی ہے۔ جا جا دُور ہو۔ میں تجھ جیسی لچّی لفندریوں سے بات بھی کرنا نہیں چاہتی ۔

بی برسات نے کہا۔" نانی جان ! خفا کیوں ہوتی ہو۔ میں برسات ہوں۔ اچھا یہ تو بتا دو کہ برسات کیسی ؟" بڑھیا نے کہا برسات ! خدا نخواستہ آپ بھی تعریف کے قابل ہیں۔ اے ہے ! تم سے خدا بچائے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ کلیجہ دہلا جاتا ہے۔ دھما دھم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یہ مکان بیٹھا وہ پاکھا گرا۔ جو مکان گرنے سے بچ گیا۔ اس میں یہاں ٹپکا لگا۔ وہاں ٹپکا لگا۔ کبھی اِدھر کے بچھونے اُدھر بچھ رہے ہیں کبھی اُدھر کا پلنگ اِدھر آ رہا ہے۔ باہر نکلنا مشکل ہے۔ ذرا پاؤں باہر رکھا اور چھینٹے سر سے اُوپر گئے۔ سواری پاس سے نکل گئی۔ تو سب کپڑے چھینٹم چھینٹ ہو گئے۔ ذرا تیز چلے اور جوتیاں کیچڑ میں پھنس کر رہ گئیں۔ ہوا بند ہے۔ اُومس ہو رہی ہے۔ کپڑے ہیں کہ چپٹے جا رہے ہیں۔ رات کو مچھّر ہیں کہ کھائے جاتے ہیں۔ کھٹمل ہیں کہ کاٹے جا رہے ہیں۔ نہ رات کو نیند نہ دن کو چین۔ اور پھر اس پر یہ سوال کہ نانی جان ! میں کیسی ہوں ؟ نانی جان سے تعریف سن لی۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا ؟ اے ہے ! یہ بے موسم کی گرج کیسی۔ خدا خیر کرے "۔

بڑھیا یہ کہہ ہی رہی تھی کہ برسات کی نگاہ بجلی بن کر گری۔ اور بڑی بی کے پاؤں کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ ادھر بی برسات بڑھیا کو لنگڑا کر منہ پر تھوک کر رخصت ہوئیں اور ادھر ان کی بہو اور بیٹا اشرفیوں کی تھیلی کے شوق میں بڑ کے نیچے پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بڑی بی ہٹی کٹی لوتھ پوتھ پڑی ہیں۔ بڑی مشکل سے لاد لود کر گھر لائے۔ خوب ہلدی چونا تھوپا۔ مرہم پٹی کی۔ جب کہیں جا کر دس بارہ دن میں بڑھیا اس قابل ہوئی کہ اپنی کہانی بیان کرے۔ بہو اور بیٹے نے جو سُنا کہ بڑھیا نے جاڑے۔ گرمی۔ برسات کو بُرا بھلا سُنا کر اور اشرفیاں کھو کر جوتیاں کھائیں تو ان دونوں نے بھی اس کو خوب مارا اور گھر سے نکال دیا۔ اب بے چاری سڑک کے کنارے بیٹھی بھیک مانگا کرتی ہے۔ مگر ایسی ناک چڑھی کہ کوئی

بھیک بھی تو نہیں دیتا ؛
بیٹا! بات یہ ہے کہ اللہ شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے۔ جو لوگ خوش مزاج ہوتے ہیں۔ وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔ اور مُوئے رونی صورت تو ہمیشہ جوتیاں ہی کھاتے ہیں۔ اے ہے! ایلو! یہ احمد تو سو گیا ؛

گذشتہ لکھنؤ

از مولانا عبدالحلیم شرر

فنونِ سپہگری

سپہگری کے جن فنون کا نشو و نما دہلی میں اور دہلی کے بعد لکھنؤ میں ہوا۔ وہ دراصل تین مختلف قوموں سے نکلے تھے۔ اور تینوں کے امتزاج سے اُن میں مناسب ترقیاں ہوئی تھیں۔ اور حیرت کی یہ بات ہے کہ باوجود میل جول کے ان میں آخر تک اصلی امتیاز باقی تھا۔ بعض فن آریہ قوم کے سپہگری سے نکلے تھے۔ اور بعض خاص عربوں کے فن تھے۔ جو ایران میں ہوتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ لکھنؤ میں جن فنون کا رواج تھا اور جن کے باکمال اُستاد یہاں موجود تھے وہ حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) لکڑی (۲) پٹہ ہلانا (۳) بانک (۴) بنوٹ (۵) کشتی (۶) برچھا (۷) بانا (۸) تیراندازی (۹) کٹار (۱۰) جل بانک ؛

لکڑی

یہ اصلی فن جسے "پھنکیتی" کہتے ہیں۔ آریہ لوگوں کا تھا۔ جو ہندوستانی اور ایرانی دونوں ملکوں کے آریوں میں مروّج تھا۔ عربی فتوحات سے بعد ایران کی پھنکیتی پر عربی جنگجوئی کا اثر پڑ گیا۔ اور وہاں کی پھنکیتی بمقابل ہندوستان کے زیادہ ترقی کر گئی۔ ہندوستان میں آخر تک یہ دونوں فن اپنی ممتاز وضعوں میں باقی رہے۔ اور لکھنؤ میں دونوں اسکول قائم تھے۔ ایران کی عربی آمیز پھنکیتی یہاں 'علی مد' کے نام سے مشہور تھی۔ اور خالص ہندی پھنکیتی 'رستم خانی'

کے لقب سے یاد کی جاتی۔ علی مد میں پھنکیت کا بایاں قدم ایک مقام پر جما رہتا اور صرف داہنے پاؤں کو آگے پیچھے ہٹا کے پینترے بدلے جاتے۔ برخلاف اس کے رستم خانی میں پھنکیت پینترے بدلتے وقت داہنے بائیں اور آگے پیچھے۔ جس قدر چاہتا یا جگہ پاتا ہٹتا بڑھتا اور ناگہاں حریف پر آپڑتا۔ ایک یہ امتیاز بھی تھا کہ علی مد کا فن خاص رئیسوں اور شریفوں کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس کے اُستاد کبھی کسی رذیل یا ادنےٰ طبقے کے آدمی کو اپنا شاگرد نہ بناتے اور نہ اپنے فن سے واقف ہونے دیتے۔ بخلاف اس کے رستم خانی کا فن اجلاف اور ادنے طبقے کے لوگوں میں عام تھا ؛

علی مد کے ایک زبردست استاد فیض آباد میں شجاع الدّولہ بہادر اور ان کے بعد ان کی بیوہ بہو بیگم صاحبہ کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اُن کا ذکر تاریخ فیض آباد میں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے سب سے پہلے اُستاد وہی تھے۔ جو فیض آباد میں رہے اور پھر وارد لکھنؤ ہوئے۔ دوسرے اُستاد اسی فن کے محمد علی خاں تھے جو کٹڑہ بزن بیگ خاں میں رہتے تھے۔ اور علی مد کے موجد مانے جاتے۔ تیسرے اُستاد میر نجم الدین تھے جو شاہزادگان دہلی کے ساتھ پہلے بنارس میں گئے اور پھر وہاں سے لکھنؤ میں آئے اُن کا معمول تھا کہ صرف شریفوں کو شاگرد کرتے اور شاگرد کرتے وقت شاہزادوں سے دولت اور شریفوں سے صرف مٹھائی لینے اور اسے بجائے اس کے کہ اپنے کام میں لائیں۔ خود لے جا کے سادات نبی فاطمہؓ کی نذر کر دیتے۔ یہ نواب آصف الدّولہ کے عہد میں تھے۔ ایک بہت بڑے اُستاد میر عطا حسین تھے جو حکیم مہدی کے مخصوصین میں تھے۔ ایک اور اُستاد پٹے باز خاں تھے۔ جو اپنے کمال کے باعث غازی الدین حیدر کے زمانے میں علی مد کے موجد و بانی مشہور ہو گئے۔ ان کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نومسلم تھے۔ مگر وضع ان کی بھی یہی تھی کہ سوا شریفوں کے اپنا فن کبھی کسی ادنے طبقے کے آدمی کو نہیں بتایا۔ انھوں نے لکھنؤ میں اپنی یادگار ایک مسجد چھوڑی ہے۔ جو دھنیا مہری کے پل سے آگے عالم نگر کے قریب آج تک موجود ہے ؛

رستم خانی عوام میں رہی۔ اور اسی وجہ سے اس کو کوئی خصوصیت ہندو یا مسلمان کے ساتھ نہیں رہی۔ بلکہ اس کے صدہا استاد اودھ کے تمام گانوؤں اور قصبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم لکھنؤ میں یحییٰ خاں بن محمد صدیق خاں

نے جو کمال اور ناموری رستم خانی میں حاصل کی۔ کسی کو نہ نصیب ہو سکی۔
نواب فتحیاب خان عالی مرتبہ رئیسوں میں ہونے کے باوجود بڑے خوش نویس
بھی تھے۔ اور انھوں نے رستم خانی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ
کے ایک مشہور بانکے پہلوان میر لنگر باز بھی رستم خانی کے اُستاد تھے اور اب
تک تھوڑا بہت رواج باقی ہے تو ادنےٰ لوگوں میں۔ علی مد کا فن شرفا کے
ساتھ مخصوص تھا اور شرفا کو سپہگری سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ لہٰذا وہ فن
بھی مٹ گیا۔ رستم خانی ادنےٰ لوگوں میں تھی۔ اور وہ لوگ آج بھی لڑتے بھڑتے
رہتے ہیں۔ لہٰذا ان میں رستم خانی کا رواج اب تک موجود ہے ؎
علی مد کے دو ایک استاد میں نے مٹیا برج میں دیکھے تھے۔ اور سب
سے آخر میں میر فضل علی تھے۔ جو محلہ محمود نگر میں رہتے تھے ؎

پٹہ ہلانا

اس فن کی اصلی غرض یہ تھی کہ انسان دشمنوں کے نرغے میں پڑ جائے
تو لکڑی کے ہاتھ چاروں طرف پھینکتا ہوا سب کو ہٹا کے سب سے بچ کے
اور سب کو مارتا ہوا نکل جائے۔ پٹے کو ٹیک کے اُڑنا اس فن کا خاص
کمال تھا اور سب سے بڑی تعریف اس بات کی تھی کہ انسان پر ایک
ساتھ دس تیر بھی آ کے پڑیں تو ان کو کاٹ دے۔ یہ فن دہلی میں نہ تھا۔
لکھنؤ میں یورپ سے آیا۔ اور جلاہوں میں زیادہ مروّج تھا۔ اگرچہ آخر میں
بہت سے شرفا نے بھی خصوصاً قصبات کے شیخ زادوں نے اختیار کر لیا۔
غلام رسول خاں کا بیٹا گوری پٹے باز لکھنؤ میں اس فن کا سب سے بڑا
باکمال مانا جاتا تھا۔ جس کے صدہا واقعات عوام میں مشہور تھے۔ مگر افسوس!
اب یہ افسانے بھی موجودہ نسل کو بھولتے جاتے ہیں ؎
میر رستم علی کے سیفے میں دونوں طرف باڑھ ہوتی اور اسے ہلاتے ہوئے
سینکڑوں حریفوں کو چیر کے نکل جاتے۔ اسیوّن کے ایک شیخ زادے شیخ
محمد حسین دونوں ہاتھوں سے پٹہ ہلاتے۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے زمانے
میں ایک دن صاحب ریذیڈنٹ بہادر اور بعض یورپین مہمانوں نے اس فن
کے کسی صاحب کمال کا کمال دیکھنا چاہا۔ شیخ محمد حسین آ موجود ہوئے۔ چونکہ

اس وقت پٹہ ان کے پاس نہ تھا۔ شاہی اسلحہ خانے سے ایک پُر تکلّف مرصّع و مکلّل پٹہ دیا گیا۔ جسے لے کر انہوں نے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ ہر طرف تحسین کے نعرے بلند ہوئے۔ اور وہ اسی تحسین و مرحبا کے جوش میں پٹہ ہلاتے ہوئے مجمع سے نکل کر چلے گئے اور اپنے گھر پہنچے۔ اہلِ فن میں مشہور تھا کہ جو شخص پٹہ ہلانا جانتا ہے۔ وہ دس تلوار والوں کو بھی پاس نہ پہنچنے دے گا۔

اسی فن کے ایک صاحبِ کمال لکھنؤ میں میر ولایت علی ڈنڈا توڑ تھے۔ ان کی نسبت شہرت تھی کہ حریف کے ہاتھ میں کتنا ہی زبردست ڈنڈا ہو اُسے توڑ ڈالتے۔

بانک

فنونِ جنگ میں یہ بہت ہی اہم اور نہایت بکار آمد فن تھا اور اصولاً دوسرے فنون پر فوقیت رکھتا تھا۔ اور شریف زادے خاص کوشش اور خاص شوق سے اس فن کو سیکھتے۔ اصلی غرض اس فن کی چھریوں سے حریف کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ فن قدیم الایّام سے ہندوؤں میں بھی تھا اور عربوں میں بھی۔ مگر چھریاں دونوں کی جداگانہ ہوتی تھیں۔ ہندوؤں کی چھری سیدھی ہوتی۔ جس پر دونوں طرف باڑھ ہوتی اور عربوں کی چھری خمدار خنجر نما ہوتی۔ جس پر ایک ہی طرف باڑھ ہوتی۔ مگر عربوں کی آخری چھری جنبیہ ہے جس کی نوک سے کچھ دُور تک چاروں طرف چار باڑھیں ہوتی ہیں۔ اور اس سے ایسا چو پھانکا زخم پڑتا ہے کہ کہتے ہیں کہ اس میں ٹانکا لگانا مشکل ہوتا ہے۔ غرض اس حربے سے لڑنے کے فن کا نام بانک ہے۔ اس کی تعلیم یوں ہوتی ہے کہ استاد شاگرد دونوں آمنے سامنے دو زانو بیٹھتے ہیں۔ مگر ہندوؤں والی سیدھی چھری کی تعلیم میں قاعدہ تھا کہ دونوں مقابل دو زانو بیٹھنے کے ساتھ ایک گھٹنا کھڑا رکھتے۔ اور عربوں والی چھری کی تعلیم میں بالکل دو زانو بیٹھتے تھے۔ اور چوٹوں کے ساتھ بڑے زبردست پیچ ہوتے۔ جن کے آگے کشتی کے پیچوں کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ یہ فرق بھی بتایا جاتا ہے کہ عربوں کے فن میں اصلی سات چوٹیں تھیں۔ اور ہندوؤں کے فن میں نو۔ عربوں کی بانک میں پیچ پورا بندھ جاتا تو حریف کو زندہ چھوڑنا باندھنے والے کے

اختیار سے باہر ہو جاتا۔ اور ہندوستان والوں کے فن میں آخر تک اختیار میں رہتا کہ جب چاہیں پیچ کھول کے حریف کو بچا دیں ؛

اس فن میں صرف چوٹیں ہی نہیں ہیں۔ بلکہ بڑے بڑے زبردست پیچ ہیں۔ جن میں دونوں حریف گھنٹوں گتھے رہتے اور پے در پے پیچ کر کے ایک دوسرے کو باندھ کے زخمی کر دینے کی کوشش کرتے۔ اس فن کے پیچ اس قدر سچے اور حکمی اور اصول کے ساتھ تھے کہ کہا جاتا ہے کشتی اور لکڑی کے تمام پیچ بانک ہی سے نکلے ہیں۔ بانک کے اُستادوں میں مشہور تھا کہ بانک لیٹ کے پوری ہوتی ہے۔ بیٹھ کے آدھی رہتی اور کھڑے ہو کے صرف چوتھائی رہ جاتی ہے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بنکیت کا کام صرف یہ ہے کہ حریف کو چھری سے زخمی کر دے۔ نہیں! اس کا اصلی کام یہ ہے کہ حریف کو زندہ باندھ لے اور بے بس کر کے گرفتار کر لائے ؛

ایک یہ خاص بات بھی تھی کہ بانک والا اپنے فن کو حتّی الامکان مخفی رکھتا۔ اس کی وضع قطع اور طور طریق کسی بات سے نہ پہچانا جاتا کہ وہ سپہگر ہے۔ بنکیت عام ثقہ شریفوں کی وضع رکھتے۔ کفشیں پہنتے۔ کوئی ہتھیار نہ باندھتے۔ حتّٰی کہ ان میں لوہے کے قلمتراش یا سوئی تک کے پاس رکھنے کی قسم تھی۔ صرف ایک رومال رکھتے اور اس کے ایک کونے میں لوہے کا چنا بندھا رہتا۔ بس یہی حربہ ضرورت کے وقت انہیں کام دے جاتا۔ یا اس سے بھی زیادہ تہذیب برتتے تو ہاتھ میں تسبیح رکھتے اور اس میں لوہے کا بھدّا سا قبلہ نما لگا ہوتا۔ بس یہی حربہ ان کے لئے کافی تھا ؛

ہندوؤں میں قدیم الایّام سے یہ فن خاص برہمنوں میں تھا۔ راجپوت نہیں جانتے تھے۔ نہ برہمن انہیں سکھاتے اور نہ وہ اپنی وضع کے خلاف تصوّر کر کے اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے۔ جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ بنکیت ہونے کے لئے ثقاہت شرط تھی۔ اور راجپوت کھلے سپاہی تھے۔ برہمن بنکیت قبلہ نما یا لوہے کے چنے کے عوض ایک کُنجی رکھتے جو جنیؤ میں بندھی رہتی۔ اور اس سے کام لے کے نہایت ہی تہذیب و متانت کے ساتھ دشمن کا کام تمام کر دیتے۔ شاہزادہ مرزا ہمایوں قدر بہادر فرماتے ہیں۔ کہ لکھنؤ میں یہ فن شاہ عالم کے زمانے میں اس وقت آیا۔ جب مرزا خرّم بخت بہادر بنارس

آئے اور اس فن کے دو ایک باکمال اپنے ساتھ لائے۔ لیکن ہمیں معتبر ذریعے سے اور تاریخ فیض آباد کے دیکھنے سے معلوم ہوُا کہ اس فن کے باکمال منصور علی خاں بنکیت شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں آ گئے تھے۔

نواب آصف الدّولہ کے عہد میں بانک کے استاد لکھنؤ میں شیخ نجم الدّین تھے۔ اُسی قریب زمانے میں بانک کے ایک دوسرے اُستاد لکھنؤ میں موجود تھے۔ جو میر بہادر علی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کو دعویٰ تھا کہ پلنگ کے نیچے جنگلی کبوتر چھوڑ دیجیے۔ اور تماشا دیکھیے کسی طرف سے نکل کے اڑ جائے تو جانیے کہ میں بنکیت نہیں۔ انہیں پر منحصر نہیں۔ بانک کی یہی تعریف ہے۔ اور ہر اُستاد اس کا دعوے کر سکتا تھا۔ لکھنؤ میں ایک تیسرے استاد ولی محمد خاں تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں شیخ نجم الدین کے شاگرد کے شاگرد میر عباس کا نام مشہور تھا اور ان کے چار شاگرد نامور ہوئے۔ جن میں سے ایک تو ڈاکو تھا۔ باقی تین مہذب شرفا تھے۔ اس فن کے آخری استاد میر جعفر علی تھے۔ جو لکھنؤ کی تباہی کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج میں پہنچے۔ انہیں میں نے دیکھا تھا۔ اور بچپن میں میں خود اُن کا شاگرد ہوُا تھا۔ مگر دو ایک مہینے سیکھ کے چھوڑ دیا۔ اور جو کچھ سیکھا تھا۔ خواب و خیال سا رہ گیا۔ اب نہیں جانتا کہ کوئی جاننے والا بھی باقی ہے یا نہیں۔

بنوٹ

اس فن کی اصلی غرض یہ ہے کہ حریف کے ہاتھ سے تلوار لٹھ یا کوئی حربہ ہو گرا دے۔ اور ایک رومال سے جس میں پیسہ بندھا ہوُا کرتا ہے یا اپنے ہاتھ ہی سے حریف کو ایسا صدمہ پہنچائے کہ اس کا کام تمام ہو جائے۔ اس فن کی نسبت لکھنؤ میں ابتدا سے مشہور تھا کہ اس کے بڑے بڑے زبردست استاد حیدر آباد دکن میں ہیں۔ اور وہاں جلنے اور دریافت کرنے سے معلوم ہوُا کہ واقعی وہاں اب تک یہ فن ایک حد تک زندہ ہے۔ واقف کار لوگوں کا بیان ہے کہ کھڑے ہو کے مقابلہ کرنے والا صاحب فن اگر نہتّا ہے تو کشتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں چھری ہے۔ تو بانک ہے۔ اور اگر کوئی دو گز کا لمبا سونٹا یا رومال اس کے ہاتھ میں ہے تو بنوٹ ہے۔

بنوٹ والے بھی اپنے فن کو مخفی رکھتے ہیں اور باہمی عہد ہے کہ صرف شریف کو سکھلائیں گے۔ اور اس سے عہد لے لیتے ہیں کہ کبھی کسی زیردست یا بے آزار آدمی پر حربہ نہ کریں گے۔ بنوٹ والوں کے پینترے جنہیں وہ پاؤلے کہتے ہیں بہت ہی اعلےٰ درجے کا پھرتیلا پن اور بے انتہا صفائی چاہتے ہیں۔ جو زیادہ عمر والوں کو نہیں حاصل ہو سکتے۔ اس کے علاوہ بنوٹ والوں کو جسم انسانی کے تمام رگ پٹھوں کا پورا علم ہوتا ہے اور خوب واقف ہوتے ہیں کہ کس مقام پر صرف انگلی سے دبا دینا یا ایک معمولی چوٹ انسان کو بیتاب و بیدم کر دے گی۔ اگرچہ اس فن کے لئے حیدرآباد مشہور تھا۔ مگر لکھنؤ میں بھی اس کے بہت باکمال موجود تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے محمد ابراہیم خاں رام پور سے لائے تھے۔ طالب شیر خاں یہاں ایک بڑے زبردست بانکے تھے اور تلوار کے دھنی۔ انہوں نے جو ابراہیم خاں کا دعوےٰ سنا تو تلوار لے کے مقابلے کو تیار ہو گئے۔ محمد ابراہیم خان نے بھی مقابلہ منظور کر لیا۔ طالب شیر خاں نے جیسے ہی تلوار ماری۔ محمد ابراہیم خاں نے اپنا رومال جس کے کونے میں پیسہ بندھا ہوا تھا۔ کچھ ایسی خوبی سے مارا کہ طالب شیر خاں کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کے چھن سے دُور جا گری۔ منہ دیکھ کے رہ گئے اور سب نے محمد ابراہیم خاں کی اُستادی کا اعتراف کر لیا۔

اس کے بعد لکھنؤ میں آخر تک یہ فن رہا۔ یہاں تک کہ مٹیا برج میں بھی محمد مہدی نام ایک شخص جو نواب معشوق محل کے وہاں کے داروغہ تھے۔ بنوٹ کے باکمال استاد مانے جاتے تھے۔

کشتی

یہ فن خاص آریوں کا تھا۔ ہندوستان میں بھی اور ایران میں بھی۔ عرب اور تُرک اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں میں بھی جو آریہ لوگوں سے پہلے کے تھے۔ اس فن کا پتہ نہیں چلتا۔ لکھنؤ میں پیچوں اور حریف کے زیر کرنے کے طریقوں کا بہت نشو و نما ہوا۔ مگر کشتی کا اصلی دار و مدار جسمانی قوت پر ہے۔ اور قوت میں لکھنؤ والے لاکھ کوشش

کریں۔ مشرقی ممالک خاصۃً پنجاب کے لوگوں کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا کو قدرت نے یہ صلاحیت ہی نہیں دی ہے کہ اس کی خاک سے غلام وغیرہ کے ایسے ہیلتن پہلوان پیدا ہوں اس لئے لکھنؤ کا کشتی کا فن صرف پھبتی کا کمال دکھانا تھا۔ جس میں زیادہ سے زیادہ اپنے سے ڈونے پر غلبہ حاصل ہو جاتا مگر اس سے زیادہ طاقت والے کو زیر کرنا غیر ممکن تھا۔ لکھنؤ کے اکھاڑوں اور اگلے پہلوانوں کے قصے بہت مشہور ہیں مگر سب پھبتی کے لحاظ سے نہ زور آوری کے اعتبار سے ایک بار میں نے یہاں کے مشہور پہلوان سید کی لڑائی ایک ڈونے قد کے پنجابی پہلوان سے دیکھی۔ اس میں شک نہیں کہ سید کی لڑائی ابتدا سے نہایت خوبصورت تھی۔ اُس کی چلت پھرت اور اس کا پھرتیلا پن قابلِ تعریف تھا۔ مگر انجام یہ ہوُا کہ گھنٹے بھر میں سید پسینے میں ڈوبا ہوُا تھا۔ طاقت جواب دے چکی تھی اور دم پھول گیا تھا اور پنجابی پہلوان پر جو اُسے کھلا رہا تھا کچھ اثر نہ ہوُا تھا۔ آخر سید خود ہی میدان چھوڑ کے بھاگ گیا اور بے لڑے ہار مان لی؛

برچھا نیزہ

جنگجوئی کا یہ پرانا فن ہے۔ جو آریوں۔ ترکوں اور عربوں سب میں تھا۔ عربوں کا برچھا لمبا ہوتا۔ اور اس کا پھل تکُنا۔ ترکوں کا برچھا چھوٹا ہوتا اور پھل گول نوکدار یعنی مخروطی اور ہندوستان کے آریوں کا برچھا لمبا ہوتا۔ مگر اس کا پھل پتلا باڑھ دار پان کی قطع کا۔ اور تعجب یہ ہے کہ تینوں طرح کے نیزے لکھنؤ میں موجود تھے۔ بڑے برچھے پانچ گز کے لمبے ہوتے۔ اور چھوٹے برچھے تین گز کے۔ بڑے برچھے کی یہ تعریف تھی کہ خوب لچکے۔ یہاں تک کہ دہرا ہو جائے۔ اور چھوٹے کی یہ تعریف تھی کہ اس میں نام کو بھی لچک نہ ہو۔ اور اسی مناسبت سے دونوں کے چلانے کے فن جدا جدا تھے۔ لکھنؤ کے مشہور اور اصلی برچھیت میر کلّو تھے۔ جن کا نام برہان الملک کے زمانے ہی میں چمک گیا تھا۔ اُن کے بعد میر اکبر علی برچھیت مشہور ہوئے۔ پھر بریلی اور رام پور سے اکثر برچھیت آنا شروع ہو گئے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں بادشاہ کو ہاتھیوں کے شکار کا شوق ہوُا تو برچھے کا فن جاننے والوں کی

بڑی قدر ہوئی۔ اور لڑائیوں میں یہی حربہ زیادہ کام دینے لگا۔ یہ قدیم حربہ جس سے بڑی بڑی پرانی قوموں نے ناموری پیدا کی تھی۔ لکھنؤ میں اصلی یا نقلی طور پر آج بھی کثرت سے باقی ہے۔ مگر صرف براتوں کے جلوس کا کام دیتا ہے ؛

بانا

یہ فن بھی ادنےٰ درجے کے لوگوں میں تھا اور کسی حد تک اب بھی باقی ہے۔ لٹھ کی لڑائی کے ہاتھ اور نذدیں اسی سے نکلی ہیں۔ غرض اور غایت ہلانے کی بھی یہ ہے کہ بانا یا لٹھ چلاتا ہؤا انسان دشمنوں کے نرغے میں سے نکل جائے۔ بانا ایک لمبی لکڑی کا نام تھا۔ جس کے ایک طرف لٹّو ہوتا۔ اور بعض دونوں طرف لٹّو رکھتے۔ اور اس طرح ہلاتے کہ کوئی قریب نہ آسکتا۔ بعض لوگ لٹّوؤں میں کپڑا باندھ کے اور تیل میں ڈبو کے انہیں روشن کرتے اور اس طرح ہلاتے کہ اپنے اوپر آگ کا مطلق اثر نہ ہو اور دشمن آگ کی وجہ سے دور ہی دور رہے ؛

تیر اندازی

یہ دُنیا کی تمام جنگجو قوموں کا پرانا حربہ ہے۔ جس میں بڑے بڑے کمالات دکھائے جاتے۔ اور شریف و رذیل سب اس کی تعلیم لازمی سمجھتے۔ یہی حربہ ہے۔ جس سے راجہ رامچندر جی اور ان کے بھائی لچھمن جی نے راون اور اس کے ایسے کوہ پیکر حریفوں کو مار کے گرا دیا۔ اگرچہ بندوق کی ایجاد نے اس کا زور کم کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی سپہگری کا اعلیٰ جوہر تیراندازی سمجھی جاتی۔ کمانیں اتنی کڑی رکھی جاتیں کہ ان کا چلّہ کھینچنا ہر ایک کے لئے آسان نہ تھا۔ بلکہ جس کی کمان جتنی زیادہ کڑی ہوتی۔ اسی قدر زیادہ اس کا تیر دور جاتا۔ اور کاری ہوتا۔ عربوں نے اپنی فتوحات کے زمانے میں تیراندازی کے ایسے ایسے کمالات دکھلائے ہیں جو حیرت انگیز ہیں۔ اُمّ ابان نام دس پانچ ہی روز کی بیاہی ہوئی ایک عربیہ دُلہن نے فتح دمشق کے موقع پر اپنے شہید دولہا کے انتقام میں ایسے زبردست تیر برسائے کہ پہلے نے دشمنوں کے علمبردار کو مار کے گرایا: اور دوسرا دشمنوں کے بہادر سردار ٹامس کی آنکھ میں اس

طرح پیوست ہو گیا کہ کسی کے نکالے نہ نکل سکا۔ اور آخر گانسی کاٹ کے آنکھ ہی میں چھوڑ دی گئی ؛

اودھ کے 'پاسی' اور 'بھر' اس فن کو پہلے سے بخوبی جانتے تھے۔ پھر نئے نئے اُستاد دہلی سے آئے۔ اور آصف الدّولہ کے عہد میں اُستاد فیض بخش نے بادشاہ کے اشارے سے مرزا حیدر کے والد کو جو ہاتھی پر سوار آ رہے تھے ایسی پھُرتی سے تیر مارا کہ نہ کسی نے ان کو نشانہ بازی کرتے دیکھا اور نہ انہیں خبر ہوئی۔ حالانکہ تیر پٹکے کو توڑ کے نکل گیا تھا وہ آخر تک بے خبر رہے۔ گھر پہنچ کے پٹکہ کھولا تو وہ خون آلود تھا اور ساتھ ہی زخم سے خون کا فوارہ چھوٹا اور دم بھر میں مر گئے ؛

اس کی تعلیم کا طریقہ بھی مشکل تھا مگر اب یہ فن دنیا کی تمام متمدّن قوموں میں فنا ہو گیا۔ اس لئے کہ موجودہ آتشباز اسلحہ نے اسے بالکل بے کار کر دیا ہے۔ مگر ہندوستان کی وحشی قوموں میں آج تک باقی ہے۔ جو شکار اور درندوں کے مارنے میں عموماً اور کبھی کبھی باہمی جنگ و پیکار میں بھی تیروں سے کام لیا کرتی ہیں ؛

کٹار

یہ خاص آریہ قوم کا پرانا حربہ تھا۔ اور آخر میں اس سے زیادہ تر چور اور قزّاق کام لیتے۔ اس سے حریف پر ٹوک کے حملہ نہ کیا جاتا۔ بلکہ اُسے غافل رکھ کے حملہ کیا جاتا۔ اسی وجہ سے غالباً دہلی میں بھی اور خاصتہً لکھنؤ میں شرفا نے اس سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ کٹار سب باندھتے مگر اس سے لڑنا اور حربہ کرنا کوئی نہ جانتا تھا۔ اس سے حربہ کرنے کی تعریف یہ تھی کہ جب چاہیں تو حربہ کریں مگر دشمن کے جسم میں کہیں خراش بھی نہ آئے۔ اور جب چاہیں تو قبضے تک پار ہو جائے۔ اس سے چور اکثر راتوں کو غافل اور سوتے حریف پر حملہ کرتے اور چھپ کے اس کا کام تمام کر آتے ؛

جل بانک

یہ وہی بانک کا مذکورہ فن تھا جو پیراکی اور شناوری سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گہرے پانی میں دشمن پر قابو حاصل کریں اور اسے

باندھ لائیں یا پانی ہی میں اس کا کام تمام کر دیں۔ تاریخ میں اور کسی جگہ اس کا تذکرہ نہیں۔ مگر لکھنؤ میں پیرنے کے ایک اُستاد میرک جان نے اسے ایجاد کیا۔ اور سیکڑوں شاگردوں کو سکھایا۔ بادی النّظر میں اس کی ایجاد لکھنؤ ہی میں ہوئی اور آج بھی پیراکی کے بعض یہیں کے استاد جانتے ہیں۔ اور کہیں اِس فن کا نام و نشان بھی نہیں ؛

توبۃ النّصوح

از مولانا نذیر احمد دہلوی

نصوح اور منجھلے بیٹے علیم کی گفتگو

باپ۔ ہمدردی شرطِ انسانیت ہے ؎

درد دِل کے واسطے پیدا کیا اِنسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

لیکن میں تم سے سننا چاہتا ہوں کہ تم اس فرض کی تعمیل کہاں تک کرتے ہو؟

بیٹا۔ جناب! شاید اگر میں اس کو ہمدردی کہ سکوں تو مدرسے کا جو لڑکا مجھ سے کچھ پوچھنا یا پڑھنا چاہتا ہے۔ میں اس میں مطلق دریغ نہیں کرتا۔ گو میرا ذاتی ہرج بھی ہوتا ہو۔ امتحان سالانہ میں مجھ کو نقد روپے انعام ملے تھے۔ میں نے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کیا۔ محلّے میں چند آدمی رہتے ہیں۔ جن کو میں محتاج سمجھتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً ان کو اس میں سے دیتا رہا۔ بلکہ ایک مرتبہ میں ایک آفت میں مبتلا ہو گیا تھا؛

باپ۔ وہ کیا؟

بیٹا۔ ایک مرتبہ عید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی مجھ کو امّاں جان نے بنا دی تھی۔ وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے میں خالہ جان کے یہاں جاتا تھا بیاباں مسکین کے کوچے میں پہنچا تو بہت سے چپڑاسی پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے اور بہت سے تماشائی بھی وہاں جمع تھے۔ یہ دیکھ کر میں بھی لوگوں میں

جا گھسا۔ تو معلوم ہؤا کہ ایک غریب نہایت بوڑھی سی عورت ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہیں۔ سرکاری پیادے اس کے میاں کو پکڑے لئے جاتے تھے۔ اس واسطے کہ اس نے کسی بنئے کے یہاں سے ادھار کھایا تھا اور بنئے نے اس پر ڈگری جاری کرا لی تھی۔ وہ مرد مانتا تھا کہ قرضہ واجب ہے۔ مگر کہتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس وقت بالکل تہیدست ہوں۔ ہر چند اس بچارے نے بنئے کی اور سرکاری پیادوں کی بہتیری ہی خوشامد کی مگر نہ بنیا مانتا تھا۔ نہ پیادے باز آتے تھے اور پکڑنے لئے جاتے تھے اور لوگ جو وہاں کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی کہا۔ "لالہ! جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا۔ دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ۔" تو بنیا بولا۔ "اچھی کہی میاں جی اچھی کہی! برسوں کا لہنا اور روج کی ٹال مٹول۔ بھگوان جانے ابھی تو کھاں ساھب کی اِجّت اترولئے دیتا ہوں۔" وہ شخص جس پر ڈگری جاری تھی۔ غریب تو تھا لیکن غیرت مند بھی تھا۔ بنئے نے جو عزّت اتروانے کا نام لیا۔ سُرخ ہو گیا گھر میں گھس تلوار میان سے نکال چاہتا تھا کہ بنئے کا سر الگ کر دے کہ اس کی بیوی اس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رو کر کہنے لگی "خدا کے لئے کیا غضب کرتے ہو۔ یہی تمہارا غصّہ ہے تو پہلے مجھ پر اور بچّوں پر ہاتھ صاف کر دو کیونکہ تمہارے بعد ہمارا تو کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔ ماں کو روتا دیکھ بچّے اس طرح ڈاڑھ مار کر روئے کہ میرا دِل ہل گیا۔ اور دوڑ کر سب کے سب باپ کو لپٹ گئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر خان صاحب بھی ٹھنڈے ہوئے اور تلوار کو میان کر کھونٹی سے لٹکا دیا۔ اور بی بی سے پوچھا "تو نیک بخت! پھر مجھ کو اس بے عزّتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔" بی بی نے کہا۔ "بلا سے جو چیز گھر میں ہے۔ اس کو دے کر کسی طرح اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ تم کسی طرح رہ جاؤ تو پھر جیسی ہوگی دیکھی جائیگی۔ توا۔ چکّی۔ پانی پینے کا کٹورا نہیں معلوم کن کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں۔ یہی اس گھر کی کل کائنات تھی۔ چاندی کی دو چوڑیاں لیکن ایسی پتلی جیسے تار۔ اُس نیک بخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں یہ سب سامان خان صاحب نے باہر لا کر اس بنئے کے روبرو رکھ دیا تو بنیا اُن چیزوں کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سُنا۔ یہاں تک کہ اُن سرکاری پیادوں کو بھی رحم آیا۔ اُنہوں نے بھی بنئے کو سمجھایا۔ بارے خدا خدا کر کے وہ اس بات پر

رضامند ہؤا کہ پانچ روپیے اصل اور دو روپے سود ساتوں کے ساتوں
دے دیں تو فارغ خطی لکھ دے۔ لیکن خاں صاحب کا کل اثاثہ چار ساڑھے
چار سے زیادہ کا نہ تھا۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی بی سے کہا "اب تو
کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں۔ ہاں لڑکی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں
ہیں۔ دیکھو جو اُن کو ملا کر پوری پڑے۔ وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی۔ بس
جتنی ہماری حمیدہ۔ ماں جو لگی اس کی بالیاں اُتارنے۔ وہ لڑکی اس حسرت
کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور میں نے دل میں کہا کہ الٰہی!
اس وقت مجھ سے کچھ بھی اس کی مدد نہیں ہو سکتی۔ فوراً دل میں آیا کہ
ایک روپیہ اور کوئی دو آنے کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں۔ دیکھوں،
ٹوپی بک جائے تو شاید خان صاحب کا سارا قرضہ چُک جائے۔ بازار تو
قریب تھا ہی۔ فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا۔ رومال تو سر کو لپیٹ لیا۔ اور
ٹوپی ہاتھ میں لے ایک گوٹے والے کو دکھائی۔ اس نے چھ کی آنکی میں نے
بھی چھوٹتے ہی کہا "لا! بلا سے چھ ہی دے" غرض چھ وہ اور ایک
میرے پاس نقد تھا ہی۔ ساتوں روپے لے میں نے چپکے سے اس عورت
کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ تب تک پیادے خاں صاحب کو گرفتار کر لے جا
چکے تھے اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا۔ دفعتاً پورے سات روپے
دیکھ اس عورت پر ایک شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور اُس
خوشی میں اس نے کچھ نہیں سوچا کہ روپیہ کیسا ہے اور کس نے دیا ہے
فوراً اپنے ہمسائے کو روپیہ دے کر دوڑایا اور خود بچوں سمیت دروازے
میں آ کھڑی ہوئی۔ بات کی بات میں خان صاحب چھوٹ آئے تو بچوں کو
کیسی خوشی کہ کودیں اور اُچھلیں۔ کبھی باپ کے کندھے پر۔ کبھی ماں کی گود
میں اور کبھی ایک پر ایک۔ اب اس عورت کو میرا خیال آیا اور بچوں سے
کہا۔ "کمبختو! کیا اودھم مچاتے ہو۔ (اور میری طرف اشارہ کرکے کہا) دعا دو
اس اللہ کے بندے کی جان و مال کو۔ جس نے آج باپ کی اور تم سب
کی جانیں رکھ لیں۔ نہیں ٹکڑا بھی مانگا نہ ملتا۔ کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا،
کہ اس کو تمہارا درد ہوتا۔ اور اس مصیبت کے وقت تمہاری دستگیری کرتا
صرف ایک باپ کے دم کا سہارا۔ اللہ رکھے اُس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں
تو محنت سے۔ مزدوری سے۔ خدا کا شکر ہے۔ رُوکھی سُوکھی روز کے روز

دو وقت نہیں تو ایک وقت ملے تو جاتی ہے۔ ہمارے حق میں تو یہ لڑکا کیا ہے؟ رحمت کا فرشتہ ہے۔ نہ جان نہ پہچان۔ نہ رشتہ نہ ناتا۔ اور اس اللہ کے بندے نے بھر مٹھی روپیہ دے کر آج ہم سب کو نئے سر سے زندہ کیا۔ وہ بچے جس شکرگزاری کی نظر سے مجھ کو دیکھتے تھے۔ اس کی مسرت اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں۔ روپیہ خرچ کرنے کے بعد مجھ کو عمر بھر ایسی خوشی نہیں ہوئی جیسی کہ اُس دن تھی۔ مگر دونوں میاں بی بی کے ذہن میں اس وقت تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے روپیہ اُن کو دے دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرض کے طور پر دیا ہے۔ وہ عورت مجھ کو اپنے گھر میں لے گئی۔ اور ٹوٹی سی ایک چوکی پڑی تھی۔ میں ہر چند منع کرتا رہا۔ جلدی سے اس کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور میاں سے بولی۔ "نوج! کوئی تم جیسا بے خبر ہو۔ کھڑے کیا ہو۔ جاؤ ایک گلوری بازار سے میاں کے لئے بنوا لاؤ"۔

میں۔ نہیں میں پان نہیں کھاتا۔ تکلیف مت کرو۔

عورت۔ بیٹا! تمہاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف۔ جی چاہتا ہے کہ آنکھیں تمہارے تلووں میں بچھا دوں۔ قربان اس پیاری پیاری صورت کے نثار اس بھولی بھالی شکل کے بیٹا! تم یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو؟

میں۔ میری خالہ میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں۔

عورت۔ پھر بیٹا! یہ اپنا روپیہ تم ہم سے کب لوگے۔ ہم اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹیں گے۔ اور تمہارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے۔ مگر کام ان دنوں مندا ہے۔ دیں گے تو ہم جس طرح بن پڑیگا۔ دو ہی مہینے میں۔ مگر جہاں تم نے اتنی مہربانی کی ہے۔ اللہ اتنا سلوک اور کرو کہ دو روپئے مہینہ قسط کا لے لیا کرو۔

میں۔ آپ روپئے کے ادا کرنے کا کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے لینے کی نیت سے نہیں دیا۔

یہ سُن کر تمام خاندان کا خاندان اتنا خوش ہؤا کہ میں بیان نہیں کر سکتا اور میں اُن میں اس وقعت کے ساتھ بیٹھا ہؤا تھا۔ جیسے خوش دل اور شکرگزار رعایا میں کوئی بادشاہ یا حلقۂ مریدانِ ارادتمند میں کوئی پیر و مرشد۔ اُس عورت کے مُنہ سے مارے خوشی اور شکرگزاری کے بات

نہیں نکلتی تھی۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی۔ اور میرے ہاتھوں کو چومتی تھی اور آنکھوں کو لگاتی تھی۔ اس کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی نہیں۔ پوچھا تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیہ دیا۔ پھر تو اس کا یہ حال تھا کہ بچھی جاتی تھی۔ سات روپے کی بھی کچھ حقیقت تھی؟ مگر مجھ کو سیکڑوں ہزاروں ہی دعائیں دی ہونگی۔ اس نے جو اتنی احسان مندی ظاہر کی۔ میں اُلٹا اسی کا ممنون ہوا۔ جس قدر وہ خوشامد کرتی تھی۔ میں زمین میں گڑا جاتا تھا۔ غرض میں وہاں سے رخصت ہوا تو ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے سیدھا گھر لوٹ آیا۔ گلی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے میری ہیئت کذائی دیکھ کر تعجب کیا اور پوچھا کہ "ایں کیا ٹوپی کے بدلے چنے لے کھائے؟" میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس واسطے کہ مجھ کو اس بات کا ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ شام کو بھائی جان سے اور امّاں جان سے تکرار ہوئی۔ بھائی جان کچھ روپے مانگتے تھے۔ اور امّاں جان کہتی تھیں۔ بیٹا! ان فضول خرچیوں سے گھر کے دن چلے گا۔ لو پرسوں میں نے تم کو چار روپے دئے۔ تم نے چاروں کے چاروں برابر کئے۔ ناخن بھر چیز تم گھر میں لائے ہو تو بتاؤ۔ اتنا چٹورا پن۔ ایسا اسراف"! بھائی جان نے کہا۔ میں چٹورا نہیں ہوں۔ چٹورے تمہارے منجھلے صاحبزادے ہیں۔ جن کو تم بڑا مولوی سمجھتی ہو کہ سر کی ٹوپی تک بیچ کر کھا گئے۔ امّاں جان نے مجھ کو بلا کر پوچھا۔ میں نے کہا اگر بیچ کر کھا جانا ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا ٭

امّاں جان۔ پھر کیا کہیں کھو دی؟

میں۔ کھوئی بھی نہیں ٭

امّاں جان۔ بھائی تو تو عجب تماشے کا لڑکا ہے۔ بیچی نہیں۔ کھوئی نہیں۔ پھر ٹوپی گئی۔ تو کہاں گئی؟

میں۔ اگر آپ کو میری بات کا اعتبار ہے تو بس سمجھ لیجئے کہ میں نے کہیں اس کو بیجا طور پر صرف نہیں کیا ٭

امّاں جان۔ اگر یہی تمہارے لچھّن ہیں۔ تو تم نے پڑھ لکھ کر ڈبو دیا ٭

میں اس وقت عجیب مشکل میں تھا۔ ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور بے ظاہر کئے بن نہ پڑتی تھی۔ ع

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مگر مجھ کو یقین تھا کہ جب میرا معاملہ پاک و صاف ہے تو گو بالفعل بھائی جان کے کہنے اور میرے چپ رہنے سے امّاں جان کو ایک بدگمانی سی ہو گئی ہے۔لیکن کبھی نہ کبھی ضرور اُن کے دل سے خدشہ دفع ہو ہی جائیگا۔اور کچھ نہ ہوگا تو میرے اگلے پچھلے فعلوں کو دیکھ کر اتنا تو جی میں سمجھ لیں گی کہ بیٹا بدراہ نہیں ہے۔نہیں معلوم ٹوپی کا کیا بھید ہے؟ سو خدا کی قدرت!

ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ صالحہ بیمار پڑی تو امّاں جان اس کی عیادت کو گئیں - میں ان کے ساتھ تھا۔ ابھی امّاں جان سواری سے نہیں اتری تھیں کہ ادھر سے وہی خاں صاحب چلے آ رہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر دور ہی سے دعائیں دینے لگے اور ایسے تپاک اور دلسوزی کے ساتھ میری خیر و عافیت پوچھی کہ جیسے کوئی اور بزرگ اور اپنا عزیز دریافت حال کرتا ہے۔خیر میں نے مناسب حال جواب دیا۔امّاں جان آخر یہ سب پردے کے اندر بیٹھی سُن رہی تھیں۔اُترتے کے ساتھ ہی مجھ سے پوچھا۔"علیم وہ کون شخص تھا جو تم سے باتیں کر رہا تھا؟

میں - یہ ایک خاں صاحب ہیں اور میاں مسکین کے سامنے میں رہتے ہیں۔ بس میں اسی قدر جانتا ہوں ؛

امّاں جان ۔لیکن باتیں تو تم سے ایسے گرویدہ ہو ہو کر کرتے تھے۔ کہ گویا برسوں کی جان پہچان ہے ؛

میں ۔ نہیں! شاید ان کو میرا نام بھی معلوم نہیں ؛

اماں جان ۔ پھر تمہارے ساتھ ایسے خلوص سے کیوں پیش آئے؟

میں ۔بعض لوگوں کا دستور ہوتا ہے کہ ذرا سے تعارف میں بھی بڑے تپاک کے ساتھ ایسے خلوص سے پیش آیا کرتے ہیں ؛

اگرچہ میرے جواب سے امّاں جان کی تشفی نہیں ہوئی۔ مگر ان کو اندر جانے کی جلدی تھی ۔ چلی گئیں ۔ خاں صاحب نے کہیں اپنے گھر میرا تذکرہ کیا۔ میں تو گھر چلا آیا ۔ مگر غالب ہے کہ اُن کی بیوی امّاں جان کے پاس گئیں۔ اور میرے اس ٹوپی بیچنے اور روپیہ دینے کا تمام ماجرا بیان کیا۔پھر جو امّاں جان آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں۔"علیم! ہم نے آخر تمہاری چوری پکڑی پر پکڑی"

میں نے حیران کر پوچھا کہ میری چوری؟

امّاں جان۔ جی ہاں تمہاری چوری!
میں۔ بھلا میں بھی تو سنوں!
امّاں جان۔ کیوں۔ تم پہلے ٹوپی کا حال بتاؤ! تب مجھ سے اپنی چوری کی حقیقت سنو!

اتنا کہنے سے میں سمجھ گیا۔ اور ہنس کر چپ ہو رہا۔

باپ۔ بیشک جتنی باتیں تم نے بیان کیں۔ داخل ہمدردی ہیں۔ خصوصاً یہ خاں صاحب کا قصّہ ہمدردی کی ایک اعلیٰ درجے کی مثال ہے۔ لیکن چشمے سے پہلے وہ مقامات سیراب ہونے چاہئیں جہاں سے وہ چشمہ نکلا ہے۔ اسی طرح پہلے اپنے عزیز و اقارب نیکی اور سلوک کے مستحق ہیں۔

بیٹا۔ خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میرے قریب کے رشتے دار میرے سلوک کے حاجتمند نہیں ہیں اور خدا نے ان کو مجھ سے بے نیاز اور مستغنی کیا ہے۔

باپ۔ کیا سلوک صرف روپے پیسے ہی کے دینے سے ہوتا ہے؟

بیٹا۔ میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا۔

باپ۔ نہیں۔ جو جس چیز کا حاجتمند ہو۔ اس کا رفع حاجت کرنا ہمدردی اور نفع رسانی ہے۔

طوفانِ اشک

از علّامہ راشد الخیری مرحوم

۱۔ محرومِ وراثت

(۱)

محمد احسن تحصیل دار کے دونوں بچّے محسن اور رضیہ تھے تو حقیقی بہن بھائی۔ مگر نہ معلوم احسن کس طبیعت کا باپ تھا۔ کہ اس کی وہی نظر محسن پر پڑتی تو محبّت میں ڈوبی اور رضیہ پر پڑتی تو زہر میں بجھی۔ سمجھ دار پڑھا لکھا مگر ظالم کی عقل پر ایسے پتھر پڑے تھے کہ نہ دیکھ کر خوش ہوتا نہ سوچ کر نادم۔ محسن کی تعلیم پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا تھا مگر رضیہ غریب کو استانی بھی میسّر

نہ تھی۔ کچھ اس لئے نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کا مخالف تھا بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی کمائی میں اس کو حق دار نہ سمجھتا تھا۔ محسن کے پاس جوتی کے آٹھ آٹھ دس دس جوڑے اور رضیہ کے پاس صرف ایک اور وہ بھی مہینوں کی ٹوٹی پھوٹی تو نہیں مگر ٹوٹ سے بدتر۔ محسن کے پاس ایک نہیں درجن بھر سوٹ اور رضیہ کے پاس اِنے گنے دو دوپٹے اور لطف یہ کہ جو کچھ بھی رضیہ کو میسّر تھا۔ وہ اس کا حق یا باپ کی محبّت نہیں صرف صفیہ کا اصرار تھا۔ ورنہ واقعات تو یہی کہتے ہیں کہ رضیہ کھلے سر اور ننگے پاؤں بھی پھرتی تو احسن کو ملال نہ ہوتا۔ باپ کی لاپروائی اور بے وفائی پر بھی وقت رضیہ کے ساتھ تھا۔ صفیہ جہاں شوہر کی اس کمی پر افسوس کر رہی تھی۔ وہاں اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمیشہ اس نقصان کی تلافی کی۔ اور جہاں تک بھی ممکن ہؤا۔ اس کی تعلیم و تربیّت میں انتہائی کوشش کرتی رہی۔ رضیہ کی فراست۔ اس کا شوق۔ اس کی سعادت مندی۔ صبر اور خاموشی ماں کے دل میں گڑی جاتی تھی۔ وہ اس کے یا اس کے باپ کے سامنے نہیں۔ تنہائی میں اکثر روتی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عید کے موقعے پر اس لئے کہ کچھ عزیز آنے والے تھے۔ شاموں شام احسن نے بیوی اور بچّے کے لئے سب سامان منگوایا۔ احسن۔ محسن۔ رضیہّ۔ صفیہّ چاروں ایک جگہ بیٹھے تھے۔ احسن ایک ایک چیز اٹھاتا اور دکھاتا جاتا تھا اور متوقّع تھا کہ بیوی اور اس کے بچّے اس انتخاب کی داد دیں۔ احسن جس وقت ایک چیز دکھانے کے بعد صفیہ رضیہ اور محسن کی صورت دیکھ کر داد طلب کرتا۔ اس وقت صفیہّ کبھی اس ڈھیر کو کبھی شوہر کو اس امید پر دیکھتی اور تکتی کہ شاید اس ڈھیر سے یا شوہر کے منہ سے رضیہّ کے لئے کوئی چیز یا رضیہّ کا نام نکلے۔ مگر پوری نو چیزیں چار صفیہ اور پانچ محسن کی ختم ہو گئیں۔ لیکن رضیہ کے نام کی چیز نہ ڈھیری سے نکلی نہ اس کا نام باپ کے منہ سے نکلا۔ محسن نے باپ کی محبّت اور کوشش کی داد دی۔ دل کھول کر دی اور پیٹ بھر کر دی۔ مگر صفیہّ کے سامنے اس وقت ایک اور ہی سماں تھا۔ وہ اوپری دل سے تعریف کرتی ہوئی اُٹھی۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ اللہ غنی! مسلمان بچیاں جو ماں کی چوکھٹ پر چند روز مہماں ہیں۔ بھائیوں کے مقابلے میں اتنا حق بھی نہیں رکھتیں کہ پانچ کے مقابلے میں ایک چیز آ جاتی۔ میں جانتی ہوں کہ رضیہّ کے پاس سب کچھ ہے۔ اور میں نے حیثیت سے زیادہ اور ضرورت سے بڑھ کر اس کا سامان کر لیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب

باپ ہی کی کمائی کا ہے اس کے واسطے اگر ایک چیز بھی اس وقت آ جاتی تو اس کا دل کتنا بڑھ جاتا۔ باپ اس کی خوشی دو چار روپے میں بھی مول نہ لے سکا۔ محسن خدا اس کی عمر دراز کرے آگے اور پیچھے آج اور کل مالک اور مختار ہے۔ لیتا ہے اور لیگا۔ مگر رضیہؔ کہاں اور یہ گھر کہاں!

صفیہؔ شوہر کے پاس سے ایک حقیقت بخار دل میں لے کر اٹھی تھی مگر کمرے تک پہنچتے پہنچتے ہل ہلا گئی۔ اور اس خیال کے آتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جانتی تھی کہ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیر رہے ہیں۔ اور چاہتی تھی کہ اس حالت کو ظاہر نہ ہونے دے۔ مگر اس جذبۂ محبت نے جو مامتا کی آغوش میں پلا تھا بے قابو کر دیا۔ اور بچّی کی صورت دیکھنے کو منہ پھیرا ایک ساکت مجسّمہ تھا جو رضیہ کی صورت میں گم صُم باپ کے سامنے بیٹھا زمین کو دیکھ رہا تھا۔ ماں نے بچّی کی خاموش صورت دیکھ کر اس کے دل کی کتاب پڑھی اور ٹھنڈا سانس بھر کر آگے بڑھی احسن بیوی کا یہ رنگ دیکھ کر حیرت میں ادھر آیا اور کہنے لگا:۔

"بس وہی ایک پیٹنا کہ رضیہؔ کا کچھ نہ آیا۔ اس کے پاس سب کچھ موجود ہے"؛

بیوی۔ موجود تو محسن کے پاس بھی ہے؛

میاں۔ محسن کی اس کی کیا برابری؟

بیوی۔ کیوں؟

میاں۔ وہ گھر کا مالک ہے۔ یہ پرایا دھن؛

بیوی۔......

میاں۔ اس کے علاوہ کواری بچّی کو جو مل گیا وہ غنیمت ہے؛

بیوی۔....؛

(۲)

محسن بی۔ اے میں کامیاب ہوا تو رضیہؔ دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھی اور ایک یہی کیا ماں کی توجہ اور کوشش نے نسوانیّت کے تمام جوہر اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دئے تھے۔ دونوں بہن بھائیوں کی شادی ساتھ ساتھ ٹھہری۔ مگر اس احتمال سے کہ موروثی جائداد رضیہؔ کی وساطت سے پرائے قبضے میں نہ

جائے۔احسن نے اس کے نکاح سے قبل قریب قریب تمام جائداد وقف علی اولاد کی آڑ میں محسن کے حوالے کی۔اور رضیہؔ کو محروم کر دیا۔صفیہؔ نے بہتیرا غل مچایا۔ مگر یہ تو بڑا کام تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بیویوں کی مخالفت کا شوہروں کے مقابلے میں جو نتیجہ ہو سکتا ہے۔مسلمان اس راز سے اچھی طرح آشنا ہیں۔صفیہؔ کو بڑا صدمہ یہ تھا کہ اس کی اپنی جائداد بھی جو میکے سے ملی تھی۔اس سلسلے میں فنا ہو رہی تھی ؀

مسلمان قلم کی طاقت اور اپنی زبان کے زور سے جھٹلا لیں۔ مگر ہے کوئی مسلمان جو ایمان سے کہ سکے کہ بچوّں والی بیوی۔ بہو اور داماد والی یا ہونے والی۔شوہر کی اتنی مخالفت کے بعد کہ ایسی دستاویز پر دستخط نہ کرے۔اس کے گھر میں خوش رہ سکتی ہے ؟ احسن کے پنجرے میں رضیہؔ ہر چند پھڑپھڑائی۔ مگر معاشرت اسلامی کا موجودہ لاسہ اتنا تیز اور اتنا گہرا تھا کہ جتنی تڑپی اتنی ہی چپکی۔ گھر میں ہفتہ بھر قیامت بپا رہی اور اس کے بعد احسن نے اندر کی آمد و رفت قطعاً بند کر دی۔صفیہؔ برس چھ مہینے کی بیاہی نہ تھی۔ بیس بائیس برس کی گرہستن۔ نہایت ہی استقلال سے شوہر کا مقابلہ کیا۔اس حالت اور ایسے موقعوں پر مسلمان مردوں کے پاس نکاح ثانی کا حربہ چلتا ہوُا ہتیار ہے۔ مگر صفیہ اس کو بھی خاطر میں نہ لائی اور میاں سے صاف کہ دیا کہ گھر اگر موم ونون کا ہے کہ دھوپ سے پگھلے اور پانی سے بہے تو میں کہاں تک روکونگی۔بسم اللہ! آج نہ کیا کل۔اور کل نہ کیا پرسوں ؀

مطالبۂ حقوق نسواں کو لغو اور فتنہ قرار دینے والے مسلمان جو کچھ فرمائیں ہمارے سر اور آنکھوں پر۔ مگر خدا را وہ بتائیں کہ اس موقعے پر جب احسن نے ہر طرف سے ناکام ہو کر فیصلہ کیا کہ وہ رضیہؔ کے نکاح ہی کا خاتمہ کر دے اور تمام عمر بیٹی کو وداع نہ کرے۔ تو صفیہؔ کیا کرتی ؟ اس فیصلے نے صفیہؔ کی گردن شوہر کے سامنے جھکوا دی۔اس کی اکڑ۔اس کا استقلال اس کا ضبط سب فنا ہو گئے اور اب جائداد اور جائداد کی تقسیم تو الگ رہی۔ اس کو نکاح ہی کے لالے پڑ گئے۔اور یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے غریب بچّی کی عمر تباہ و برباد ہوتی ہے۔اس نے کاغذ پر دستخط کیئے اور اس طرح رضیہؔ ماں باپ کی جائداد سے محروم وداع ہو کر سسرال رخصت ہوئی ؀

(۳)

محسن بی۔ اے کے بعد قانون میں کامیاب ہؤا۔ رضیہؔ ایک بچّے کی ماں بنی۔ صفیہ حج سے فارغ ہوئی۔ احسن پر فالج گرا اور وہ ہلنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس وقت گھر کا مالک اور سپید و سیاہ کا مختار۔ جائداد کا منتظم محسن تھا۔ اور گو آمدنی معقول تھی۔ اللّے تللّوں نے مقروض کیا۔ اور نوبت یہاں تک آئی کہ جس گھر میں دس پانچ ہزار روپیہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اس میں سو پچاس بھی مشکل سے نکل سکتے تھے۔ صفیہؔ کی دُور اندیشی تھی کہ کچھ روپیہ اپنے پاس لگا رکھا تھا۔ باقی زیور سے مدد لی اور حج کر لیا۔ واپس آئی تو محسن کا یہ رنگ دیکھ سنّاٹے میں رہ گئی۔ مگر جو لڑکا زندہ باپ کو مردہ سمجھ رہا تھا۔ وہ ماں کو کیا خاطر میں لاتا۔ محسن کی بعض دفعہ پریشانیاں اور پریشانیاں نہیں فضول خرچیاں ماں کو سخت خلجان میں ڈال دیتیں۔ اور وہ اب یہ سمجھ گئی تھی کہ عنقریب یہ مجھ سے روپیہ طلب کرنے والا ہے۔ اس لئے گھر کی برابر والی مسجد کی تعمیر اس کے واسطے بہت اچھا موقع تھا۔ اس نے فوراً شوہر کے کان میں بات ڈال کر جو کچھ زیور بچا تھا مسجد کی نذر کیا مگر یہ خبر احسن اور صفیہؔ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ تھی کہ فالج کا دورہ ایسا سخت ہوگا۔ اور سنگ دل محسن عاشق زار باپ کو کتے کے ٹھیکرے میں پانی پلا دیگا۔ صفیہؔ کے پاس ابھی تھوڑی بہت کھرچن موجود تھی۔ اس کے طفیل اتنا تھا کہ معمولی علاج جاری رہا۔ ڈاکٹر حکیموں کی فیس نکل رہی تھی۔ اور نسخے بھی آ رہے تھے۔ ورنہ محسن نے ایک دن تو کیا ایک گھڑی بلکہ ایک لمحے کو بھی نہ پوچھا کہ کیا ہؤا اور کیا ہو رہا ہے۔ جب متواتر باپ نے بُلایا تو کھڑے کھڑے آیا اور ایک آدھ بات کی۔ اور چلتا ہؤا۔

احسن کے پندرہ روز اسی طرح گذرے۔ اُٹھ سکتا تھا اور نہ بیٹھ سکتا۔ اس موقع پر صفیہؔ نے ایسی خدمت کی جو شریف بیویوں سے توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کو سوا رونے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ رات رات بھر اور دن دن بھر پٹی پکڑے بیٹھی رہی۔ اس کی نیند اور بھوک دونوں اُڑ چکی تھیں۔ اور اسی کا صدقہ تھا کہ حکیم ڈاکٹر آ رہے تھے۔ اور علاج ہو رہا تھا۔ بالآخر ڈاکٹر نے بجلی کا علاج تجویز کیا۔ جس کا تخمینہ چار ہزار روپے کے قریب تھا۔ احسن اور رضیہؔ دونوں کو یہ شبہ بھی نہ تھا کہ محسن باپ ہی کا روپیہ جس کی بدولت وہ نواب بنا پھر رہا تھا۔

باپ کی زندگی اور راحت سے عزیز کرے گا؛

صبح سے بلاتے بلاتے شام ہوگئی۔ دُنیا بھر آئی مگر محسن نہ آیا۔ خدا خدا کرکے شام کو لوٹا تو باپ نے اپنے منہ سے ساری کیفیت سنائی اور چار ہزار روپے مانگے۔ بے وفا مسکرا کر اُٹھا اور بغیر جواب دیے چلا تو ماں پیچھے پیچھے گئی اور کہا:۔

"میاں! پھر بجلی کے علاج کا انتظام کرو"؛

ایک ایسی نظر سے جس میں تعجب اور غصّہ دونوں شامل تھے محسن نے نے ماں کو دیکھ کر کہا:۔

"تمہاری تو عقل جاتی رہی ہے۔ اوّل تو روپیہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر ہوتا بھی تو علاج فضول ہے۔ میں نے معلوم کر لیا کہ موت یقینی ہے اگر کچھ روز کو بچ گئے تو اور سوہان روح ہونگے"؛

صفیہ کا قدم آگے نہ اُٹھ سکا۔ دھم ہو گئی۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ اس کو تو کچھ نہ کہہ سکی مگر اپنے دل میں کہا کہ" ایسے ناہنجار لڑکے کی ماں زمین شق ہو اور سما جائے۔ اب میں جا کر کیا جواب دوں"؛ کھڑی سوچ رہی تھی کہ رضیہ کا خط ملا:۔

" اماں جان!

آداب عرض کرتی ہوں۔

جب سے ابّا جان کی بیماری اور ان کی کیفیت سنی ہے۔ دل ہوا ہو رہا ہے؛

ہائے میرے ابّا جان کو کیا ہو گیا۔ میں تو بھلا چنگا چھوڑ کر آئی تھی۔ مجھ بدنصیب کو تو ابھی معلوم ہوُا ہے۔ اے اللہ! کیا کروں؟ ڈپٹی صاحب کچہری میں ہیں۔ جس طرح ہوگا۔ آج ہی رات کو یا کل فجر حاضر ہوں گی۔ میرے آنے کا ذکر نہ کیجئے۔ خفا ہونگے۔ میں سامنے نہ جاؤں گی۔ دور ہی سے شکل دیکھ لوں گی؛

اچھّی اماں جان! علاج میں کمی نہ کرنا"؛

آپ کی فرمانبردار بیٹی
رضیہ

(۴)

رضیہ علی الصباح میکے پہنچی۔ باپ کی حالت اور مفصل کیفیت سن کر اُلٹے پاؤں واپس گئی۔ رات کے دس بجے تھے احسن یہ سن کر کہ محسن نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا۔ انگاروں پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ مگر مجبور تھا کہ ہلنے کی طاقت نہ تھی اور کوئی دم کا مہمان تھا۔ آنکھیں بند تھیں کہ ایک ہاتھ نے اس کا مفلوج ہاتھ اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ احسن نے آنکھ کھولی تو دیکھا۔ رضیہ سامنے کھڑی ہے اور آنکھ سے آنسو بہ رہے ہیں؛

وہ یہ سمجھ کر کہ باپ کو میری صورت سے تکلیف نہ ہو ہاتھ جوڑتی ہوئی پیچھے ہٹنے لگی تو صفیہ نے کہا:۔

"رضیہ یہ چار ہزار روپے لائی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے جو پانچ ہزار روپے اس کو نقد دئے تھے اس میں سے یہ لے لیجئے اور علاج کیجئے؛

جس رضیہ کی صورت سے باپ کو نفرت تھی۔ جس پر ایک پیسہ بھی صرف کرنا گراں تھا۔ اس کا سر اس وقت باپ کے قدموں میں تھا؛ اور زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے:۔

"ابّا جان! یہ آپ ہی کا روپیہ ہے میرا نہیں ہے"؛

آج احسن کو معلوم ہوا کہ بھولی بھالی بچیاں کیا چیز ہیں۔ اس نے بچی کو بلا کر اپنے سینے سے لگایا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے؛

۲۔ توصیف کا خواب

(۱)

یہ صرف تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ سلطان توصیف ایک غریب باپ کی بیٹی اور معمولی ماں کی بچی داؤد جیسے متموّل تاجر کی بہو بنی باپ کے بعد اس کا شوہر موسیٰ ایک کروڑ پتی سوداگر تھا۔ جس کی دو چار نہیں بیسیوں کوٹھیاں۔ اور دس پانچ نہیں سینکڑوں کارخانے اِدھر اُدھر موجود تھے۔ بنگال کا شاید ہی کوئی شہر ایسا ہوگا جہاں موسیٰ کی تجارت نہ ہو۔ اس شادی کا سبب اور نکاح

کی وجہ توصیف کی تقدیر یا موسیٰ کی قدردانی۔ تعلیم کا انجام یا شرافت کا نام جو کچھ بھی ہو اس نکاح کا نباہ اور اس کاج کی لاج کا سہرا توصیف کے سر ہے۔ خدا کی شان نظر آتی تھی کہ وہ موسیٰ جس نے کبھی خدا کے سامنے سر نہ جھکایا ہو بیوی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ اور وہ توصیف جس کے جہیز کی کل کائنات ایک صندوق برات کے ساتھ تھا۔ دن رات جواہرات میں کھیلتی۔ یہ صرف علم ہی کا طفیل اور تعلیم کا صدقہ تھا کہ مردانے میں نکاح ہو رہا ہے۔ زنانے میں مہمان بھرے ہیں اور توصیف سلطان اس خیال میں غرق ہے کہ بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی۔ دولت جس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ صورت جس کے جادو کا اُتار نہیں۔ دونوں غائب۔ اب لے دے کر رہی سیرت۔ محبّت۔ عادت۔ خصلت۔ یہ ہی ہتیار ہیں جن پر فتح کا دار و مدار ہے۔ خدا ہی بیڑا پار کرے۔ تو ہو بظاہر تو یہ کشتی منجدھار میں ڈوبی ؛

سسرال پہنچی تو رئیسانہ شان۔ امیرانہ ٹھاٹ۔ نوکروں کا زور ماماؤں کا شور۔ دولت کی کثرت۔ روپئے کی ریل پیل۔ چاہیئے کہ باغ باغ ہوتی نہال نہال ہوتی۔ مطلق نہیں۔ ہر وقت اپنی دھن میں غرقاب اور فکر میں شرابور۔ موسیٰ امیر کا بچّہ۔ لاڈلا اور اکلوتا دنیا اس کے قدموں میں آنکھیں بچھائے الفت سے نا آشنا۔ محبت سے ناواقف۔ فرض کی وقعت اور حقوق کی تربیت اس کی نگاہ میں ہو ہی نہ سکتی تھی۔ ایسے شوہر کے دِل میں گھر کرنا لوہے کو نرمانا اور پتھر کو جونک لگانا تھا۔ مگر بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے۔ توصیف نے اپنے سامنے صرف رضا مندئ شوہر کا مقصد رکھا اور اس کے حصول میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ یہ صحیح ہے کہ تعلیم کی طاقت بھی کچھ کم وزن نہ رکھتی تھی مگر بہ حیثیت مجموعی داؤد کا پاسہ بہت زبردست تھا۔ وہ تموّل کے ساتھ ہی دولت حسن سے بھی مالا مال تھا اور اس کا حق توصیف کے مقابلے میں قطعاً فائق تھا۔ ان حالات میں بیوی کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ صورت کی کمی اطاعت سے پوری کرے ؛

نکاح کے وقت موسیٰ کے ماں اور باپ دونوں زندہ تھے اور دونوں عاشق زار۔ وہ فطرتاً گوارا ہی نہ کر سکتے تھے کہ بچے کے دل پر محبت کا چرکا تو درکنار آنکھ میں ملال کا میل تک آئے۔ لیکن جال اور دانہ دونوں سامنے

تھے۔ اور موسیٰ کی کیفیت اس وقت بالکل اس پرند کی تھی جو پھندے میں پھنستے ہی جھٹکا مارے اور پھڑپھڑا کر نکل جائے۔ اگر توصیف اس وقت پورا لاسہ نہ لگاتی تو موسیٰ چلا ہی تھا اس نے ایک تین ہی مہینے میں وہ خدمت کی کر اکیس برس کی کھائی بڑھیا کی خدمات دل سے بھلا دیں۔ ہم پہلے بھی کہ چکے ہیں کہ توصیف کا عورت ہونا اس کی کمزوری نہ تھی۔ بلکہ دوسرے سامان تھے۔ دوسرے اسباب تھے۔ دوسرے باعث تھے۔ شکل و صورت کے اعتبار سے۔ مالی حالت کے اعتبار سے۔ عزت و جاہت کے اعتبار سے وہ کمزور اور یقیناً کمزور ہ۔ اس گڑھے کو بھرنا اس کا فرض تھا۔ اطاعت سے بھرا۔ خدمت سے بھرا۔ بھرا۔ جھوٹ بھرا۔ غرض جس طرح بھرا جائز اور درست ؛

باوجود اس اعتراف کے موسیٰ اور توصیف کے حقوق قریب قریب برابر تھے۔ ہم توصیف کی اس دور اندیشی کی لاریب داد دینگے کہ اس کا یقین۔ اس کا ایمان۔ اس کا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا کہ اس کے گھر میں میرا اضافہ بامعنی ہے۔ اس وقت۔ جب میری ہستی اضافہ کرے موسیٰ کی راحتوں میں۔ اس یقین کا ثمر۔ اس عقیدے کا نتیجہ۔ اس ایمان کا انجام ظاہر تھا۔ روشن تھا۔ صاف تھا کہ ایک موسے کیا ادنیٰ سے اعلیٰ اور چھوٹے سے بڑا ہر متنفس اس کا گرویدہ تھا ؛

(۲)

توصیف کی زندگی کا یہ دَور اور بے فکری کے دن پانچ سال تک مستقل رہے۔ چھٹے سال ساس کی موت نے اس کی حالت میں ایک خاص تغیّر کیا۔ اور اب داؤد کی بہو گھر کی ملکہ بنی۔ اس اکرام و اعزاز نے ایک اور ذمہ داری بڑھائی۔ اور اب خسر کی راحت و آسائش کا بار بھی اسی کے سر تھا۔ اس ترازو میں بھی توصیف ٹاکم ٹوک اُتری۔ اور اس خوش اسلوبی سے فرائض ادا کیے کہ داؤد بیٹے سے زیادہ۔ بہو کا دلدادہ تھا۔ توصیف کی یہ خدمت یا اطاعت۔ خیال یا فکر عارضی اور چند روزہ تھا۔ مگر اس کی تہ میں بیش بہا خزانے اور بیش قیمت جواہرات پوشیدہ تھے۔ روحانی یا جسمانی اذیّت جو اس سلسلے میں توصیف نے بُھگتی۔ فانی مگر اس کے پھل رہنے والے اور پھول مہکنے والے تھے بڈھا داؤد قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ دو ہی سال میں رخصت ہو گیا۔ لیکن اس قلیل مُدّت میں توصیف نے وہ زیور جمع کر لیا جو آخر وقت تک جگمگایا۔ اور

وہ پھول چنے جو مرتے وقت تک نہ مرجھائے ؛

داؤد کے بعد توصیف اب گھر کی ملکہ تھی۔ جائداد۔ علاقہ۔ روپیہ۔ پیسہ ہر چیز کی مالک۔ موسیٰ کہنے کو خدائے مجازی اور حقیقتاً معمولی غلام ؛

(۲)

بُرا ماننے کی بات نہیں۔ مشاہدہ ہے کہ مسلمانوں کے دورِ موجودہ میں دولت لامذہبی کی جڑ ہے۔ مسلمان دولتمند ہو کر نماز کا پابند کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ غریب جس نے مفلسی میں تہجّد اور اشراق تک ناغہ نہ کی۔ مالدار ہوتے ہی مذہب کو طاق میں رکھ خدا سے ایسا فرنٹ ہؤا کہ کبھی واسطہ ہی نہ تھا۔ اس اصول کے تحت میں موسیٰ کا اسلام روشن اور ظاہر۔ مگر ہم اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس نے بیوی کے نماز روزے پر کبھی ناک بھوں نہ چڑھائی اور توصیف کی عبادت میں جو آسمان و زمین کا فرق تھا۔ اس کی ذمّہ دار وہ خود تھی یا اس کی دولت ؛

دریائے ہگلی کے کنارے پر ایک عظیم الشان کوٹھی ہے جس کے چاروں طرف ایک سرسبز اور خوشنما باغ مہک رہا ہے جس میں توصیف اپنے شوہر اور چار بچوں سمیت رہتی ہے۔ کسی قسم کا رنج و غم اُس کے پاس آکر پھٹکتا تک نہیں۔ داؤد نے یہ کوٹھی کئی لاکھ روپے کے صرف سے ایک گاؤں میں بنوائی تھی۔ اور دُور دُور کے معماروں نے اپنی صنعت کے ایسے ایسے نمونے دکھائے تھے کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ رنگ برنگ کے پھولوں نے اس ایوان کو جنّت بنا دیا تھا۔ میلوں تک ہوا ان کی خوشبو سے مہکی رہتی تھی۔ طائران خوش الحان کا نغمہ۔ آبشاروں کی سریلی آوازیں دلوں میں خواہ مخواہ اُمنگ پیدا کرتی تھیں ؛

بہتر سے بہتر زندگی جو دُنیا میں کسی عورت کی بسر ہو سکتی ہے۔ تو وہ توصیف کی تھی۔ کہ موسیٰ اس کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح کام کرتا اور دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ گیارہ سال کے عرصے میں لڑائی یا جھگڑا تو درکنار، کسی قسم کا اختلاف تک سُننے میں نہ آیا ؛

شام کے وقت ایک روز توصیف پائیں باغ میں ٹہلتی ہوئی باہر نکلی۔ اور سڑک پر آئی۔ موسیٰ ساتھ تھا۔ دونوں میاں بیوی باتیں کرتے پاؤں پیدل

دُور تک نکل گئے۔ آدمی نہ آدم زاد۔ سرد موسم۔ شام کا وقت۔ مسافت خاک نہ معلوم ہوئی۔ یہاں تک کہ دونوں ایک ایسی جگہ پہنچے۔ جہاں ایک عمارت کی ٹوٹی ہوئی دیواریں اور گری محرابیں اُس کے مسجد ہونے کا پتہ دے رہی تھیں۔ توصیف ایک ایسی ماں کے دودھ سے پلی اور باپ کی گود میں بڑھی تھی۔ جہاں مفلسی نے مذہب کی وقعت رگوں میں کُوٹ کُوٹ کر بھر دی تھی گو تغیر حالت نے توصیف کے خیالات میں بہت کچھ فرق کر دیا تھا۔ مگر اسلام کی عظمت وہ جہیز میں لے کر سسرال پہنچی تھی۔ اس وقت یہ دیکھ کر کہ خانۂ خدا اس حالت میں ہو اور گیدڑ اس میں رہیں۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی اور اس نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ اس مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرا دوں ؛

واپسی پر چند قدم کے فاصلے پر اس نے ایک ٹوٹی سی جھونپڑی دیکھی نہ معلوم کیا دل میں آئی کہ قریب پہنچی اور دیکھا کہ ایک غریب عورت اپنے دو تین بچّوں کو لئے خاموش بیٹھی ہے۔ توصیف کو تعجّب ہؤا کہ اس جنگل بیابان میں یہ بچّوں والی ماں کس طرح اپنی زندگی بسر کرتی ہوگی ؟ پوچھا :-

"اری تو کون ہے اور یہاں کیوں رہتی ہے ؟

عورت خاموش رہی اور کچھ جواب نہ دیا ؛

توصیف۔ "نیک بخت ! جواب کیوں نہیں دیتی ؟

عورت۔ "جی ہاں ! میں یہیں رہتی ہوں "؛

توصیف۔ "تو اکیلی رہتی ہے ؟"

اس سوال کے جواب میں کچھ ایسی داستان پوشیدہ تھی کہ عورت کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ؛

توصیف۔ "رو مت ! حالت بیان کر" ؛

عورت۔ "بیوی ! کیا فائدہ ہوگا۔ آپ کیوں سُنتی ہیں ؟"

اب عورت کا دل زیادہ بھر آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور اس کی آواز میں رقّت طاری ہو چکی تھی ؛

توصیف۔ "بتا اپنی حالت بتا ! شاید میں کچھ تیری مدد کر سکوں ؛

عورت۔ "بیوی ! وہ سامنے گاؤں ہے۔ اس کے پاس دو بیگہ زمین اور ایک کنواں میرا ہے۔ میرا شوہر کاشت کرتا تھا اور ہم یہاں سب اطمینان سے تھے۔ مگر پار سال وہ وبا میں مر گیا۔ زمیندار نے اس کی دوائی ٹھنڈائی بھی

نہ بچا۔ چالیس روپئے کا حساب اس کے مرنے پیچھے زمیندار کا نکلا تھا۔ میرے پاس دانت کریدنے کو تنکا تک نہ تھا۔ کہاں سے دیتی! اس نے میرا بچّہ لے لیا۔ اور اب مجھے اس سے ملنے بھی نہیں دیتا۔ مجھے اس کی صورت دیکھے پانچ مہینے ہو گئے۔ کئی دفعہ گئی دھتکار دیا ؎

یہاں پہنچ کر عورت کی ہچکی بندھ گئی اور اُس نے توصیف کے قدموں میں گر کر کہا۔ "بیوی! میرا بچّہ مجھ سے ملوا دو۔ خدا تمہاری مامتا ٹھنڈی کرے"۔

موسیٰ۔ بس بیگم چلو۔ دیکھو بالکل شام ہو گئی ؛

دونوں میاں بیوی اس عورت کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے گھر آ گئے۔ اور صبح ہی توصیف کے حکم سے مسجد کی مرمّت شروع ہوئی اور ایک مہینہ بھر کے عرصے میں نہایت خوبصورت مسجد تیار ہو گئی ؛

(۲)

چلّے کی سردی تھی اور کڑکڑاتے جاڑے۔ وقت کی بات اور ہونی شُدنی۔ کہ توصیف کا بڑا لڑکا کلیم خاصا بھلا چنگا کھیلتا مالتا اندر آیا اور پلنگ پر لیٹتے ہی اس شدّت کا بخار چڑھا کہ ماں اور باپ دونوں پریشان ہو گئے۔ ڈاکٹر۔ حکیم۔ یہ وہ المختصر شام تک بیسیوں آدمی جمع ہو گئے۔ بارہ برس کا بچّہ اور پہلوٹی کا۔ دونوں میاں بیوی کا دم ہوا تھا۔ علاج جس قدر توجہ سے ہوتا تھا۔ اسی قدر حالت ردی ہو جا رہی تھی۔ تین دن اور تین رات یہی کیفیت رہی۔ دنیا بھر کے جتن کر ڈالے۔ مگر حالت میں کسی طرح فرق نہ ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ڈاکٹر بھی مایوسی کی باتیں کرنے لگے۔ چوتھے روز جب کلیم پر بے ہوشی طاری ہوئی اور توصیف کلیجے پر گھونسے مار رہی تھی اس کو اس عورت کا خیال آیا۔ جس کا بچّہ صرف چالیس روپئے کے واسطے اس سے بچھڑا ہوا تھا ؛

دن کے تین بجے تھے کہ عورت اپنے بچے کی یاد میں اپنی جھونپڑی میں خاموش بیٹھی آنسو بہا رہی تھی کہ توصیف اس کے پاس پہنچی۔ اور کہا۔ "چلو میں زمیندار کا روپیہ دوں اور تم اپنے بچّے کو لے آؤ" ؛

عورت پر ایک شادیٔ مرگ کی کیفیّت طاری ہو گئی۔ وہ اچھل پڑی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی :۔

"کیا آپ میرا بچھڑا ہوا کلیم مجھ سے ملوا دینگی؟"

توصیف۔ "کیا تمہارے بچّے کا نام بھی کلیم ہے؟"

عورت۔ "جی ہاں!"
توصیف۔ ہاں چلو میرے ساتھ چلو"
عورت توصیف کے ساتھ چلی۔ مگر راستے بھر اس کی حالت عجیب رہی۔ وہ توصیف کا منہ دیکھتی تھی۔ بلبلاتی تھی۔ گڑگڑاتی تھی۔ ہاتھ جوڑتی اور کہتی تھی "بیگم! چالیس روپئے بہت ہیں۔ مگر میں ہاتھ جوڑونگی اور دونگی۔ پانچ چھ روپے کے برتن تو میرے پاس ہیں۔ یہ لے جائیے۔ تین روپئے کا ایک ہل ہے۔ باقی روپیہ جب تک میں نہ دوں۔ آپ میرے کلیم کو اپنے پاس رکھ لیجیے۔ میں دور سے ایک دفعہ روز صرف دیکھ جایا کروں گی"
توصیف اپنے بچے کی علالت میں اس درجے مستغرق تھی کہ اس کو دنیا و مافیہا کا ہوش نہ تھا۔ وہ کسی بات کا جواب دیتی تھی نہ دینے کے قابل تھی۔ زمیندار کے گھر پہنچی تو توصیف کی صورت دیکھتے ہی اس کے اوسان جاتے رہے۔ اس نے روپئے دئے تو کہنے لگا۔ "حضور! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں وہیں حاضر ہو جاتا"
اب ایک عجیب منظر تھا۔ زمیندار نے کلیم کو آواز دی۔ اور ماں کا دل جو بچّے کی جدائی میں تڑپ رہا تھا۔ مچھلی کی طرح لوٹنے لگا۔ وہ کبھی دروازے کو دیکھتی اور کبھی توصیف کو۔ اس کے ہاتھ توصیف کی طرف جُڑے ہوئے تھے اور زبان سے صرف اتنا کہ رہی تھی:۔
"بیگم! تیری مامتا ٹھنڈی رہے"
کلیم باہر آیا۔ ماما کی صورت دیکھتے ہی دوڑا۔ اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر چمٹ گیا۔ اس وقت عورت نے فرطِ مسرت میں ایک چیخ ماری اور توصیف کے قدموں میں گر کر کہا:۔
"اے بیگم! خوش رہ بچھڑا ہوا لال مجھ سے ملوا دیا"
توصیف کا دل اپنے کلیم میں پڑا ہوا تھا۔ بھاگم بھاگ گھر آئی تو ڈاکٹر کے یہ الفاظ اس کے کان میں پہنچے "اگر بخار اس دوا سے اتر گیا تو خیر۔ ورنہ پھر حالت بہت خطرناک ہوگی"
برابر کے پلنگ پر خاموش لیٹ گئی۔ رات کے دس بجے ہونگے۔ بچے کا بدن دیکھا تو بدستور چنے بھن رہے تھے۔ مایوس ہو کر پھر لیٹی۔ اور یقین ہو گیا کہ اب بخار اترنے والا نہیں

بارہ بجے کے قریب بخار اور تیز ہوا۔ اور توصیف اب قطعی مایوس ہوگئی۔ انہی خیالات میں غلطاں پیچاں لیٹی ہوئی تھی کہ آنکھ لگ گئی۔ دیکھتی کیا ہے کہ ایک شخص سامنے کھڑا کہہ رہا ہے:۔

"توصیف! خدا کا اصلی گھر تو بچھڑے ہوئے کلیم کی ماں کا دل تھا۔ تو نے اس کی مامتا کی قدر کی۔ تیرا بچہ تجھ کو مبارک ہو۔ تو نے غریب کلیم کو دلوا دیا۔ اُٹھ تو بھی اپنے کلیم سے مل"

توصیف ابھی خواب ہی دیکھ رہی تھی کہ موسیٰ کی اس آواز نے اُسے چونکا دیا۔ "الٰہی! تیرا شکر ہے۔ بخار اُتر گیا"

گھبرا کر اُٹھی تو بچہ پسینے میں نہا رہا تھا۔ اور بخار کا پتہ تک نہ تھا۔

تنقیدات

از مولینا عبدالحق مدظلہٗ

۱۔ زبان اردو پر سرسری نظر

یہ ان شبانہ لیکچروں میں سے ہے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے گذشتہ اجلاس میں پڑھے گئے تھے۔ اس اجلاس کا یہ خاص امتیاز تھا کہ بہت سے قابل اور فاضل حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ کانفرنس میں علمی اور تعلیمی مسائل پر تقریریں فرمائیں اور جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب قابل شکریہ ہیں کہ ان کی بدولت کانفرنس کے اس اجلاس میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔ اور علمی چرچا پیدا ہو گیا۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی اردو لکچرار مسلم یونیورسٹی نے اُردو زبان پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ جو اب کسی قدر اضافے کے ساتھ کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے۔

اس مقالے میں قابل لکچرار نے اُردو کی تاریخ سے زیادہ بحث نہیں کی۔ اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ بلکہ اُردو کی موجودہ روش اور آئندہ ترقی کی تدابیر پر بہت دلچسپ بحث فرمائی ہے۔ جس میں مختلف مسائل آ گئے ہیں۔ جن میں

اختلاف اور بحث کی بہت گنجائش ہے۔ صدیقی صاحب نے اُردو کے جدید دور کو غالب سے شروع کیا ہے اور اس نامور شاعر کو جو اپنا مثل اُردو ہی میں نہیں بلکہ بہت سی زبانوں میں نہیں رکھتا۔ چند ہی سطروں میں ختم کر دیا ہے۔ اور مرزا صاحب کی شاعری پر جو نقّادانہ رائے اُنہوں نے فرما دی ہے۔ وہ قابل سننے کے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے و ہو اور ناو نوش کی ترجمان ہے"۔

یہ رائے ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے جس نے اُردو ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ خود بھی ادیب ہے اور یونیورسٹی میں اُردو کا لکچرار ہے۔ اور اس لئے نہایت حیرت انگیز ہے۔ ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں کوئی "پیغام" MESSAGE نہیں ملتا۔ کیا شکسپئر کی شاعری میں جو سرتاج شعرائے عالم ہے کوئی "پیغام" ملتا ہے؟ ایک نہیں۔ کئی کئی۔ یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے۔ کیا یہ کچھ کم ہے کہ مرزا غالب نے اُردو شاعری کو پستی سے نکال کر کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ غزل میں عام روش اور تقلید سے آزاد ہو کر نیا رنگ پیدا کیا (لیکن شاید صدّیقی صاحب غزل میں کسی اصلاح کے قائل نہیں)۔ خیالات کی جدّت۔ تخیّل کی بلندی اور بیان کا لُطف جو مرزا غالب کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہ اُردو کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتا۔ میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں۔ جنہیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے کے کلام میں کیا، مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ملے۔ اور اُن پر مرزا کے کلام کا خاص اثر ہوُا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ مرزا غالب کا اثر اُردو شاعری پر عجیب و غریب ہوُا ہے اور رہے گا۔

کیا بغیر کسی پیغام کے یہ ممکن ہے؟ صدیقی صاحب اس بات سے بھی ناراض ہیں کہ مرزا صاحب کا قدیم کلام کیوں چھاپا گیا (شاید وہ اسے مہمل سمجھتے ہیں)۔ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اُردو نوازی کے اس سے بہتر طریقے بھی ممکنات سے تھے"۔ یہ خیال اُردو کے ایک پروفیسر کا ہو۔ حیرت سے خالی نہیں! غالباً انہوں نے اس کلام کا مطالعہ نہیں فرمایا۔ ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ جن ظالموں کے ہاتھ میں مرزا کے کلام کا اِنتخاب تھا انہوں نے بیدردی سے ایسے ایسے اشعار مجروع کر دئے۔ جن کی نظیر سوائے مرزا

کے کلام کے کہیں نہیں ملتی۔ علاوہ اس کے اس کلام سے اس زبردست اور بلند خیال شاعر کی طبیعت اور اس کے اکلام کے ارتقا کی صحیح حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس کا جاننا ایک پروفیسر اور محقق کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ صدیقی صاحب ان امور کو "واقعات کی کھتونی" سمجھیں۔ لیکن اس کے جانے بغیر محقق ہونا ممکن نہیں۔ صدیقی صاحب کے اس طعن آمیز اعتراض (اُردو نوازی) کو دیکھ کر جس کی تلخی لِبس سے کم نہیں۔ مجھے معاً ایک دوست کا خیال آیا۔ جنھوں نے ایک بار بڑی متانت سے یہ فرمایا کہ "آپ جو شعرا کے تذکرے اور شعرا کا کلام چھاپتے ہیں۔ اس سے کیا حاصل ہے؟ کہیں بہتر ہوتا کہ انجمن صابون سازی اور دباغت پر کتابیں لکھوا کر چھاپتی"۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے لاجواب ہونا پڑا۔ اور یہی کیفیت میں آج پھر محسوس کرتا ہوں ؀

اس کے بعد قابل لکچرار نے حالی کا ذکر فرمایا ہے اور شکوۂ ہند کے چند شعر لکھ کر یہ رائے دی ہے کہ "چونکہ اُن کی ہر تان ماضی پر ٹوٹتی ہے۔ اس لئے حالی کو بجا طور پر ماضی کا شاعر کہنا چاہئے"۔ لیکن اسی جملے کے پہلے حصّے میں فرماتے ہیں کہ "حالی نے اپنے زمانے کی صحیح مصوّری کی ہے اور ان معنوں میں ان کا شمار حقیقی شعرا میں ہو سکتا ہے"۔ بظاہر ان دونوں جملوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو مطلب ہے وہ ظاہر ہے۔ اپنے زمانے کی صحیح تصویر کھینچنے والا "ماضی" کیسے ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حال کو ماضی سے جدا نہیں کر سکتے اور ہر حال ماضی ہو جاتا ہے۔ لیکن مولانا حالی مرحوم نے اپنے وقت کے حال پر اس کثرت سے لکھا ہے کہ اُن کو بجا طور پر حالی ہی کہنا موزوں ہوگا پھر انسانی فطرت کے متعلق جو جو نکتے وہ لکھ گئے ہیں۔ ان کا جواب اب تک ہماری شاعری میں نہیں ہے البتہ شوخی اور تمسخر ان کے کلام میں نہیں۔ اور نہ وہ وقت ان خوش فعلیوں کا تھا۔ کسی مصنّف یا شاعر پر اس وقت تک صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ جب تک انسان اس کے پورے کلام کا مطالعہ نہ کر لے۔ ورنہ ایسی رائیں ادھوری اور ناقص ہونگی ؀

حالی کے بعد اکبر کا ذکر آتا ہے اور بہت سے شعر نقل کر کے جن میں سے اکثر زبان زد عام ہیں۔ ان کی شوخی ظرافت اور حکیمانہ نکات کی تشریح کی ہے۔ ان اشعار کو صدّیقی صاحب "لسان العصر کے ملہمات" فرماتے

ہیں ؛

یہاں تک ماضی و حال کی ترجمانی تھی۔ اب مستقبل شاعر کا ذکر ہوتا ہے۔ جس سے ان کا مطلب اقبال سے ہے۔ یہ بیان بہت طویل اور پُر زور ہے۔ اور قابل لکچرار نے اپنی طبیعت کا سارا زور اس پر صرف کر دیا ہے۔ اقبال کی شاعری سے انکار کرنا کفر ہے۔ اور نہ ہمیں اس سے چنداں اختلاف ہے جو صدیقی صاحب نے اس حقیقت شناس شاعر کی مدّاحی میں بیان کیا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اقبال کا جس قدر کلام انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ وہ سب کا سب فارسی ہے۔ اُردو کا ایک شعر بھی کہیں نقل نہیں کیا۔ حالانکہ بحث سراسر اُردو سے ہے؛

صدیقی صاحب مُردوں سے بہت بیباک ہیں۔ لیکن زندوں سے ڈرتے ہیں۔ اُنہوں نے ہر زندہ انشا پرداز کی جو ذرا بھی شہرت رکھتا ہے یا مقبول ہے۔ خوب تعریف کی ہے۔ اور اگر کہیں کسی کے متعلق ہلکا سا دبی زبان سے کوئی جملہ کہ دیا ہے۔ تو جھٹ اس کی پیٹھ بھی تھپک دی ہے۔ تاکہ وہ چیں بجبیں نہ ہونے پائے۔ میں اس کی داد دیتا ہوں کہ کوئی نام ایسا نہیں چھوٹنے پایا جس سے ذرا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے ؛

اس کے بعد اُردو زبان اور اس کی ترقی کے متعلق مختلف مسائل پر بحث کی ہے۔ مثلاً تاریخی پہلو۔ رسم الخط فارسی عربی کا تعلّق۔ اُردو کے معلّم کی صفات۔ عامیانہ روش (جسے قابل لکچرار نے "چھانپلزم" سے موسوم کیا ہے) انجمن اُردوے معلّی۔ کانفرنس معلّمین۔ اُردو اکاڈمی۔ انسائیکلو پیڈیا، اُردو مکاتب۔ اُردو گفتگو۔ ترجمہ۔ تالیف اور تصنیف۔ افسانہ نویسی۔ یہ بحثیں اگرچہ مختصر ہیں۔ مگر بہت دلچسپ اور کام کی ہیں۔ انہیں پڑھ کر جی للچاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے۔ لیکن اس تبصرے میں اتنی گنجائش نہیں۔ صدیقی صاحب نے بعض ایسی باتیں سجھائی ہیں۔ جو غور اور بحث کے قابل ہیں اور ان میں سے ہر عنوان پر علیحدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس لکچر کا ایک بڑا عملی فائدہ یہ ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انجمن اُردوے معلّی قائم ہو گئی۔ یہ بڑی مبارک فال ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ صدیقی صاحب کی پُرجوش نگرانی میں یہ پھولے پھلے گی۔ ارباب یونیورسٹی کو اس پر خوش ہونا چاہیئے اور اس کی امداد میں دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ یہ بھی تجویز ہے کہ اس انجمن کی سرپرستی میں

ایک رسالہ "اردوے معلّی" کے نام سے جاری کیا جائے گا ؛

صدیقی صاحب قابل شکریہ ہیں کہ انہوں نے اس لکچر کو شائع کرکے اردو کے بہی خواہوں کو بعض ضروری امور کی طرف متوجہ کیا ہے۔ان کے طرز بیان میں ایک بانکپن پایا جاتا ہے۔ جس میں شوخی کی جھلک ضرور ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات لفّاظی کے الجھاؤ سے اُلجھن پیدا ہونے لگتی ہے۔ صدیقی صاحب اُردو کے اُن انشا پردازوں میں سے ہیں جن سے بڑی بڑی امیدیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ طبیعت کی افتاد اُنہیں کدھر لے جاتی ہے۔جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی میں بگڑنے کے لچھن بھی ہوتے ہیں ؛

۲۔اصلاح سخن

(مرتبہ جناب محمد عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی ۔ صفحات ۲۳۰)

عنوان سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے۔ لیکن اصلاحیں جس ڈھب سے حاصل کی گئی ہیں وہ عجیب و غریب ہے اور قابل مرتّب کی جدّتِ طبع پر دلالت کرتا ہے۔ ہماری شاعری میں اساتذہ کی اصلاحیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اور بعض اصلاحیں جو قدیم اُستادوں کی دستیاب ہوئی ہیں یا مشہور چلی آتی ہیں۔وہ بڑی آب و تاب اور فخر کے ساتھ تذکروں یا اسی قسم کی دوسری تالیفات میں درج کی جاتی ہیں۔کچھ عرصہ ہوا ہمارے عنایت فرما جناب صفدر مرزا پوری نے بھی ایک کتاب اسی مضمون کی شائع کی تھی۔مگر اس میں اور اس میں فرق ہے۔وہ قدیم اساتذہ کی اصلاحیں تھیں اور یہ ہمعصر شعرا کی ہیں۔ان اصلاحوں کے بہم پہنچانے میں جناب شوق نے بڑی ستم ظریفی سے کام لیا ہے۔ حضرت نے ایک ہی غزل ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مشہور شعرا کی خدمت میں بھیجی اور شاگردی کے ادّعا کے ساتھ اصلاح کی درخواست کی۔ بعض کی خدمت میں تو باقاعدہ شیرینی کے دام پیش کرکے شاگردی کی رسم ادا کی ہے ان بزرگواروں نے حسب معمول شاگردی سمجھ کر غزل میں اپنی فہم کے موافق اصلاح دی اور از راہ استادی کچھ کچھ ہدایتیں بھی کیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی سولہ غزلوں کو جن پر کم و بیش ۲۵ نامور اور مستند شعرا کی اصلاحیں ہیں اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ اصلاح کا یہ سلسلہ کوئی پانچ سال تک

رہا۔ایک اقبال اور اکبر مرحوم تو ان کے دام میں نہیں آئے۔ باقی کوئی ان کی زد سے نہیں بچا۔ بعض نے دبی زبان سے پیچھا چھڑانا چاہا مگر حضرت شوق کب ماننے ہیں۔ سر ہو گئے شاگرد ہو کے رہے۔ اصلاح لے کے چھوڑی۔ بعض حضرات کو جب اس کی سن گن معلوم ہوئی کہ ان کی اصلاحی غزلیں دوسری جگہ بھی اسی غرض سے گئی ہیں تو انہیں شبہ ہوا اور حضرت شوق سے دریافت کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوق صاحب نے کچھ ایسی تھپکی دی کہ وہ خاموش ہو گئے۔ استادی کا شوق بھی بُرا ہوتا ہے جل میں آ گئے اور برابر اصلاحیں دیتے رہے۔ انہیں اصلاحوں کی یہ رپورٹ ہے جو چھپ کر ہمارے سامنے آئی ہے ؛

ترکیب کتاب کی یہ ہے کہ پہلے جلی قلم سے اپنی پوری غزل لکھ دی ہے۔ اس کے بعد ہر صفحے کے شروع میں اپنا ایک ایک شعر جلی قلم سے لکھا ہے، اور حاشیئے پر اساتذہ کے نام لکھے ہیں۔ اور صفحے کے متن میں اصلاح نقل کر دی ہے۔ جس شعر پر کسی استاد نے کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ بھی اصلاح کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ جن حضرات نے جن اشعار پر صاد بنایا ہے۔ وہاں (ص) بنا کر ان کے تخلص لکھ دئے ہیں۔ اور جن حضرات نے شعر میں کوئی ترمیم نہیں کی۔ ان کے نام ہر صفحے کے آخر میں لکھے ہیں اور کوئی نشان نہیں بنایا ہے۔ اگر کسی استاد نے کمال شفقت سے اسی زمین میں کچھ اشعار نذر کئے ہیں۔ تو وہ بھی نام کی صراحت کے ساتھ نقل کر دئے ہیں ؛

اس مجموعے کو دیکھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ ہنسی تو حضرت شوق کی شوخی پر آئی۔ اور افسوس ان بزرگوں کی سادگی پر ہوا۔ خیر اس کا کچھ مضائقہ نہ تھا کہ وہ یہ سب اصلاحیں چھاپ دیتے۔ لیکن غضب یہ کیا کہ کتاب کے آخر میں اُن صاحبوں کے وہ تمام خطوط بھی شائع کر دئے جو انہوں نے زمانۂ اصلاح میں اپنے سعادت مند شاگرد کو لکھے تھے۔ ان سادہ دل بزرگوں نے شاگرد سمجھ کر کمال بے تکلفی اور سادگی سے جو جی میں آیا لکھ دیا ہے۔ وہ کیا جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ایک صاحب شاگردی کی مٹھائی مانگ رہے ہیں۔ دوسرے اپنے دیوان کے مصارف کے لئے چندے کا اصرار فرما رہے ہیں۔ تیسرے صاحب نے شاگردی کی مٹھائی کے ساتھ استاد کی خدمت کا بھی صاف صاف اشارہ کیا ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ

جواب کے لئے آدھ آنے کا ٹکٹ جو بھیجا ہے تو کیا اب سندیلے میں لڈو نہیں بنتے ؛ ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا شاگرد رشید یہ بھانڈا چوراہے میں پھوڑے گا۔ غرض حضرت شوق نے اپنے "اساتذۂ کرام" کا نام اچھالنے اور ان کی رسوائی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ جناب شوق اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ" اس درمیان میں (یعنی زمانۂ اصلاح) اساتذہ کے جو خطوط لکاتِ ادبیہ کا گنجینہ نظر آئے وہ بھی ضمیمے کے طور پر آخر کتاب میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ اگر کسی استاد کو یہ امر کچھ ناگوار گزرے تو مجھے معاف کریں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ضیافتِ طبع ارباب ذوق کے لئے کیا ہے اور اساتذۂ معتبرہ کے فیوض عام کرنے کے لئے "

اوّل تو یہ خط نکاتِ ادبیہ کا ایسا گنجینہ نہیں جیسا کہ حضرت شوق فرماتے ہیں۔ اور اگر کچھ ادبی بحث ہے بھی تو چاہیئے تھا کہ وہی خط چھاپتے جن کا تعلق ادب سے ہے۔ غیر متعلق خطوط یا خطوط کے ایسے حصّوں کے چھاپنے سے جن میں کوئی ادبی بحث نہیں۔ ان کا کیا مقصد ہے ؟ شاید" ضیافتِ طبع ارباب ذوق" مدّ نظر ہو۔ طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور ستم ہے۔ ہمارے خیال میں ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی خطوط بغیر اجازت کے شائع کرتے مگر شاگرد تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے۔ اُسے اجازت کی کیا ضرورت ہے ؟

ظاہر ہے کہ جب یہ سفینۂ زرّیں حضرات اساتذہ کی خدمت میں پہنچے گا تو بہت جھنجھلائیں گے۔ بگڑینگے۔ خفا ہوں گے۔ مگر اس سے کیا حاصل ؟ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ مصلحت یہ ہے کہ اب خاموش رہیں اور اس سے عبرت حاصل کریں۔ اور شاگردوں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجّہ ہوں ؛

اب رہی اصلاح جس کے مفید ہونے پر بڑا طومار باندھا گیا ہے۔ سو واجبی ہی واجبی ہے۔ بعض صاحبوں نے اصلاح کے سوق میں سرے سے مضمون ہی بدل دیا ہے۔ کوئی صاحب مطلب نہیں سمجھے۔ اور شعر کاٹ کے رکھ دیا ہے۔ کسی نے صلاح دے کر شعر کو پست کر دیا ہے اور کہیں مضمون ہی خبط ہو گیا ہے البتہ کہیں کہیں کوئی اصلاح اچھی بھی نظر آ جاتی ہے۔ خیر جو صاحب بصیرت ہیں۔ وہ تو ان اصلاحوں کو دیکھ کر ان کی حقیقت

سمجھ لیں گے لیکن جو مبتدی ہیں یا جنہیں شعر کہنے کا نیا نیا شوق ہوُا ہے۔ اُنہیں بڑی اُلجھن پیدا ہوگی اور کچھ تعجّب نہیں کہ وہ اصلاحوں کے اس طومار سے گم راہ ہو جائیں۔ جہاں حضرت شوق نے اتنا کھڑاگ کیا ہے۔ اگر وہ ہر شعر کی اصلاحوں پر ایک مختصر سا محاکمہ بھی ساتھ ساتھ لکھ دیتے تو بہت اچّھا ہوتا۔ اور اس حالت میں یہ کتاب کچھ نہ کچھ ضرور مفید ہو جاتی ؂

اس کتاب میں ایک دوسری جدّت یہ ہے کہ حضرت نیاز فتح پوری صاحب نے تو شروع میں کتاب کی تقریب لکھی ہے۔ دیباچہ ہمارے محترم مولینا شرر مدّظلہٗ نے تحریر فرمایا ہے۔ مقدمہ جناب سلطان حیدر صاحب جوش نے لکھا ہے۔ تبصرے جناب امیر احمد صاحب علوی اور ہمارے شفیق مکرم جناب ڈاکٹر صدّیقی صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ سب تحریریں سنجیدہ اور بڑی شان کی ہیں۔ اور پڑھنے کے قابل ہیں ؂

ہم بھی جناب شوق کے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ادبی تفریح کا ایسا اچھا سامان جمع کیا ہے جو کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا اور جو محنت اور کاوش انہوں نے اس میں اُٹھائی ہے وہ فی الحقیقت قابل داد ہے +

سی پارۂ دل
از حضرت خواجہ حسن نظامی
من کہ ایک دھوبی
کاغذی گھاٹ پر

جا ری جا! میں روٹی نہیں کھاتا۔ چاولوں کی تیج ادھر کنارے پر رکھ دے اور ایک چلم بھر کر لا ؂

چھوا چھو۔ چھوا چھو۔ چھوا چھو +

کیوں ری نتوا کی ماں! دریا کا پانی گدلا۔ صابن کم۔ میں کیونکر ان میلے کپڑوں کو صاف کروں؟

چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ؂

دیکھو درخت کا پتّہ سُوکھ کر گرا ۔ ہوا اُڑا کر لے چلی ۔ اب خبر نہیں ۔ یہ بچھڑا ہُوا کب ملے گا ؟

چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ؂

میرا بیل ہاتھیوں سے بڑا ۔ گھوڑوں سے تیز ۔ ریل سے زیادہ تابعدار ۔ پھر تو کہتی ہے کہ امیر بڑے ہوتے ہیں ۔ ان میں بڑائی میرے دم سے ہے ۔ میں اُجلے کپڑے نہ پہناؤں تو ان کی عزّت دو کوڑی کی ہو جائے ؂

چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ؂

بھر لے حُقّہ مار لوں گھونٹ بپتا چھا گئی چاروں کھونٹ

سُنتی ہے ! اس کاغذی گھاٹ پر آئی ہے ۔ چیزی چولا دھلوانے لائی ہے ۔ تو میری بات مان ! یہ چولا من کے صابن سے دُھلے گا ۔ جس کو پریم کی بھٹی میں چڑھاؤں گا ۔ نیچے آگ جلاؤں گا اور پھر یہ گاتا جاؤں گا ؂

او ———————— ہو ———————— او

کیوں رے چولے ! کاٹوں تیرا میل ۔ پانی اُبلا ۔ جوش میں آیا تو گھبرایا ۔ میل کٹا ۔ پاک ہوا ۔ صاف ہوا ۔ اب کیسی سی سی آہ !

او ———————— ہو ———————— او

چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ؂

یہ تن ۔ وہ من ۔ تو دھوبن میں دھوبی ۔ سب ہیں ساجن ۔ تو دھوبن میں دھوبی ؂

چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ؂

کہنے دے ہم کمین ہیں ۔ ہم موٹے وہ مہین ہیں ۔ دیکھتی نہیں سارے باریک میرے ہاتھ میں ہیں اور میں ان کو پتھر پر پٹخار رہا ہوں ؂

چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ؂

یثرب نگر کے چودھری نے کہا ۔ جو سارے سنسار کے میلے تنوں کو دھونے آیا تھا ۔ اسلام غریبوں سے شروع ہوا ۔ اور پھر غریبوں میں آجائیگا تو بس ہم تم دونوں اپنے چودھری کے بیان پر مگن ہیں ۔ اسلام ہم میں ۔ ہم اسلام میں ۔ اور سب امیر پیسے والے من و تو کے کلام میں ؂

چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ۔ چھُوا چھو ؛

(۲)

چھیُو رام ۔ چھیُو ۔ چھیُو ؛

پکا پکوکر وہیں دھریا ۔ لے جا ری وہیں دھریا ۔ تجھ سے اتنا کہا ۔ میں روٹی نہیں کھاتا ۔ اَن اور جَل دو بہن بھائی ہیں ۔ اَنُ نے باوا آدم کو جنّت سے نکالا ۔ جَل نے پاؤں میں بیڑی ڈالی ۔ آدھی رات سے اس دریا میں کھڑا ہوں ۔ اور پانی کا قیدی ہوں ۔ جب جُل نے جلایا تو اس کی بہن اَنُ سے کیا محبت ہو ؟

چھیُو رام ۔ چھیُو ۔ چھیُو ۔ چھُوا چھو ۔ چھیُو ؛

ندی کنارے میں کھڑی اور پانی جھل مل ہوئے
میں میلی پیا اُجلے ری میرا کس بدھ ملنا ہوئے

چھیُو رام ۔ چھیّا ۔ چھیّا ؛

کپڑے دھوئے ۔ ساری عمر دریا کے کنارے گزر گئی ۔ مگر اپنا آپا میلا کا میلا رہا ۔ صاف ستھرے اور اُجلے پیا کی نظروں میں میری کیا قدر ہوگی ۔ اور اُس تک کیونکر پہنچنا نصیب ہوگا ؟

چھیُو رام ۔ چھیُو رام ۔ چھُوا چھو ؛

اچھا ری ! ذرا ایک بات اور سنتی جا ۔ دیکھو ۔ خدا آسمان کی کھڑکی میں جھانک کر مجھ سے کچھ کہتا ہے ۔ پورا تو سمجھ میں نہیں آیا ۔ سوائے اس کے کہ اس نے کہا ؎

رام جھروکے بیٹھ کے سب کو مُجرا لے
جیسی جا کی چاکری ویسا وا کو دے

تو جب اُس کی دین چاکری پر ہے تو لا میں بھی اس دریا میں جہاز چلاؤں ۔ دھوبی کیوں کہلاؤں امیرالبحر کیوں نہ بنوں ۔ اس سنسار میں

کرن کی بھرن

ہے ۔ جو کرتا ہے پاتا ہے ۔ میں نے ساری عمر کپڑے دھوئے ۔ پیسے ٹکے پر نیت رکھی ۔ اتنا ہی ملا ۔ خیال آگے بڑھاتا ۔ رام زیادہ بھجواتا ؛

چھیُو رام ۔ چھیّا رام ۔ ہوا چھیُو ؛

اری ننوا کی ماں! تُو تو خفا ہو گئی۔ کہاں چلی گئی۔ لا میں روٹی کھا لوں۔ تو جا مت! تیرا خیال ہوگا کہ میں تیرے خفا ہونے کی پروا نہیں کرونگا۔ اری! مجھ کو تو اس کا بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ اور دل میں بڑی جلن ہوتی ہے ؁

سائیں تیں مت جانیو توہے چھوڑت موہے چین
گیلے بن کی لاکڑی سُلگت ہوں دن رین
چھی ہو۔ چھی ہو۔ چھیا۔ رامہ چھیّا ؁

اری کل رات کا خواب سُن! میں نے دیکھا۔ ایک سُندر عورت اپنے بالم کو مایوس پنے سے دیکھ رہی ہے۔ مگر مُنہ سے کچھ نہیں کر سکتی۔ اتنے میں اُس کا پیتم پیارا کہیں چلا گیا۔ اور وہ ہاتھ ملنے لگی کہ ہائے! میں تو دو باتیں بھی نہ کرنے پائی تھی کہ پیا بچھڑ گئے ؁

میں نے کہا۔ تو کون ہے؟ اور یہ مرد کون تھا؟ عورت بولی۔ میں رُوح یعنی آتما ہوں اور یہ مرد پریم شکتی (مظہرِ عشق) ہے یہ خواب دُنیا ہے اور عالم اسباب ہے۔ اس عورت کی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس نے جو دوہا پڑھا تھا۔ وہ یاد ہو گیا ؎

سُپنے میں مورے پی ملے کہ نہ سکی کچھ بات
سوتی تھی۔ روتی اُٹھی۔ مَلت رہی دو ہات
رامہ چھیّو۔ چھُوا چھو۔ چھیّو ؁

ہاں ننوا کے باپو! یہ تو بتا تو میرا پیا۔ میں تیری پیاری۔ تو میرا دھوبی میں تیری دھوبن۔ پھر یہ پپیہا پی کہاں! کیوں پکارتا ہے؟ اس کو پی پی کہنے کا کیا حق ہے؟

تو کپڑے دھو چکے تو کچہری جائیو۔ اور پیا پیارے کے نام کو انگریز بہادر سے اپنے نام لکھوا لائیو۔ اس کے بعد پپیہا پی کو پکاریگا تو میں نالش کر دوں گی ؁

نہیں ننوا کی ماں! یہ تیری غلطی ہے۔ پی کا پکارنا۔ پیا کا پیارا بننا آسان نہیں ہے۔ دیکھو بھونرا کیسا کالا ہوتا ہے مگر پی کی محبّت میں اس کے منہ کی رنگت زرد ہوتی ہے۔ اری! اس پریم کی بڑی کٹھن بٹیا ہے۔

پپیہا بھی جھوٹ موٹ پی کو پکارتا ہے۔ اور تو بھی خواہ مخواہ اس میں جھگڑا کرتی ہے۔ اری! جن کے من میں پی بستا ہے۔ ان کے مُنہ زرد پڑ جاتے ہیں۔

جا من میں پیا بسے وا مکھ پیرا ہوئے

جالے جا ری! وہیں دھریا۔ پکا پکو کر وہیں دھریا ؛

ننوا کے باپو! یہ رات کو چکوا چکوی آپس میں کیا کیا باتیں کرتے تھے، میں نے تو اتنا سُنا کہ چکوا جمنا کے اس پار اپنی چکوی کو پکارتا تھا۔ اور چکوی اس پار اپنے چکوے کو آواز دیتی تھی۔ جب ان کے پَر تھے تو یہ اُڑ کر پاس کیوں نہیں جاتے تھے؟

دیوانی! اس پریم کی ہزاروں ریتیں ہیں۔ کہیں پروانہ چراغ پر آن کر جل جاتا ہے۔ کہیں بلبل پھول کو گلے لگاتا ہے۔ لوہے کو مقناطیس کی محبّت دی گئی ہے کہ دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کی طرف دوڑتا ہے تنکا کہربا پر فریفتہ ہے۔ دیدار پاتا ہے۔ تو لپک کر سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ مگر چکوے چکوی کی محبّت یہی ہے کہ وہ جدائی کی بہار دیکھیں۔ وہ آپس میں مل نہیں سکتے۔ ساری عمر ترستے رہتے ہیں۔ اسی واسطے تو کہا ہے کہ چکوے چکوی کو نہ ستانا۔ وہ خود محبّت کے ستائے ہوئے۔ جدائی کے صدمے اٹھائے ہیں ؛

چھیئو رام - چھیئو - چھیئو ؛

ننوا کے باپو! تو کل کہاں تھا؟ ثیرب نگر میں ہمارے چودھری سارے سنسار کے تنوں کو دھونے آئے تھے۔ اس کا بھید مجھ کو بتا کہ یہ کیا بات تھی؟

اوہو۔ تو تو بڑی مورکھ ہے۔ چل تجھے قوالی میں لے چلوں۔ وہاں یہ بھید سمجھ میں آجائے گا۔ قوال گا رہے تھے :-

میری میلی گدڑیا دھو دے

دھوبی نے کہا۔ یہ میلی گدڑی ساری دُنیا ہے۔ خود ہمارے وجود ہیں۔ اور ان گناہوں اور شک وشبہ کے دھبّوں کو صاف کرنے کے لئے خدا نے ثیرب نگر میں جو عرب میں ہے اور جس کو مدینہ بھی کہتے ہیں۔ ایک بڑے چودھری کو پیدا کیا جس نے سارے جہان کے دھبّے دور کر دئے۔ اور یہ سب میلی گدڑیاں دھو کر رکھ دیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ میں بیچارہ غریب دھوبی کاغذی گھاٹ پر کپڑے دھولے آیا ہوں ؛

مشاہداتِ سائنس

از سیّد محمّد عمر حسنی

آسمانی بجلی

ہر شخص نے بجلی کا طوفان دیکھا ہے۔ جس میں چمک اور گرج دونوں ہوتی ہیں۔ کبھی یہ بارش سے قبل ہوتا ہے۔ اور اکثر اس وقت ہوتا ہے۔ جب گرد و غبار آسمان پر زیادہ ہو یا آندھی آتی ہو۔ بارش سے قبل کا اکثر خطرناک ہوتا ہے۔ اور بجلی گرنے کے حوادث اکثر ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہو یا ہو چکی ہو تو بھی یہ طوفان دیکھنے میں آتا ہے مگر بجلی گرنے کا حادثہ کم ہوتا ہے۔ ابتدائی قومیں جن کے دماغی قوا نشو و نما اور تربیت یافتہ نہیں ہوتے۔ ہر مظہرِ قدرت کو دیوتا سمجھتی ہیں اور بجلی کو اکثر پوجتی ہیں۔ یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں یورپ میں خیال پیدا ہو گیا تھا کہ گرجوں کے اگر گھنٹے بجائے جائیں تو طوفان ٹل جائے گا۔ اور جب طوفان آتا تھا تو گھنٹے بجائے جاتے تھے۔ چنانچہ یورپ کے کسی گاؤں میں اسی طرح طوفان آیا اور تمام گاؤں کے لوگوں نے رسّیاں پکڑ کر گرجے کے گھنٹے بجانا شروع کئے۔ اتفاق سے اسی وقت بجلی گرجے پر گری۔ اور یہ سب فنا ہو گئے۔ یہ محض جہالت کا سبب ہے۔ ہندوستان میں بھی لوگ بجلی کے متعلق عجب عجب توہمات رکھتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سیاہ یا سُرخ کپڑے پر بجلی زیادہ گرتی ہے۔ بعض کی رائے میں کالے سانپ پر یا دودھ والے جانور پر گرتی ہے نیز اس شخص پر جو اُلٹا پیدا ہوُا ہو یا جس کی جیب میں کنجیاں یا چاقو یا اور دھات کی چیز ہو۔ اسی طرح کے اور لغو خیالات بھی عوام میں پھیلے ہوئے ہیں ؛

مندرجہ ذیل مضمون میں ہم سائنٹیفک وجہ بجلی کے طوفان کی سمجھائینگے: اور پھر یہ بھی بتائیں گے کہ بجائے گھنٹے وغیرہ بجانے کے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جس سے مکان اور جان محفوظ رہ سکیں ؛

سب سے پہلے امریکن طبیعی بنجمن فرینکلن نے ۱۷۵۲ء میں یہ دریافت
کیا کہ مصنوعی بجلی یعنی وہ جو رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ یا مشین وغیرہ سے تیار
ہوتی ہے۔ اور آسمانی بجلی ایک ہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ مطیع ہے
اور ہم اسے بنا سکتے ہیں۔ اور قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ اور یہ آسمانی نہ
ہمارے قابو کی ہے اور نہ اس پر ہم نے اب تک اپنا اثر جمایا ہے۔ بلکہ
کبھی کبھی یہ ہم کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے ایک
پتنگ ریشمی کپڑے کا بنایا۔ اس پر ایک تانبے کا تار لگا کر اور ایک
ڈور باندھ کر اس پتنگ کو آسمان پر چڑھا کر بیچ ایک ریشمی رومال
سے اُسے پکڑا۔ مگر ڈور میں ایک کنجی بھی باندھ دی۔ جب کنجی کے پاس
کوئی ہاتھ لے جاتا تھا تو چنگاریاں نکلتی تھیں۔ اسی ڈور سے اس نے
اپنا لیڈنی مرتبان LYEDEN JAR بھر لیا۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ
اس بجلی میں جو زمین پر ہے۔ اور اس میں جو آسمان پر ہے کچھ فرق
نہیں ہے۔ یہ نظریہ فرینکلن نے انیسویں صدی کی ابتدا میں معلوم کر
لیا تھا۔ اور اسی بنا پر اس نے برق ربا LIGHTNING CONDUCTOR
بنایا۔ جو مکانوں برجیوں اور مناروں پر لگایا جاتا ہے۔ ایک روسی پروفیسر
اسی قسم کا تجربہ کرنے میں ہلاک ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اس ریشمی رومال کی
احتیاط نہیں کی تھی۔ جو فرینکلن نے اپنے ابتدائی تجربے میں کی تھی ؛

یہ اٹھارویں صدی ہی میں معلوم ہو گیا تھا۔ کہ بادلوں میں دو قسم
کی بجلی ہوتی ہے۔ ایک کا "مثبت" دوسری کا "منفی" نام رکھا گیا۔ رسماً یہ
مان لیا گیا کہ مثبت سے منفی کی طرف بجلی رواں ہوتی ہے یا یوں سمجھئے
کہ جس طرف سے بجلی آتی ہے اس کا نام مثبت رکھا ہے۔ اور جدھر جاتی
ہے۔ اس کا نام منفی رکھا ہے۔ مقناطیس کے مانند غیر جنس بجلی ایک دوسرے
سے ملنے کی کوشش کرتی ہے۔ اور ہم جنس سے گریز کرتی ہے۔ یعنی دو
تار مثبت کے برابر رکھ دیں تو ایک دوسرے کو دھکیلیں گے اور ان کی
بجلیاں آپس میں نہیں ملیں گی۔ مگر جب مثبت اور منفی برابر رکھ دئے
جائیں تو بجلی کی کوشش ہوگی کہ بیچ میں ہوا کو توڑ کر ایک دوسرے سے
مل جائیں۔ اس میل کے وقت ایک قسم کا شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور سنّاٹے
کی آواز آتی ہے۔ معمل (LABORATORY) میں ومسہرسٹ WHIMSHURST مشین

ایک عام چیز ہے اس میں سے کئی کئی انچ لمبا شعلہ نکل سکتا ہے۔ اور شاید ہی دنیا میں کوئی بجلی کا طالب علم ہوگا جس نے نادانستگی میں اس کے تار کا جھٹکا نہ کھایا ہو۔ اس مشین میں کئی ہزار وولٹ[1] پیدا ہوتے ہیں۔ مگر چونکہ اس میں رَو کم ہوتی ہے۔ اس لئے آدمی نہیں مرتا۔ بادلوں میں بھی یہی دو قسم کی بجلی پائی جاتی ہے۔ جب ایک بادل دوسرے (مختلف قسم کی بجلی کے) بادل کے قریب آ جاتا ہے تو ایک میں سے بجلی دوسرے میں بھر جاتی ہے اور چمک پیدا ہوتی ہے۔ بعض وقت اس کے ساتھ جو سناٹا ہوتا ہے۔ دُوری کی وجہ سے اور اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہم نہیں سن سکتے۔ اور بعض وقت جب یہ سناٹا زور کا ہو تو گرج ہم کو سنائی دیتی ہے۔ ایسی بجلی جو ایک بادل سے دوسرے بادل میں سرایت کرے اُسے برق نشرشف SHEET LIGHTNING کہتے ہیں ÷

بعض اوقات ایک بادل سے دوسرے بادل اور دوسرے سے تیسرے میں بجلی بھرتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس میں اس قدر زور ہو جاتا ہے کہ ہوا نہیں روک سکتی۔ اور یہ زمین پر گرنا چاہتی ہے۔ بجلی کی ایک چمک بعض اوقات سیکنڈ کے کئی لاکھویں حصّے کے وقفے کی ہوتی ہے۔ مگر اس کی شدّت کی وجہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ زیادہ دیر چمکتی رہی۔ اس میں کروڑوں گھوڑوں کی قوت ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ اب تک یہ ہم کو دھوکے دے رہی ہے۔ اور انسان کے قابو میں نہیں آ سکی۔ دنیا کی تمام قوتوں کی طرح یہ بھی کم سے کم مزاحمت کا راستہ ڈھونڈتی ہے۔ چنانچہ بلند عمارتیں۔ چمنی۔ منارے۔ برج۔ درخت وغیرہ جو اس کے قریب آ گئے۔ ان کے ذریعے سے زمین میں پیوست ہونا چاہتی ہے۔ اور چونکہ ان چیزوں میں کچھ نہ کچھ مزاحمت ہوتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں قوتوں میں یعنی بجلی میں اور شے مذکور میں ایک کشمکش ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجلی زیادہ زور اور کڑاکے کے ساتھ گرتی ہے۔ ایسی بجلی کی شکل آپ نے دیکھی ہوگی

---

[1] وولٹ بجلی کا ایک پیمانہ ہے۔ جیسے لمپ میں چھ وولٹ کی قوت ہوتی ہے۔ پنکھوں اور بجلی کی روشنی میں ۱۱۰ سے ۲۳۰ یا شاذ ۲۵۰ وولٹ ہوتے ہیں۔ ان میں جھٹکا لگتا ہے اور اگر دیر تک تار جسم سے متصل رہے تو خطرناک ہوتا ہے۔ امریکہ میں بجلی کے ذریعے ہی قصاص لیا جاتا ہے۔ ایک ہزار وولٹ کا محض برائے نام چھو جانا ہی انسان کو عدم آباد پہنچانے کے لئے کافی ہے ÷

کہ آسمان پر ایک لہریے کی سی ہوتی ہے۔ اسے FORKED LIGHTNING یا برق شاخسانہ کہتے ہیں۔ اس نظریے کو معلوم کرکے فرینکلن نے تجویز کی کہ اگر عمارتوں پر ایسے تار جن میں مزاحمت کم ہو بلند مقام پر لگا دیں تو وہ بہ آسانی بجلی کو گزر جانے دیںگے اور نہ کشمکش ہوگی نہ کڑاکا ہوگا۔ اور نہ عمارت کا نقصان ہوگا۔ مگر یہاں اس بات کی انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے کہ یہ تار زمین میں دور تک گہرا چلا جائے۔ خشک زمین پر بھی حاجز ہے۔ یعنی بجلی کو روکتی ہے۔ لہٰذا ایسے تار زمین میں اتنی گہرائی تک لے جائے جائیں جہاں موسم گرما میں نمی نکل آئے۔ اس تار کو جو اکثر ایک چوڑی پٹی کی شکل میں لگایا جاتا ہے۔ ایک تانبے کی چادر لوہے کے پائپ سے خوب وصل کرکے اور جھال دے کر دفن کریں۔ اگر باریک کوئلے پیس کر اس گڑھے میں بھر دیں اور اسے پانی سے خوب تر کر دیں تو نمی دیر پا رہتی ہے۔ اکثر اس تار کو کنوئیں میں اتار دیتے ہیں یا پانی کے نل سے ملا دیتے ہیں۔ اس طرح تار کو لگانے سے حفاظت مکمل ہو جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں TO EARTH یا "زمیننا" کہتے ہیں۔ ایسے مکانات پر جو ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں یا پہاڑی پر ہوں۔ برق ربا لگانا ضروری ہے۔ شہروں کی ایسی عمارتیں جو متصل چلی آتی ہیں۔ اُن پر بجلی گرنے کا اندیشہ اتنا نہیں ہوتا جتنا منتشر عمارتوں پر ہوتا ہے۔ شہر میں بھی ایسی عمارت پر جو دوسری عمارتوں میں سربرآوردہ ہو۔ برق ربا لگا دینا چاہیئے۔ ایسی عمارتیں جیسی مسجدیں جن میں دو یا زیادہ منارے ہوتے ہیں۔ اگر سب میناروں پر تار لگا دئے جائیں تو مناسب ہے۔ مکان میں جہاں دھات لگی ہو خصوصاً ٹین کے سائبان انہیں ضرور زمیننا چاہیئے۔ اگر یہ سائبان لوہے کے تھمبے پر ہوں تو ان کے نیچے نہ بیٹھنا چاہیئے۔ ایسے سائبانوں کو ایک لوہے کے تار سے ملا کر تار کو زمین میں دفن کر دینا چاہیئے یا پانی کے پائپ سے ملا دینا چاہیئے؛

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ بجلی کم سے کم مزاحمت کے راستے سے گزرنا چاہتی ہے۔ یعنی وہ موصل میں سے گزرنا پسند کرتی ہے۔ بمقابلہ کسی غیر موصل یا حاجز چیز کے۔ تمام دھاتیں موصل ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے دھات کے خصوصاً تانبے کے برق رُبا بناتے ہیں[1]۔ مگر علاوہ دھاتوں کے اور بھی

---

[1] تمام دھاتوں میں سب سے کم مزاحمت چاندی میں۔ پھر تانبے میں ہوتی ہے۔ مگر چاندی چونکہ بہت گراں ہے اور مزاحمت کا فرق کم ہے۔ اس لئے عام طور پر تانبا استعمال ہوتا ہے؛

چیزیں ہیں جو موصل ہیں۔ مثلاً کاربن اور دھواں۔ جو دھواں چمنی میں سے نکلتا ہے وہ بھی موصل ہے۔ اس لئے بجلی کا جس وقت طوفان آئے تو آتشدان کے پاس نہ بیٹھنا چاہیئے۔ بلکہ وسط کمرے میں ایسے قالین، یا دری پر بیٹھنا چاہیئے جو سوکھی ہو۔ کیونکہ خشک کپڑا جہاں حاجز ہے۔ وہاں تر کپڑا نہایت عمدہ موصل بن جاتا ہے۔ اگر آپ جنگل میں ہوں اور بجلی کا طوفان آجائے یعنی یہ معلوم ہو کہ بالکل سمت الراس پر ہے۔ تو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ بجلی کے گرنے کا امکان آپ پر زیادہ ہے۔ ایسے وقت میں کسی اونچے درخت کے نیچے پناہ نہ لیں کیونکہ بلند چیز پر بجلی کے گرنے کا احتمال زیادہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض وقت درخت پر بجلی گرے اور اس کے نیچے جو آدمی ہے۔ وہ براہِ راست اس کی زد میں تو نہ آئے مگر درخت کے گرنے یا اس کی کسی بھاری شاخ کے گرنے سے وہ مجروح ہو سکتا ہے۔ ایسے وقت پانی سے بھیگنے کی پروا نہ کرنی چاہیئے بلکہ درخت سے ہٹ کر کھلے میدان میں آ جانا چاہیئے۔ اگر گھنا جنگل ہے تو اونچے درختوں کی پناہ نہ لے بلکہ کسی چھوٹے درخت یا جھاڑی کی آڑ پکڑنا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص موٹر یا کشتی میں سوار ہو اور طوفان بالکل سر پہ ہو تو کشتی میں لیٹ جائے۔ اور موٹر اگر چٹیل میدان میں ہو تو سواری سے اتر کر اس کے پاس تھوڑے فاصلے پر لیٹ جانا چاہیئے۔ کیونکہ سواری نسبتاً زیادہ بلند ہے۔ اگر کوئی گڑھا مل جائے تو گڑھے میں لیٹنا زیادہ بہتر ہے۔ اگر بہت سے آدمی ساتھ ساتھ جا رہے ہوں تو سب کو منتشر ہو جانا چاہیئے۔ ایک جگہ نہ رہیں۔ اگر آگ جلا رکھی ہو تو آگ سے دُور بیٹھیں۔ کیونکہ دھواں موصل ہے اور بجلی کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ بیٹھے رہنے میں بھی نسبتاً زیادہ خدشہ ہے۔ گیلے کپڑے حفاظت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سوکھے کپڑے کے مقابلے میں گیلا کپڑا بہتر موصل ہے۔ اگر کسی پر بجلی گرنے والی ہے تو زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ گیلے کپڑوں میں سے یعنی انسان کی بالائی سطح پر سے گزر جائے۔ اور جسم میں سے ہو کر نہ گزرے۔ اگر کوئی لمبی لکڑی یا برچھا ہو تو اسے گاڑ کر اس سے قدرے فاصلے پر لیٹ جانا چاہیئے۔ اگر لکڑی بالکل خشک ہو تو گیلا کپڑا اس پر لپیٹ دیں کہ زمین تک پہنچ جائے۔ چھتری جس کے ہاتھ میں ہو۔ اسے اس کی احتیاط ضرور رکھنی چاہیئے کہ

چھتری اور زمین تک صرف وہی ایک واسطہ نہ ہو۔ اگر لوہے کی ڈنڈی ہے تو اُسے زمین پر لگا کر اس کے نیچے بیٹھ جانا چاہیئے۔ تاکہ اگر بجلی گرے تو تانوں میں اور ڈنڈی میں ہو کر زمین میں چلی جائے۔ یہ سب احتیاطیں صرف چٹیل میدان میں اور اس وقت کرنے کی ہیں۔ جب دیکھ لے کہ بالکل سر پر بجلی برق شاخسانہ کی صورت میں چمک رہی ہے۔ اگر سر پر برقِ شرشف نہیں چمک رہی ہے۔ تو پھر ان احتیاطوں کی ضرورت نہیں۔ برق شاخسانہ کی علامت یہ ہے۔ اس میں کڑک ہوتی ہے۔ اور اس کی شکل لہریلے دار ہوتی ہے ٭

برق رُبا کے پاس کھڑے ہونے میں تو کچھ اندیشہ نہیں۔ کیونکہ بجلی گرے گی تو سیدھی زمین میں پیوست ہو جائے گی۔ مگر جس وقت بجلی کا طوفان کہیں بھی آ رہا ہو تو تار کے جنگلوں سے دور رہنا چاہیئے۔ بعض اوقات گائیں بھینسیں ریل کے کنارے کے تاروں کے پاس مری ہوئی ملی ہیں۔ حالانکہ ان کے سر پر طوفان نہیں آیا بلکہ کسی دور مقام پر طوفان آیا۔ تار پر بجلی گری اور چونکہ تار بعض وقت زمینا نہیں ہوتا۔ یعنی لکڑی یا پتھر پر لگا ہوتا ہے یا لوہے کے کھمبے بھی خشک زمین پر ہوتے ہیں۔ اس لئے بجلی بجائے زمین میں جانے کے تار میں پہنچ کر دُور دُور تک جو اس کے قریب ہوا ہلاک کرتی چلی گئی ٭

بعض کا خیال ہے کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر جاتی ہے۔ وہاں پھر نہیں گرتی۔ حالانکہ تجربے نے بتایا ہے کہ جہاں ایک دفعہ بجلی گر چکتی ہے۔ وہاں اس کے گرنے کا زیادہ احتمال ہے۔ اوّل تو یہ کہ ضرور اس مقام میں اور بجلی والے بادل میں مزاحمت کم تھی جب ہی بجلی گری۔ دوسرے پے در پے کئی کئی مرتبہ بھی اس وجہ سے گرنے کا امکان ہے کہ جب بجلی گرتی ہے تو اُس پاس کی ہوا میں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بمقابلہ ہوا کے خلا کی مزاحمت بہت کم ہوتی ہے۔ اسی لئے اس میں سے بجلی کے گزرنے کا آسان راستہ بن جاتا ہے۔ جہاں بجلی گرتی ہے۔ وہاں بعض وقت تھوڑی دیر تک گندھک کی سی بُو آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کا شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ آکسیجن کے اجزا میں تغیّر پیدا کرکے تین جوہروں کا ایک سالمہ بنا دیتا ہے۔ اسے اُوزون OZON کہتے ہیں۔ یہ دِق دمے

اور پھیپھڑے کے مریضوں کے لئے مفید ہے۔ اس گیس اوزون کی بو گندھک کی بُو سے مشابہ ہوتی ہے۔ ورنہ بجلی میں گندھک وغیرہ کچھ نہیں ہوتی ؛

بعض وقت لوگ براہ راست بجلی کے صدمے سے تو نہیں مرتے بلکہ کسی مقام پر بجلی گری اور ہوا میں خلا پیدا ہوُا۔ اس خلا میں چاروں طرف سے ہوا بڑی سرعت کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔ اُس کے جھونکے میں آدمی گر جاتا ہے اور اس خوف سے کہ وہ بجلی سے گرا ہے۔ اس کی حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے اور وہ مَر جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس شخص نے بجلی کا شعلہ یا چمک دیکھ لی۔ وہ کم سے کم اس خاص ضرب سے محفوظ ہے۔ کڑک ڈرنے کی چیز نہیں۔ کیونکہ کڑک چمک کا نتیجہ ہے۔ اور اگر کسی کے پاس روک گھڑی STOP WATCH ہو اور اُسے وہ چمک ہوتے ہی چلا دے اور جس وقت کڑک ہو۔ اُسے بند کر کے دیکھ لے۔ کہ کتنے سیکنڈ میں آواز آئی اور ۱۱۲۰ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے حساب لگا سکتا ہے۔ کہ بجلی کتنی دُور گری ہے۔ جہازی جنگ میں یہ روک گھڑی دُشمن کی توپ کا فاصلہ بتاتی ہے۔ یعنی چمک پیدا ہونے کے بعد توپ کی آواز کے وقفے کو ناپ کر فاصلہ معلوم کر لیتے ہیں ؛

اگر کسی بدنصیب پر بجلی گر جائے۔ تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ پورے جسم پر گری ہے۔ یعنی جسم کے اندر سے ہو کر گزری ہے۔ تب تو اس کے بچنے کی اُمید نہیں۔ جس کی علامت یہ ہے کہ جسم کٹ جائے گا یا سیاہ پڑ جائیگا اور درجۂ حرارت جسم کا تھوڑی دیر تک بخار کا سا رہے گا۔ مگر صرف قلب کی حرکت بند ہو تو مصنوعی تنفّس سے آدمی کے بچنے کی اُمید ہے۔ مصنوعی طریقۂ تنفّس کا فوراً شروع کر دیں۔ اور ڈاکٹر کو فوراً بلا لیں۔ مگر جب تک ڈاکٹر نہ آئے۔ یہ ترکیب[1] کریں۔ ایسے مریض کو پہلے زمین پر اوندھا لٹا دیں۔ اس کے پاس بھیڑ نہ ہونے دیں۔ ہوا کھلی ہوئی صاف ہو۔ اگر کپڑے بھیگے ہوں تو ایک آدمی گیلے کپڑے اتار کر سُوکھے کپڑے پہنا دے۔ مگر تنفّس کے علاج میں دیر نہ کریں۔ یہ فوراً شروع ہو جانا

---

[1] یہ ترکیب تنفّس کی پانی میں ڈوبے ہوئے۔ گیس سے مسموم ہوئے۔ مارگنیدہ یا مکان میں جو بجلی کے تار لگے ہوتے ہیں ان سے چھُو کر بے ہوش ہونے والوں پر بھی استعمال کی جا سکتی ہے ؛

چاہیئے۔ اوندھا اس طرح لٹایا جائے کہ دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوں۔ سر ایک جانب کو جھکا ہؤا دونوں ہاتھوں کے بیچ میں رہے۔ ایک شخص اس کی کمر پر اس طرح بیٹھے کہ وہ اس کی دونوں رانوں کے بیچ میں آ جائے۔ مگر اس پر بوجھ نہ ہو۔ اور یہ بیٹھنے والا شخص اس کی پیٹھ کو اس طرح دونوں ہاتھوں سے سونتے کہ اس کے پھیپھڑوں پر ایک دفعہ بوجھ ہو کہ وہ دبیں اور ان میں کی ہوا خارج ہو اور دوسری دفعہ میں' یہ سب بوجھ نیچے کی طرف کمر تک آ جائے تاکہ پھیپھڑوں میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اُن میں ہوا پھر بھر جائے۔ یہ عمل منٹ میں پندرہ بیس کی رفتار سے ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان اسی قدر سانس ایک منٹ میں لیتا ہے۔ اگر مضروب کی بتیسی بند نہیں ہوئی ہے تو اس کی زبان کو باہر کھینچ لینا چاہیئے۔ کوئی تیز چیز مثلاً برانڈی قہوہ یا چائے کوشش کر کے پلا دینا چاہیئے۔ مگر یہ چیزیں بہت گرم نہ ہوں۔ اس کے تمام جسم کو گرم رکھنا چاہیئے۔ اگر آکسیجن کے سلنڈر میسّر ہوں تو ان کے ذریعے سے کسی ڈاکٹر کی رائے سے تنفّس پہنچانا بھی مفید ہے ؎

ضمناً یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کے بجلی کا تار لگ جائے اور اس کا ہاتھ نہ کھلتا ہو۔ جو اعصاب کے مفلوج ہو جانے کی وجہ سے نہیں کھلتا۔ اور جسے عوام کہتے ہیں کہ بجلی نے پکڑ لیا تو ایسے وقت جو شخص اس کے قریب ہے اور مدد دینا چاہتا ہے وہ اس برق زدہ کو سوکھے کپڑے سے پکڑ کر کھینچے۔ مگر جسم کو ہاتھ نہ لگائے ورنہ خود بھی مبتلا ہو جائے گا یا کسی لکڑی کی ڈنڈی والی چھتری یا لکڑی سے اُسے اپنی طرف کھینچے۔ اگر کچھ نہ ہو تو لات مار کر اسے دھکّا دے (بعد میں چاہے تو معافی مانگ لے)۔ دوپٹہ یا رومال یا رسی ہو تو اسے پھینک کر اس کے ذریعے سے کھینچے۔ لات مارنے میں یہ مصلحت ہے کہ اگر بجلی شخص مذکور میں سے بچانے والے میں سرایت کرے گی۔ تو صرف ٹانگوں میں ہی سرایت کرے گی۔ اور چونکہ ٹانگوں میں کوئی عضو رئیس نہیں ہے۔ اس لئے سوائے ایک جھٹکے کے اندیشہ جان کا نہیں ہے۔ اگر ہاتھ سے کھینچے گا تو اس ہاتھ کے ذریعے بجلی سرایت کریگی۔ اور قلب میں سے ہو کر زمین میں سرایت کریگی۔ جس کی وجہ سے ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اگر کسی کے پاس سوکھی لکڑی کی کلہاڑی ہو تو تار پر ایک ضرب لگا کر کاٹ دے کہ برقی رو قطع ہو جائے۔ مگر یہ دیکھ لے کہ لکڑی سوکھی

ہے۔گیلی لکڑی میں سے بجلی سرایت کر جائیگی۔ اس کے کپڑے پکڑ کر کھینچنے میں صرف ایک ہاتھ استعمال کریں۔ یہ تو ہر برقی انجنیئر کو چاہئے کہ ایک ہاتھ ہمیشہ جیب میں رکھے تاکہ اگر بجلی گزرے تو ایک ہاتھ کے ذریعے سے ٹانگوں میں گزرے۔ مگر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گزرنے میں بیچ میں دل ہوتا ہے۔ جس پر صدمے کا پہنچنا مہلک ہے۔ ہندوستان میں بعض وقت ٹرام کے تار گر جاتے ہیں اور تار کی زد میں دو دو تین تین آدمی ایک دوسرے کو بچانے کی کوشش میں خود بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں یہ احتیاطیں مفید ہونگی:

جنوبی افریقہ کے دو پروفیسر اس فکر میں ہیں کہ آسمانی بجلی سے بھی کچھ کام لیں۔ انہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ سالانہ تقریباً دس کھرب کلوواٹ بجلی آسمان سے خارج ہوتی ہے۔ جن کے مکانوں میں بجلی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ایک یونٹ بجلی کیا ہوتی ہے۔ ایک گھنٹے تک اگر ایک کلوواٹ بجلی خرچ ہو تو ایک یونٹ کہلاتا ہے۔ ایک کلوواٹ میں تقریباً ۱۶ بتّی کا ایک لیمپ پچاس گھنٹے تک جل سکتا ہے:

مگر یہ دس کھرب کلوواٹ کا وقفہ اس قدر مختصر ہوتا ہے کہ یہ عظیم الشان مقدار بہت کم رہ جاتی ہے۔ بعض وقت چمک کا وقفہ سیکنڈ کے لاکھویں حصے کے برابر ہوتا ہے۔ اور بعض وقت اس سے بھی کم۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک سیکنڈ تک جاری رہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک سیکنڈ تک چمک کا موقع رہتا ہے تو یہ دس کھرب کلوواٹ کی مقدار صرف اس قدر رہتی ہے کہ ایک لاکھ آدمی کی آبادی کے شہر کو ایک گھنٹے تک روشن رکھ سکیں۔ لہٰذا یہ مقدار تو ایسی نہیں ہے۔ جس کے لئے کسی بڑی مشین یا قیمتی آلات کے لئے روپیہ خرچ کیا جا سکے۔ مگر اس سلسلے میں جو تجربات انہوں نے کئے۔ وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ان دونوں نے ایک فوٹو کا کیمرہ بنا کر چمکنے والی بجلی کے فوٹو لئے۔ ان فوٹوؤں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بجلی گرنے والی ہوتی ہے تو وہ اصلی شعلہ جو گرتا ہے۔ اس سے پہلے ایک شعلہ قائد کے طور پر چمکتا ہے۔ اور یہ موخرالذکر شعلہ آنے والے شعلے کا راستہ تیار کرتا ہے۔ ان کی رفتار آٹھ سو دس (۸۱۰) میل سے لے کر ۱۹ ہزار میل فی سیکنڈ تک ہوتی ہے +

اکثر تو یوں ہؤا کرتا ہے کہ ایک بادل سے دوسرے بادل میں چمک ہوتی رہتی ہے۔ اوپر کے بادل میں مثبت بجلی ہوتی ہے۔ اور نیچے کے بادل

میں منفی ہوتی ہے۔ اور مثبت سے منفی تک شعلے آتے رہتے ہیں۔ پھر زمین جو مثبت بجلی سے پُر ہو جاتی ہے۔ اس میں سے بجلی نکل کر منفی بادل میں جاتی ہے۔ گویا جس وقت بجلی گرتی ہے وہ در اصل زمین کے خزانے سے بجلی کی ایک بڑی مقدار بادل میں آ جاتی ہے۔ اور اس کا راستہ ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو بادل میں سے آتے ہوئے شعلے کا ہوتا ہے ؛

یہ نظریہ بھی اب تک کے مسلّمہ نظریئے سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ اب تک علمائے سائنس یہی سمجھتے آئے تھے کہ بجلی ہمیشہ آسمان ہی سے زمین پر گرتی ہے۔ بلکہ اب یوں کہنا چاہیئے کہ پہلے زمین تک ایک شعلہ آکر پیشوائی کر جاتا ہے اور پھر زمین سے بجلی نکل کر آسمان پر اُڑتی ہے۔ اس میں شاخیں بھی ہوتی ہیں۔ اس شعلے کی رفتار ۲۸ ہزار میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ بجلی کے شرر بار ہونے کا کیا سبب ہے ؟ اس کے متعلق بھی تحقیقات کی گئی ہے۔ یعنی جب بادل میں بارش کے قطرے چھوٹ جاتے ہیں یا ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ تو ان میں برق پارے پیدا ہو جاتے ہیں اور $\frac{9}{10}$ حصّہ اس مقدار کا آپس کے بادل ہی میں مثبت سے منفی میں جاکر اس مقدار کو ہموزن کر کے صفر درجے کی قوّت پر آ جاتا ہے۔ اوپر کا حصہ مثبت اور نیچے کا ہمیشہ منفی رہتا ہے۔ جب بالکل نیچے کے بادل کی قوّت ۲۵ ہزار وولٹ فی ہزار انچ ہو جاتی ہے تو ایک شعلہ آکر زمین کو منفی برق پاروں سے پُر کر دیتا ہے۔ اور جب زمین پوری مقدار میں بجلی سے پُر ہو جاتی ہے تو یہاں سے ایک شعلہ مثبت بادل میں جاتا ہے۔ اور یہی وہ شعلہ کہلاتا ہے۔ جسے ہم بجلی گرنے سے تعبیر کرتے ہیں ؛

ان پروفیسروں کی محنت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے شعلوں کی رفتار اور بجلی کی مقدار کا ایک حد تک صحیح اندازہ لگایا۔ اس سے قبل امریکہ کے ایک کارخانے نے مصنوعی بجلی کی ایک مشین تیار کر لی تھی۔ وہ بھی آسمانی بجلی کے مشابہ شعلہ پیدا کرتی ہے۔ اس مشین سے یہ فائدہ ہے کہ برقی مشینوں کے پُرزوں کی دیکھ بھال اور ان کا امتحان اس سے بآسانی ہو جاتا ہے ؛

حصّۂ نثر ختم ہوا

حصّۂ نظم

سودا

مخمّس شہر آشوب

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول
پھرے ہے، جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدّت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرّف میں فوجداری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ملکے کہاں ہیں جو ہم دے کے ہوں انھوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیانِ خریف
جو عامل اب ہیں محالات پر سو یوں ہیں خفیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو ادل

بس ان کا ملک میں کارِ نسق جو یوں ہو تباہ
کہ کوہ ذر ہو زراعت میں تو نہ دیں پر کاہ
جگہ وہ کونسی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ
کہاں سے آویں پیادے۔ کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو۔ پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی فقط عربی باجے پر انہوں کی شان
جو چاہیں اس کو نہ بجوا دیں یہ تو کیا امکان
پر ان کا فکر ہے تخفیفِ خرچ پر ہر آن
رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

انہیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور
کہ ہوں دو مورچھل اور ایک کاتبی کا سمور
نہ رسم صلح کی سمجھیں نہ جنگ کا دستور
جو ان میں قاعدہ داں تھے ہوئے وہ ان سے دُور
قماش ان کی طبیعت کا سب طرح سے ٹھٹول

امیر اب جو ہیں دانا انہوں نے کی ہے یہ چال
ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کے زمانے کا حال
بچھی ہے سوزنی خوجہ کھڑا جھلے ہے رومال
حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہل کمال
دھری ہے روبرو اک پیکدان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو ان کے انہوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
انہوں نے پھیر کے ادھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی! کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لئے جمع ہوں صغیر و کبیر
تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہنچنے کی سوجھی ہے بخشی کو تدبیر
کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص بیچ وزیر!
کہ شامیانے کے بانسوں پہ نقرئی کے ہیں خول

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو بھاگی پھرے لڑائی سے

پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول
نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کنول
یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصبدار
تلاش کر لی ڈھلیتی انہوں نے ہو ناچار
ندان قرض ہیں بنیوں کے دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کجکول
کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیان
کہ توشہ خانہ ہے ان کا پرانچے کی دکان
نکل تنور کے منہ سے کہے ہے گاؤ زباں
بکی ہوں تب میں کہ جب کاتبی خلد مکان
بکی ہے تیسرے فاقے میں کوڑیوں کے مول
کہے جو مودی سے جاکر دوات کے حالات
جواب دے ہے کہ ہے اونٹ تو فرشتے کی ذات
ہوا پہ چھٹی ہے بیلوں کی اور بھس پہ برات
جو خچریں ہیں انہوں نے پیا ہے آب حیات
تمہارے کھانے کو دانہ کہو تو دیجے تول
جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں تو کیا امکان
کہ ہووے گھاس کے پھٹے کا ان کے آگے نشان
کسی کی ٹوٹی ہے ٹنگڑی کسی کا جھڑ گیا کان
طویلہ اس کو کہوں یا میں ہنج پیر کا تھان

اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانواں ڈول
اور اب جو زعم میں آقا کے فیل خانہ ہے
جو ہتھنی اندھی ہے اس میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ ٹھور چارے کا راتب کا نے ٹھکانا ہے
ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانا ہے
اب اس کو خواہ وہ پایل سمجھ لیں خواہ ببھول
کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش
کہیں پلاؤ تو باورچی واں پکائے آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش
تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش
اگر کہیں کہ مٹا اٹھ کے چاندنی کا جھول
غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں ہے فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول
وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن پہچانے
جو پوچھو اس سے کہ تم کچھ روپے گے پانے
کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے
روپے کی شکل نہیں دیکھی ہے خدا جانے
کہ اس زمانے میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول
سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش جغد کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول
کسی کے گھر نہ رہا آسیا سے تا بہ اجاغ

ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ! وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ
اور ان مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں الاغ
جہاں بہار میں سُنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول
خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اوداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول
یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کن نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اُگے ہیں زقوم
مچی ہے زاغ و زغن سے اب اُس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بُلبُلیں کریں تھیں کلول
جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھی کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اُٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول
دیا بھی واں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس
پڑے ہیں کھنڈروں میں ۔ آئینہ خانے کے مانوس
کروڑ دل پُر از امید ہو گئے مایُوس
گھروں سے یُوں نجُبا کے نکل گئے ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں ، تھے جو صاحب چوڈول
نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول

اور اُن کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے لیجئے جو مول
غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر
کروڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردشِ دہر
تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردمِ شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول
بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں
وہ دل نہیں کہ اب اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پُر آب نہیں
سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے اک طرح کا زیادہ نہ بول

میر محمد تقی میر

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئے آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کاش اب منہ سے برقع اُٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مُندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے
پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
کیا سمجھیں اس کے رُتبہ عالی کو اہلِ خاک
پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم ورے ورے
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میرؔ
بُلبُل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

انشا

قصیدہ بہاریہ

بگھیاں پھولوں کی تیار کر اے بوے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن!
عالم اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور
گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسیٔ ناز پہ جلوے کی دکھائے گا پھبن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھائے گا رنگ
کوچ پر ناز کی جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن

اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر
آکے جب غنچہ و گل کھولیں گے بوتل کا ڈھن
اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے
اودی بانات کی کرتی سے شگوفے سوسن
پتے ہل ہل کے بجاویں گے فرنگی طنبور
لالہ لادے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تارِ رگِ ابرِ بہاری سے کئی
خود نسیمِ سحر آئے گی بجاتی ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلادیں گے
آ پڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن
آئے گا نذر کو شیشے کی گھڑی لے کے حباب
یاسمیں پتّوں کی پینس میں چلے گی بن ٹھن
نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرہ
ساتھ ہولے گی نزاکت بھی جو ہے اس کی بہن

غزل

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیّار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقشِ پائے رہ رواں کوئے تمنّا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمّل آہ ننگ و نام کیا شے ہے

میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو!
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

در ہجو مرزا عظیم بیگ

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے — کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے — پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

جواب مرزا عظیم بیگ

وہ فاضلِ زمانہ ہو تم جامع علوم — تحصیلِ صرف و نحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم — منطق بیان معانی کہیں سب زمیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اک دو غزل کے کہنے سے بن بیٹھے ایسے طاق — دیوان شاعروں کے نظر سے رہے بہ طاق
ناصر علی، نظیری کی طاقت ہوئی ہے طاق — ہر چند ابھی نہ آئی ہے فہمیدِ جفت و طاق
ٹنگڑی تلے سے عرفی و قدسی نکل چلے

نزدیک اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھو دُور — پر خوب جانتے ہیں مجھے جو ہیں ذی شعور
وہ بحر کونسی ہے نہیں جس پہ یاں عبور — کب میری شاعری میں پڑے شبہ سے قصور
بن کر قمل نکالنے کو تم خلل چلے

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق — تبدیلِ بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ مہر یہ از غرب تا بہ شرق — شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

تھا زورِ فکر میں کہ کہوں معنی و مثال — تجنیس و ہم رعایتِ لفظی و ہم خیال
فرق رجز رمل نہ لیا میں نے گو سنبھال — نادانی کا مری نہ ہو دانا کو احتمال
گو تم بقدرِ فکر یہی کر عمل چلے

ہے امتحانِ زور تو یہ پیش عقل مند
میرے سے تم قصیدے کہو یا کہ قطعہ بند
گو ہجو اس میں ہو مری لیکن ہو دل پسند
یہ بات ہے نرالی کہ دروازہ کر کے بند
دشنام گھر میں دینے محل بے محل چلے

کم ظرفی سے تمہیں تو یہی آئی ہے اُمنگ
کیجئے نمود خلق میں اب کر سخن کی جنگ
اپنے تئیں تو بخشنے آتا ہے یار ننگ
اتنا بھی رکھئے حوصلہ فوّارہ ساں نہ تنگ
چُلّو ہی بھر جو پانی میں گز بھر اچھل چلے

کیوں جنگِ گفتگو کو تم اُٹھ دوڑے اس قماش
کرتے جو بھاری پائچہ ہوتا نہ پردہ فاش
پر سمجھیں کب یہ بات جو کندے ہو ناتراش
تیغ زبان کو میان میں رکھتے تم اپنی کاش
ناحق جو تم ازار سے باہر نکل چلے

نظیر اکبر آبادی

دیوانہ پن

وہ رشکِ چمن کل جو زیبِ چمن تھا
چمن جنبشِ شاخ سے سینہ زن تھا
گیا میں جو اُس بن چمن میں تو ہر گل
مجھے اُس گھڑی اخگرِ پیرہن تھا
یہ غنچہ جو بے درد گلچیں نے توڑا
خدا جانے کس کا یہ نقشِ دہن تھا
تنِ مردہ کو کیا تکلف سے رکھنا
گیا وہ تو جس سے مزیّن یہ تن تھا
کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا
مشیّن بدن تھا معطر کفن تھا
جو قبرِ کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا
نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا
نظیرؔ آگے ہم کو ہوس تھی کفن کی
جو سوچا تو ناحق کا دیوانہ پن تھا

میرزا غالب

مرثیہ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں ۔ اچھا ۔ کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

تم کونسے ایسے تھے کھرے دادوستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدّت خوش وناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

غزلیات

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ تیرے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

لو! وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لُٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پُوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں
قیدِ حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبّت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رو دادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے دُشمن اُس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں اپنی کر کے یاد شرما جائے ہے مجھ سے
خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے
وہ بد خو اور میری داستانِ عشق طولانی!
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے
ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے!
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے
کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی
غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

میر انیس

آمدِ صبح

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح   گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح   سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم   مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم   سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبحِ نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار   تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح رہ رہ کے بار بار   کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغ بہشتِ نعیم کے
ہر سُو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں   تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذرّوں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں   نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

اوجِ زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی   کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی
ہر خشک و تر پہ تھا کرمِ بحرِ سرمدی   بے آب تھے مگر دُرِ دریائے احمدی
روکے ہوئے تھی نہر کو اُمّت رسول کی
سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتولؑ کی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد   مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سُرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد   یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

ایضاً

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور دیکھے تو غش کرے اَرِنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوائیں سبزۂ صحرا کی وہ لہک شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریٔ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک ہر برگِ گُل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتّے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربان صنعتِ قلمِ آفرید گار تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیع آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار
عالم تھا محو قدرتِ ربِّ عباد پر
مینا کیا تھا وادیٔ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا دُرّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وُہ جوشِ گل وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سر سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زُہرِ گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم کُوکُو کا شور نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم
سبحانَ ربّنا کی صدا تھی علی العموم جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیل کردگار

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں
وہ دشت اور خیمۂ زنگار گوں کی شان گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسمان
بے چوبۂ سپہر بنے جس کا سائبان ! بیت العتیق دیں کا مدینہ جہاں کی جان
اللہ کے حبیب کے پیارے اسی میں تھے
سب عرش کبریا کے ستارے اسی میں تھے
گردوں پہ ناز کرتی تھی اس دشت کی زمین کہتا تھا آسماں دہم چرخ ہفتمیں
پردے تھے رشک پردۂ چشمانِ حور عیں تاروں سے تھا فلک اسی خرمن کا خوشہ چیں
دیکھا جو نور شمسۂ کیواں جناب پر
کیا کیا ہنسی ہے صبح گل آفتاب پر

گرمی کی شدّت

گرمی کا زور جنگ کی کیونکر کروں بیاں ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لُو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں رن کی زمیں تو سُرخ تھی اور زرد آسماں
آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر
وُہ لُو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوُا تھا دھوپ سے پانی فرات کا
جھیلوں سے چارپائے نہ اُٹھتے تھے تا بہ شام مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثل موم خام
سُرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اُترا تھا سائے کی چاہ سے
آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

لوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتّے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کا اضطراب کافورِ صبح ڈھونڈتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے جا کرۂ زمہریر میں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہرے پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا سفر نہیں صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج و مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

محسن کاکوروی

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل

خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی
ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

جانب قبلہ ہوئی ہے یورش ابرِ سیاہ
کہیں پھر کعبے میں قبضہ نہ کریں لات و ہبل

نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی
پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل

دیکھیے ہوگا سری کشن کا کیوں کر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل

ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل[1]

تہ و بالا کیے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل

کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہِ نو کی کشتی
بحرِ اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل

قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاج عالی
لالۂ باغ سے ہندوئے فلک کھیم کسل

شب دیجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں
لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل

جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمل

شب کو مہتاب نظر آئے نہ دن کو خورشید
ہے یہ اندھیرا مچائے ہوئے تاثیرِ زحل

وہ دھواں دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع
گرچہ پروانہ بھی ڈھونڈے اسے لے کر مشعل

آتشِ گل کا دھواں بام فلک تک پہنچا
جم گیا منزلِ خورشید کی چھت میں کاجل

ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے
برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

جس طرف سے گئی بجلی پھر ادھر آ نہ سکی
قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل

آبِ آئینہ تموج سے بہا جاتا ہے
کہیں تصویر سے گرنا نہ کہیں دیکھ سنبھل

لہریں لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ
چرخ پر بادلا پھیلا ہے زمیں پر مخمل

جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر
مصحفِ گل کے حواشی پہ طلائی جدول

---

[1] بڑھوا منگل میلے کا نام ہے جو منگل کے دن بنارس میں ہوا کرتا ہے۔

ہمزباں وصف چمن میں ہوئے سب اہلِ چمن
طوطیوں کی جو ہے تضمین تو بلبل کی غزل
جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں
لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل
آہِ قمری میں مزا اور مزے میں تاثیر
سرو میں دیکھئے پھول آنے لگے پھول میں پھل
شاخ پہ پھول ہیں جنبش میں زمیں پر سنبل
سب ہوا کھاتے ہیں گلشن میں سوار اور پیدل
پھول ٹوٹے ہوئے پھرتے روشوں پر ہیں نسیم!
یا سڑک پر ہیں ٹہلتے ہوئے گلگوں کوتل
ساتھ ساتھ آتے ہیں نالوں کے جگر کے ٹکڑے
شجرۂ آہِ رسا میں نکل آئی کونپل!
سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخیِ لب
چمنِ حسن سے لال اُڑ گئے بن کر ہریل
صاف آمادۂ پرواز ہے شاماں کی طرح
پر لگائے ہوئے مژگانِ صنم سے کاجل
شاخِ شمشاد پہ قمری سے کہو چھیڑے ملار
نونہالانِ گلستاں کو سنائے یہ غزل

سمتِ کاشی سے گیا جانبِ متھرا بادل
تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل
خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل
سطحِ افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی
روپ بجلی کا سنہرا ہے رپہلا بادل
چرخ پر بجلی کی چل پھر سے نظر آتا ہے
سبزہ چمکائے ہلاتا ہوا برچھا بادل
جب تلک برج میں جمنا ہے یہ کھلنے کا نہیں
ہے قسم کھائے اٹھائے ہوئے گنگا بادل
بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں
وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل
چشمۂ مہر ہے عکسِ زرِ گل سے دریا
پرتوِ برق سے ہے سونے کا بجرا بادل
دلِ بیتاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی
چشمِ پُرآب کا ہے ایک کرشمہ بادل
کچھ ہنسی کھیل نہیں جوششِ گریہ کا ضبط
یہ مرا دل ہے یہ میرا ہے کلیجہ بادل
دیکھتا گر کہیں محسن کی فغان و زاری
نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

نسیم دہلوی

تضمین مہر

سرائے دُنیا ہے کوچ کی جا ہر ایک کو خوف دمبدم ہے
رہا سکندر یہاں نہ دارا نہ ہے فریدوں یہاں نہ جم ہے

مسافرانہ تھکے ہو اُٹھو! مقام فردوس ہے ارم ہے
سفر ہے دشوار خواب کب تک، بہت بڑی منزل عدم ہے
نسیمؔ جاگو، کمر کو باندھو! اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

سرور و عیش و نشاط و عشرت یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے
ملال و رنج و غم و مصیبت یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے
غرور و تمکین و کبر و نخوت یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے
جوانی و عیش و جاہ و دولت یہ چند انفاس کے ہیں جھگڑے
اجل ہے استادہ دست بستہ نوید رخصت ہر اک دم ہے

مثال بُت سب کے سب ہیں بے حس یہ دیکھو قہر خدا کی نیندیں
یہ جاگے تھے ابتدا میں کس دن جو سوئے ہیں انتہا کی نیندیں
پڑے ہیں کیسے یہ ہائے غافل چڑھی ہیں کس کس بلا کی نیندیں
نسیم غفلت کی چل رہی ہے اُمنڈ رہی ہیں قضا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

قیام عمر دو روزہ جانی کبھی نہیں ایک قاعدے پر
تعلق عیش زندگانی کبھی نہیں ایک قاعدے پر
مآل کار جہان فانی کبھی نہیں ایک قاعدے پر
بہار گل لطف جوانی کبھی نہیں ایک قاعدے پر
جو چار دن ہے وفور راحت تو بعد اس کے غم و الم ہے

گئے وہ عیش و نشاط کے دن زمان رنج و ملال آیا
شباب نے شیب سے بدل لی عروج گزرا زوال آیا
کئے ہوئے سے ہوئی ندامت تو پھر کیا کیا خیال آیا
یہ مصرعۂ مخبر مصیبت پسند ہم کو کمال آیا
نسیمؔ جاگو، کمر کو باندھو! اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

مولینا حالی

قطعات

اے شعر! دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں! سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

حسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو — آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو

تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز — دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو

وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری — قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کبھو نماز تو

اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز — جو بے بصر ہیں ان سے نہ رکھ سانباز تو

ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ — معذور جان ان کو جو ہے چارہ ساز تو

چپ چاپ اپنی سچ سے کئے جا دلوں میں گھر — اونچا ابھی نہ کر علمِ امتیاز تو

جو نابلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ — گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو

عزّت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا — محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو

اے شعر! راہ راست پہ تو جبکہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

کرنی ہے فتح گر نئی دُنیا تو لے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

اے بزمِ سفیرانِ دُول کے سخن آرا! — ہر خرد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے

یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن — کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے

ظاہر ہے نہ غصّے میں بیاں سے ترے رنجش — نے لُطف میں کچھ طرزِ بیان اس سے جدا ہے

ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار — اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے

جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں — اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اس سے سوا ہے

گر سوچئے تو سینکڑوں پہلو ہیں مضر کے — اور سنیئے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے

دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات — گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانئے کیا ہے

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیان سے — اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

تھے لب پئے اظہار پہ اب آ کے کھلا یہ — انسان کو اخفا کے لئے نطق ملا ہے

ہے مرد سخن ساز بھی دُنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو
موجود سخن گو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو
دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

ٹھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقت بازپرس
اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اس سنے کی تاخیر اس نے جس قدر اچھا کیا
کب کیا، کیونکر کیا، یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

وہ دل رُبا امیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا
جب دُور تیرے دل سے ہو جائینگی سراپا
وہ عالم جوانی جس پر کہ تو ہے مفتوں
جائیگا لوٹ جس دم اس کا طلسم سارا
جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تونے اس کو
تھا جو کہ تجھ کو اپنا آرام دل سمجھتا!
چل دینگے جب وہ سارے ان بلبلوں کی مانند
بعد از بہار جو رُخ کرتیں نہیں چمن کا!
جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ
کون آکے دے گا تجھ کو اس کے سوا سہارا
بے مہریوں سے تونے جس کو کیا ہے غمگیں
تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آکے لیگا
جس طرح وہ پرندہ جو فصلِ گل میں جاکر
پھر موسم خزاں میں آکر ہے ہم سے ملتا

غزلیات

جہاں میں حالی! کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا
ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی۔ نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصوّر اپنا نہ کیجئے گا
سنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعویٰ
یہ کہ دو، دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجئے گا
اسی میں ہے خیر حضرت دل! کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو

کرے وہ یاد - اس کی بھول کر بھی کبھی تمنّا نہ کیجئے گا
کہے اگر تم کو کوئی واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانے کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پرواہ نہ کیجئے گا
کمال ہے ضد بے کمال، نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو؟
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجئے گا تو آپ بے جا نہ کیجئے گا
لگاؤ تم میں، نہ لاگ زاہد! نہ دردِ اُلفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجئے گا
تمہارا تھا دوستدار حالؔی اور اپنے بیگانے کا رہنا جو
سلوک اس سے کئے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجئے گا

کاٹیئے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
منزل دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں مہماں سرا میں میہمانوں کی طرح
سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں اک اک کا یگانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو
ہیں اُسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح
ان کے غصّے میں ہے دلسوزی، ملامت میں ہے پیار

مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح
کام سے کام اپنے ان کو گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتّیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح
کیجیے کیا حالی نہ کیجیے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں، بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
دوست کے ہیں جاں نثار، اپنا ہو یا بیگانہ ہو
ہے عشیرہ اور ان کا دُودماں سب سے الگ
سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
رکھتے ہیں اپنا طریق امتحاں سب سے الگ
دل کو ہیں خود لے کے اپنا امتحاں
رکھتے ہیں اپنا طریق امتحاں سب سے الگ
بہر تفرّج رکھتے ہیں زیر بغل
روضہ و بستان و فردوس و جناں سب سے الگ
نزاں ہے روشن ان کا جس مہتاب سے
ہے وہ نورِ مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندوں میں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل اُن کا تو واں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب اندازِ سخن دیکھے ہوئے
درد مندوں کا ہے دُکھڑا اور بیاں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی
کہ اُن کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تونے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لُٹس ہے گل چیں یا ہے قزاقی
کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی
رہی دانائی آخر غالب آکر پہلوانی پر
گئے چیں مانؔ سب چینی و فرغانی و قبچاقی
ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ
لنڈھائے خم پہ خم غیروں پہ کیوں ممسک ہو کر ساقی
مدارج کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے جاتی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اک غیب کا باقی

رباعیات

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تونے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

دُنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
رو دادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لئے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کئے
جیتے ہو تو کچھ کیجئے زندوں کی طرح
مُردوں کی طرح جئے تو کیا خاک جئے

منزل ہے بَعید، باندھ لو زادِ سفر
مواج ہے بحر۔ رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے۔ لے چلو مال کھرا
ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگزر

مسدّس
محنت کی برکتیں

ہوُا کچھ وہی جس نے یاں کچھ کیا ہے لیا جس نے پھل، بیج بو کر لیا ہے
کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے مثل ہے کہ کرتے کی سب بدّیا ہے
یونہی وقت سو سو کے ہیں جو گنواتے وہ خرگوش کچھووں سے ہیں زک اُٹھاتے

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری جہاں دیکھئے فیض اسی کا ہے جاری
یہی ہے کلیدِ درِ فضلِ باری اسی پر ہے موقوف عزّت تمہاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرو سب اسی پر ہیں مغرور ہیں اور تو سب

گلستاں میں جوبن گل و یاسمن کا سماں زلفِ سنبل کی تاب و شکن کا
قدِ دل رُبا سرو اور نارون کا رخِ جاں فزا لالہ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہے رنگ و بو سب کمیروں کے خوں سے ہیں یہ تازہ رُو سب

ہلاتے نہ اگلے اگر دست و بازو جہاں عطرِ حکمت سے ہوتا نہ خوشبو
نہ اخلاق کی وضع ہوتی ترازو نہ حق پھیلتا رُبعِ مسکوں پہ ہرسو
حقائق یہ سب غیر معلوم رہتے خدائی کے اسرار مکتوم رہتے

ستارہ شریعت کا تاباں نہ ہوتا اثر علمِ دیں کا نمایاں نہ ہوتا
جدا کفر سے نورِ ایماں نہ ہوتا مساجد میں یوں وردِ قرآں نہ ہوتا
خدا کی ثنا معبدوں میں نہ ہوتی اذاں جا بجا مسجدوں میں نہ ہوتی

نہیں ملتی کوشش سے دنیا ہی تنہا کہ ارکانِ دین بھی اسی پر ہیں برپا
جنہیں ہو نہ دُنیائے فانی کی پروا کریں آخرت ہی کا وہ کاش سودا
نہیں ہلتے دُنیا کی خاطر اگر تم تو لو دین حق ہی کی اُٹھ کر خبر تم

بنی نوع میں دو طرح کے ہیں انساں تفاوت ہے حالت میں جن کی نمایاں
کچھ اُن میں ہیں راحت طلب اور تن آساں بدن کے نگہبان بستر کے درماں
نہ محنت پہ مائل نہ قدرت کے قائل سمجھتے ہیں تنکے کو رستے میں حائل

اگر ہیں تونگر تو بیکار ہیں سب اپاہج ہیں روگی ہیں، بیمار ہیں سب
تنعّش کے ہاتھوں سے لاچار ہیں سب تن آسانیوں میں گرفتار ہیں سب
برابر ہے یاں اُن کا ہونا نہ ہونا نہ کچھ جاگنا اُن کا بہتر نہ سونا

اگر ہیں تہی دست اور بے نوا وہ — تو محنت سے ہیں جی چراتے سدا وہ
نصیبوں کا کرتے ہیں اکثر گلا وہ — ہلاتے نہیں کچھ مگر دست و پا وہ
اگر بھیک مل جائے قسمت سے ان کو — تو سو بار بہتر ہے محنت سے ان کو

نہ جو بے نوا ہیں نہ ہیں کچھ تونگر — وہ ہیں ڈھور کی طرح قانع اسی پر
کہ کھانے کو ملتا رہے پیٹ بھر کر — نہیں بڑھتے بس اس سے آگے قدم بھر
ہوئے زیورِ آدمیت سے عاری — معطل ہوئیں قوتیں ان کی ساری

نہ ہمت کہ محنت کی سختی اٹھائیں — نہ جرأت کہ خطروں کے میداں میں آئیں
نہ غیرت کہ ذلت سے پہلو بچائیں — نہ عبرت کہ دنیا کی سمجھیں ادائیں
نہ کل فکر تھا یہ کہ ہیں اس کے پھل کیا — نہ ہے آج پروا کہ ہونا ہے کل کیا

نہیں کرتے کھیتی میں وہ جانفشانی — نہ ہل جوتتے ہیں نہ دیتے ہیں پانی
پہ جب یاس کرتی ہے دل پر گرانی — تو کہتے ہیں حق کی ہے نامہربانی
نہیں لیتے کچھ کام تدبیر سے وہ — سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ

کبھی کہتے ہیں ہیچ ہیں سب یہ ساماں — کہ خود زندگی ہے کوئی دن کی مہماں
دھرے سب یہ رہ جائیں گے کاخ و ایواں — نہ باقی رہے گی حکومت نہ فرماں !
ترقی اگر ہم نے کی بھی تو پھر کیا — یہ بازی اگر جیت لی بھی تو پھر کیا

یہ سرگرم کوشش میں جو روز و شب ہیں — اٹھاتے سدا بارِ رنج و تعب ہیں
ترقی کے میداں میں سبقت طلب ہیں — نمائش پہ دنیا کی بھولے یہ سب ہیں
نہیں ان کو کچھ اپنی محنت سے لہنا — بناتے ہیں وہ گھر نہیں جس میں رہنا

کبھی کرتے ہیں عقل انساں پہ نفریں — کہ باوصف کوتاہ بینی ہے خود بیں
وہ تدبیریں اس طرح کرتی ہیں تلقیں — کہ گویا کھلا اس پہ ہے سرِ تکویں
مگر سب خیالات ہیں خام اس کے — ادھورے ہیں جتنے ہیں یاں کام اس کے

نہ اسبابِ راحت کی اس کو خبر کچھ — نہ آثارِ دولت کی اس کو خبر کچھ
نہ عزت نہ ذلت کی اس کو خبر کچھ — نہ کلفت نہ راحت کی اس کو خبر کچھ
نہ آگاہ اس سے کہ ہستی ہے شے کیا — نہ واقف کہ مقصود ہستی سے ہے کیا

کبھی کہتے ہیں زہر ہے مال و دولت — اٹھاتے ہیں جس کے لئے رنج و محنت
اسی سے گناہوں کی ہوتی ہے رغبت — اسی سے دماغوں میں آتی ہے نخوت
یہی حق سے کرتی ہے بندوں کو غافل — ہوئے ہیں عذاب اس سے قوموں پہ نازل

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش سے حاصل؟ — کہ مقسوم بن کوششیں سب ہیں باطل

نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی! تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی
نکموں کے ہیں سب یہ دلکش ترانے ہلانے کو قسمت کے رنگیں فسانے
اسی طرح کے کرکے حیلے بہانے نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

سُنی تم نے یہ جس جماعت کی حالت تنزل کی بنیاد ہے یہ جماعت
بگڑتی ہیں قومیں اسی کی بدولت ہوا اس کی ہے مفسدِ ملک وملّت
کیا صور و صیدا کو برباد اسی نے بگاڑا دمشق اور بغداد اسی نے

جہاں ہے زمیں پر نحوست ہے ان کی جدھر ہے زمانے میں نکبت ہے ان کی
مصیبت کا پیغام کثرت ہے ان کی تباہی کا لشکر جماعت ہے ان کی
وجود ان کا اصل البلیات ہے یاں خدا کا غضب ان کی بہتات ہے یاں

سب ایسے تن آسان و بیکار و کاہل تمدّن کے حق میں ہیں زہر ہلاہل
نہیں ان سے کچھ نوع انساں کو حاصل نہیں ان کی صحبت کہ ہے سمّ قاتل
یہ جب پھیلتے ہیں سمٹتی ہے دولت یہ جوں جوں کہ بڑھتے ہیں گھٹتی ہے دولت

جہاں بڑھ گئی ان کی تعداد حد سے ہوئی قوم محسوب سب دام و دد سے
رہا اس کو بہرہ نہ حق کی مدد سے وہ اب بچ نہیں سکتی نکبت کی زد سے
بچو ایسے شوموں کی پرچھائیوں سے ڈرو ایسے چپ چاپ یغمائیوں سے

مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے شرف جن سے نوع بشر کو ملا ہے
سب اس بزم میں جن کا نور وضیا ہے سب اس باغ کی جن سے نشو و نما ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر! بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر

نہ راحت طلب ہیں نہ مہلت طلب وہ لگے رہتے ہیں کام میں روز وشب وہ
نہیں لیتے دم ایک دم بے سبب وہ بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ
وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دُنیا کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دُنیا

چُنیں گر نہ وہ، ہوں کھنڈر کاخ و ایواں بنیں گر نہ وہ شاہ، کشور ہو عریاں
جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاندار بے جاں جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں
یہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے جو وہ کل سے بیٹھیں تو بیکل ہوں سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب وتواں کو گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو
سمجھتے نہیں اس میں جاں اپنی جاں کو وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو

بس اس طرح جینا عبادت ہے ان کی
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے اُن کی

مشقّت میں عمر اُن کی کٹتی ہے ساری
نہیں آتی آرام کی اُن کے باری

سدا بھاگ دوڑ اُن کی رہتی ہے جاری
نہ آندھی میں عاجز نہ مینہ میں ہیں عاری

نہ لُو جیٹھ کی دم تڑاتی ہے اُن کا
نہ بھر ماہ کی جی چھڑاتی ہے اُن کا

نہ احباب کی تیغ احساں سے گھائل
نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سائل

نہ دکھ درد میں سوئے آرام مائل
نہ دریا و کوہ اُن کے رستے میں حائل

سُنے ہوں کبھی رستم و سام جیسے
غیور اب بھی لاکھوں ہیں گمنام ویسے

کسی کو یہ دُھن ہے کہ جو کچھ کمائیں
کھلائیں کچھ اوروں کو کچھ آپ کھائیں

کسی کو یہ کد ہے کہ جھیلیں بلائیں
پہ احساں کسی کا نہ ہرگز اُٹھائیں

کوئی محو ہے فکر فرزند و زن میں!
کوئی چور ہے حبّ اہل وطن میں

جو مصروف ہے کشتکاری میں کوئی
تو مشغول دوکان داری میں کوئی!

عزیزوں کی ہے غمگساری میں کوئی
ضعیفوں کی خدمت گذاری میں کوئی

یہ ہے اپنی راحت کے ساماں کرتا
وہ کنبے پہ ہے جان قربان کرتا!

کوئی اس تگ و دو میں رہتا ہے ہردم
کہ دولت جہاں تک ہو کیجے فراہم

رہیں جیتے جی تاکہ خود شاد و خرّم
مریں جب تو دل پر نہ لے جائیں یہ غم

کہ بعد اپنے کھائیں گے فرزند و زن کیا
لباس ان کا اور اپنا ہوگا کفن کیا

بہت دل میں اپنے یہ رکھتے ہیں ارماں
کہ کر جائیں یاں کوئی کارِ نمایاں!

وہ ہوں تاکہ جب چشم عالم سے پنہاں
تو ذکر جمیل ان کا باقی رہے یاں

یہی طالب شہرت و نام لاکھوں!
بناتے ہیں جمہور کے کام لاکھوں!

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے
نشاں جن سے قائم ہیں صدق وصفا کے

نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے
نمائش سے بیزار دشمن ریا کے

ریاضت سب اُن کی خدا کے لئے ہے
مشقّت سب اس کی رضا کے لئے ہے

کوئی اُن میں ہے حق کی طاعت پہ مفتوں
کوئی نام حق کی اشاعت پہ مفتوں!

کوئی زہد و صبر و قناعت پہ مفتوں!
کوئی پند و وعظِ جماعت پہ مفتوں!

کوئی موج سے آپ کو ہے بچاتا!
کوئی ناؤ ہے ڈوبتوں کی تراتا!

بہت نوع انساں کے غمخوار و یاور!
ہوا خواہِ ملت، بہ اندیش کشور!

شدائد کے دریائے خوں میں شناور
جہاں کی پُر آشوب کشتی کے لنگر

ہر ایک قوم کی ہست و بوُد اُن سے ہے یاں
سب اس انجمن کی نمود ان سے ہے یاں

کسی پر ہو سختی صعوبت ہے اُن پر   کسی پر ہو غم، رنج و کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت، مصیبت ہے اُن پر   کہیں آئے آفت، قیامت ہے ان پر
کسی پر چلیں تیر، آماج یہ ہیں!   لُٹے کوئی رہ گیر، تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے   یہ پیماں کو میخوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوج حوادث سے ہیں لڑنے والے   یہ غیروں کی ہیں آگ میں پڑنے والے
اُمنڈتا ہے رُکنے سے اور اُن کا دریا   جنوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا

جماتے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ   بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب پھر سمٹتے نہیں یہ   جہاں بڑھ گئے بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ
مہم بن کئے سر نہیں بیٹھتے یہ   جب اُٹھتے ہیں اُٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو ان کو قوت   سمائی ہے دل میں بہت اس کی عظمت
نہیں پھیرتی اُن کا منہ کوئی زحمت!   نہیں کرتی زیر ان کو کوئی صعوبت
بھروسے پہ اپنے دل و دست پا کے   سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار ان کو   ہر اک راہ ہستی ہے ہموار ان کو
گلستاں ہے صحرائے پُرخار ان کو   برابر ہے میدان و کہسار اُن کو
نہیں حائل اُن کے کوئی رہ گزر میں   سمندر ہے پایاب اُن کی نظر میں

اسی طرح یاں اہلِ ہمّت ہیں جتنے   کمربستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہاں کی ہے سب دھوم دھام اُن کے دم سے   فقیر اور غنی سب طفیلی ہیں اُن کے
بغیر ان کے بے ساز و ساماں تھی مجلس   نہ ہوتے اگر یہ تو ویراں تھی مجلس

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے   زمانے کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار اُنہیں سے   کھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے
انہیں پہ ہے آباد ہر ملک و دولت   انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو؟

اُنہیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت   انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملّت
اُنہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت   اُنہیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت
دم اُن کا ہے دُنیا میں رحمت خدا کی   انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

اُنہیں کا اُجالا ہے ہر رہ گزر میں   انہیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
اُنہیں کا ظہورا ہے سب خشک و تر میں   انہیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں
انہیں سے یہ رُتبہ تھا آدم نے پایا   کہ سر اس سے روحانیوں نے جھکایا!

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے اُن سے   ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے

نجابت ہے ان سے شرافت ہے اُن سے
ہر اک قوم کی شان، شوکت ہے ان سے
جفاکش بنو، گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلّت میں پنہاں
مشقّت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی اُن کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت نہ عزّت نہ فرماں روائی!
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

اکبر الہ آبادی

غزلیات

بہار آئی کھلے گل زیب صحن بوستاں ہو کر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرم فغاں ہو کر
بچھا فرش زمرد اہتمام سبزۂ تر میں
چلی مستانہ وش باد صبا عنبر فشاں ہو
عروج نشہ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہو کر
بلائیں شاخ گل کی لیں نسیم، صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگیں بتاں ہو کر
جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر
کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحن گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اُٹھی بانگِ اذاں ہو کر
ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر
زبانِ برگ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
سبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر
نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے میں
کہیں چھپتا ہے اکبر! پھول، پتوں میں نہاں ہو کر

نہیں جمتا کسی کا نقش اس دنیائے فانی میں
حباب آسا مٹا، ابھرا جو بحرِ زندگانی میں
سکونِ قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں
بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی جوانی میں
اجل کی نیند آ جاتی ہے آخر سننے والے کو
قیامت کا اثر پاتا ہوں دُنیا کی کہانی میں
حباب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوُا گزرا
تماشا تھا ہوا نے اک گرہ دے دی تھی پانی میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں! وہ قصۂ عیش و طرب ہم سے
کسے اب یاد ہے؟ اک خواب دیکھا تھا جوانی میں
زبانِ حال سے پروانۂ بسمل یہ کہتا ہے!
حضوری ہو اگر حاصل مزا ہے نیم جانی میں
فلک نے مضمحل کر کے ہمیں خس کر دیا آخر
بہے جاتے ہیں بے مقصود بحرِ زندگانی میں

یہ طفلِ ناداں غریقِ غفلت ہوائے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں
بہار ہی سے نہیں ہیں واقف خزاں کے ظلموں کو کیا وہ سمجھیں
یہ داغ تو ہے انہیں کے دل پر جو محوِ رنگِ چمن رہے ہیں
نیا فلک ہے نئے ستارے یہ شوق سے کرتے ہیں نظارے
انہیں کو کچھ حس ہے گردشوں کا جو زیرِ چرخِ کہن رہے ہیں
یہ آخری صف میں آنے والے بہشت سمجھے ہیں اپنے تھالے
محلِ حسرت ہیں ان کے سینے جو زینتِ انجمن رہے ہیں
رہے ہیں جو برگ و خس کے خوگر انہیں ہو کیوں خار اُن کا منظر
نگاہ تو ہے انہیں کی مضطر جو مستِ سرو و سمن رہے ہیں
اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبرؔ
مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں

رباعیّات

کھولی ہے زباں خوش بیانی کے لئے اُٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبرؔ نظارۂ شاہد معانی کے لئے

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھّا
اکبر نے سُنا ہے اہلِ غیرت سے یہی جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھّا

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو جو اہلِ ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

بے سُود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبرؔ تو سرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈ محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار مذہب جو نہیں تو آدمیّت بھی نہیں

چیلیاں ایک دوسرے کی وقت پر چبھتے بھی ہیں ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لٹتے بھی ہیں

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

مسکین گدا ہو یا ہو شاہ ذی جاہ بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ

آ ہی جاتا ہے زندگی میں اِک وقت　　کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

روزی مل جائے مال و دولت نہ سہی　　راحت ہو نصیب شان و شوکت نہ سہی
گھر بار میں خوش رہیں عزیزوں کے ساتھ　　دربار میں باہمی رقابت نہ سہی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی　　ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ　　عزّت کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

اس عہد میں یہی ہے بس داخل نکوئی　　مذہب پہ نکتہ چینی ملّت پہ عیب جوئی
شوقِ عمل نہیں ہے فکرِ اجل نہیں ہے　　ناصح بنے ہیں اکثر عابد نہیں ہے کوئی

رُکتا نہیں انقلاب چارہ کیا ہے　　حیراں ہیں ملک بشر بچارا کیا ہے
تسکیں کے لئے مگر ہے کافی یہ خیال　　جو کچھ ہے خدا کا ہے ہمارا کیا ہے

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے　　رنگ چمن فنا سے گھبراتا ہے
کہتی ہے نسیم آ کے راز فطرت　　سنتے ہی پیامِ دوست کھل جاتا ہے

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے　　یا کوئی شئے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا　　پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے

دُنیائے دنی محلّ آفات بھی ہے　　فکرِ روزی مخلّ اوقات بھی ہے
طرّہ پھر اس پہ یہ کہ مرنا بھی ضرور　　جیتا رہے آدمی تو اک بات بھی ہے

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے　　لذّت وہ ہے کہ جوشِ صحت سے ملے
ایماں کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے　　عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے　　دیکھو نہ بہم عیب محبّت ہے تو یہ ہے

صحت بھی ہو روزی بھی ہو دل کو بھی ہو تسکیں — دُنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

حاسد تجھ پہ اگر حسد کرتا ہے — کر صبر کہ خود وہ کار بد کرتا ہے
اپنی پستی کر رہا ہے محسوس — اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے

جس کو خدا سے شرم ہے وہ ہے بزرگ دیں — دُنیا کی جس کو شرم ہے مرد شریف ہے
جس کو کسی کی شرم نہیں اس کو کیا کہوں — فطرت میں وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

اعلےٰ مقصود چاہیئے پیش نظر — کوشش تیری گو ہو لطف ذاتی کے لئے
فرہاد پہاڑ پر عمل کرتا تھا — شیریں کے لئے کرناشپاتی کے لئے

آگاہ ہوں معنی خوش اقبالی سے — واقف ہوں بنائے رتبہ عالی سے
شرطیں عزّت کی اور ہیں اے اکبرؔ — چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

طاقت وہ ہے با اثر جو سلطانی ہے — اُس جا ہے چمک جہاں زر افشانی ہے
تعلیم وہ خوب ہے جو سکھلائے ہُنر — اچھی ہے وہ تربیت جو روحانی ہے

غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبرؔ — بڑی مایوسیوں کے بعد اکثر کام چلتا ہے
یہ روشن ہے کہ پروانہ ہے اس کا عاشق صادق — مگر کہتی ہے خلقت شمع سے پروانہ جلتا ہے

تعلیم بھی پائی سب کے پیارے بھی ہوئے — دُنیا کو بھی خوش کیا ہمارے بھی ہوئے
لیکن جو یہ نورِ طبع پایا نہ گیا — پھر کیا تم عرش کے جو تارے بھی ہوئے

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

بُلبُلِ اسیر

"چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشکِ باغ
جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو"

مجھ کو نہ دے ہم صفیر! مژدہ فصلِ بہار
آہ کہ صیّاد کے دل پہ نہیں اختیار
یاد ہیں وہ دن کہ جب باغ میں تھا آشیاں
آہ وہ طرفِ چمن اور وہ سرِ شاخسار
لالۂ حمرا کا رنگ اور وہ سبزے کا روپ!
گوہرِ شبنم کی آب شاہدِ گل کا سنگار
رنگِ شفق کی نمود نورِ سحر کا ظہور!
چرخ کی نیرنگیاں شام و سحر آشکار
ابرِ سیہ کا ہجوم اور وہ مینہ کا وفور
رعد کا وہ زور و شور اور وہ چمک بار بار
غنچۂ بشگفتہ کی چار طرف وہ مہک
جیسے کوئی کھول دے نافۂ مشکِ تتار
گل بہ سرِ شاخسار یوسفِ مصرِ چمن
سرو لبِ جوئبار مثلِ خضر آب دار
باغ کی سرسبزیاں نخل کی سیرابیاں
پھول کی شادابیاں ابرِ بہار آبیار
موج ہوا سے درخت ملتے ہیں یوں باغ میں
جیسے کہ دو سبز پوش لطف سے ہوں ہمکنار
دیدۂ نرگس ہے یوں شاہد گل کی طرف

جیسے کوئی منتظر محو تماشائے بار

باغ میں گلچیں کو دخل اور نہ صیاد کو

رحمتِ پروردگار چار طرف تھی حصار

ہم سے نہ تھا باغباں بر سرِ کین و فساد

اپنی طرف سے نہ تھا دل میں کچھ اس کے غبار

وہ زرِ گل کی دمک جس پہ ہو کندن فدا

قطرۂ شبنم کی آب جس پہ ہو گوہر نثار

طبع کی صنعت گری پر نہ ہوا فوق کچھ

سونے کا زیور بہت لائے بنا کر سنار

لالۂ احمر تھا وہ یا کہ عقیق یمن

موتیا کی تھی کلی یا کہ دُرِ شاہوار

دیکھ کے یہ رنگ ڈھنگ کہنے لگے جوہری

گل ہے ہر اک زر نگاہ باغ جواہر نگار

نور کا تڑکا ہوا اور یہ عالم ہوا

آئی نسیم سحر باغ میں مستانہ وار

آئی نسیم سحر باغ کو جنبش ہوئی

ہلنے لگے سب درخت گرنے لگے برگ و بار

یوں دہن غنچہ سے قطرۂ شبنم گرے

دود اُگلنے لگے جیسے کوئی شیر خوار

آئی کسی شاخ سے ایسی سریلی صدا

جیسے بجائے کہیں بین کوئی بین کار

بھیروں اڑنے لگی باغ میں چاروں طرف

تانے اڑانے لگی اونچے سُروں میں ہزار

جنبشِ بادِ سحر پھونک دے سارا چمن

ہر طرف اُڑنے لگے آتشِ گل سے شرار

جمع کئے صبح نے ایک ہی جا نار و نور

پر تو خورز محض نور آتش گل محض نار

چشمۂ خورشید سے نور برسنے لگا
آتشِ گل سے ادھر بن کے اُٹھا اک بخار
سرد ہوا میں ہوئے جب کہ بخارات جمع
پھر تو دھواں دھار مینہ پڑنے لگا ایک بار
وہ چمن اور آب جو اور وہ ابرِ سیاہ
روم و حلب پر محیط ہے سپہ زنگبار!
مینہ کے برس جانے سے دھوئے گئے سب درخت
نام کو بھی باغ میں نہیں گرد و غبار
شاخ پہ اس طرح سے شاہد گل جلوہ گر
جیسے زمرّد کے تخت پر ہو کوئی شہریار
ایک طرف نسترن ایک طرف یاسمن
ایک طرف ارغواں سارے ہیں خدمتگذار
اور بھی خادم کئی سامنے موجود ہیں
جن کو اشارہ کئے چلتے ہیں سب کاروبار
ہے کوئی زرّیں کمر اور کوئی زرّیں کلاہ
ہے کوئی سیمیں بدن اور کوئی سیمیں عذار
لالہ و گل کی نمود کب ہے لبِ آب جُو
آئینے میں دیکھنا ہے چمن اپنی بہار
شاخ سے اکثر گرے پھول مہکتے ہوئے
نہر کا پانی تمام ہو گیا عطرِ بہار
بحرِ طلسمات میں سبز پری غوطہ زن
عکس ہے شمشاد کا نہر میں یوں آشکار
چار گھڑی دن رہے کا وہ سہانا سماں
شامِ اودھ شیفتہ صبحِ بنارس نثار
موجِ ہوا سرد سرد رنگِ شفق سُرخ و زرد
لالہ و گل کا بناؤ سرو و سمن کا سنگار
عارضِ گلگوں سے شوخ رنگ گل سُرخ کا

نشتر مژگان سے تیز باغ کا ہر اک خار
دھوپ کی زردی نما رنگ گنبد نیلی کا رنگ
دونوں ملے اس طرح سبزہ ہُوا آشکار
سایہ درختوں کا یوں صفحۂ گلزار پر
جس سے کہ عکسی شبیہ باغ کی ہو شرمسار
عکس فگن ہو کے شاخ دے ہے نظر کو فریب
دیدۂ نرگس میں ہے سرمۂ دنبالہ دار
گرتے ہیں یوں شاخ سے پھول علی الاتصال
تار نظر سے نگاہ گوندھ لے پھولوں کا ہار
دیکھ کے گلنار کو کہنے لگا باغباں
پھولوں کا گہنا پہن کے نکل آئی بہار
برگ ہر اک سبز سبز پھول ہر اک سرخ سرخ
مرغ چمن شاخ شاخ چہچہہ زن بار بار
مرغ چمن مل کے سب نغمہ سرا جس طرح
کوک دے ارگن کوئی اور الاپے بہار
سامنے ہیں مہر و ماہ دیکھئے صنع الٰہ
جیسے دو آئینہ رُو ہوئیں کسی جا دو چار
ایک کو سکتہ سا ہے ایک کو حیرت سی ہے
دیکھ کے اِک ایک کو دونوں ہیں آئینہ دار
ایک کا منہ زرد ہے ایک ہے بے نور سا
دیکھ کے گل کا سنگار اور چمن کا نکھار
رنگ گل نیلوفر گنبد نیلوفری
دیکھ کے گردش میں ہے جیسے کوئی بیقرار
صبح کا عالم کچھ اور شام کا عالم کچھ اور
صبح ہے کافور بیز اور ہے شب مشکبار
سنہری ورق شام روپہلی ورق
فیض مہ و آفتاب شام و سحر آشکار

رات کی وہ چاندنی اور وہ گل چاندنی
جس سے شب ماہ کی ہوتی ہے دونی بہار
دیکھ کے گل چاندنی ہوتا ہے سب کو یقیں
چادر مہتاب کے کترے ہیں گل بیشمار
کرمکِ شب تاب کا ہے یہ چمن میں ہجوم
تاروں بھری رات بھی جس سے کہ ہو شرمسار
ہے گل شبّو کی شاخ شمع شب افروز باغ
اور یہ اس شمع کے گرد ہیں پروانہ وار
باغ میں دیکھو جہاں ان کی چمک ہے عیاں
آتشِ گل سے مگر اُڑتے ہیں پیہم شرار
ہے وسطِ گل میں یہ ان کے سبب سے ظہور
دائرے ہیں جیسے ہو مرکزِ نور آشکار
بسکہ ہر اک برگ پر آگ سی ہے اک لگی
ہوتا ہے ہر نخل پر سب کو گمانِ چنار
سارے چمن میں یہی سرو و سمن میں یہی
دیدۂ نرگس میں نور آتش گل میں شرار
رات کی خاموشیاں رات کی تاریکیاں!
رات کی وہ راحتیں صبح کا وہ انتظار
باغ کی آرائشیں باغ کی زیبائشیں
موجِ ہوا تازہ کار رنگ شفق غازہ وار
نکہتِ گل عطر بیز آتش گل دود خیز
نکہت گل عطر بار آتشِ گل شعلہ بار
بوئے گُل عنبر سرشت سایۂ گل مشک ناب
سنبلِ پیچاں کے پیچ نافۂ مشک تتار
طبع چمن عطر ساز موج ہوا کارساز
غالیہ و مشک و عود مجمر و دود و بخار
دیکھئے جس نخل کو باغ میں ہے بامراد
طفل شگوفہ کو سب کہتے ہیں ہے ہونہار

باغ کی کیفیتیں دیکھ کے ہیں وجد میں
چرخ و مہ و آفتاب انجم و لیل و نہار
فرش سے تا عرش جو شے ہے وہ حیران ہے
قابلِ نظارہ ہے قدرتِ پروردگار
تجھ سے کہاں تک کہوں قصۂ دور و دراز
ہم اسی حیرت میں تھے اتنے میں اک دم دار
لے کے کوئی دام سخت آگیا گلزار میں
ہم جونہیں اڑنے لگے ہو گئے اس کے آشکار
آہ وہ آزادیاں راس نہ آئیں ہمیں
عہدِ مسرّت مگر ہم سے نہ تھا استوار
اس کو ہوئیں مدتیں ہم ہیں اسیرِ قفس
اب ہیں نہ وہ چہچہے اور نہ باغ و بہار
سامنے ہے یہ قفس اور یہی تیلیاں
ہے یہی آب و ہوا اور یہی لیل و نہار
قید میں گزری ہے عمر چھوٹنے سے یاس ہے
موت کی ہے آرزو موت کا ہے انتظار
آہ کہ طبعِ چمن ہم سے موافق نہ تھی
آہ مزاجِ بہار ہم سے نہ تھا سازگار
حالتِ بلبل اسیر تجھ سے کہوں کیا جگر!
دیدۂ عبرت سے ہوں اشک رواں بار بار

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں نوجواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے

تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو ۔ پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو ۔ سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن ۔ وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن ۔ تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے ۔ تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ! کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے ۔ دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لئے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی ۔ جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی ۔ دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی ۔ کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی ۔ سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا ۔ دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا ۔ وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اُس وقت کی کوئی سنا ۔ مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا ۔ داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

ابرِ کوہسار

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابرِ کوہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ مرا بحر مرا بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا
ناقۂ شاہد رحمت کا حُدی خواں ہونا
غم زدائے دل افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزم جوانانِ گلستاں ہونا
بن کے گیسو رُخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں

دُور سے دیدۂ اُمید کو ترساتا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گزر جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جُو آتا ہوں
بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نو خیز کی اُمید ہوں میں
زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنّم میں نے
سر پہ سبزے کے کھڑے ہو کے کہا قُم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسّم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

ایک آرزو

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری

دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذّت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں

روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دُعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

داغ

عظمت غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدیٔ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشم محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی، بزم سخن ماتم میں ہے
بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں

چل بسا داغ آہ! میّت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخیٔ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٔ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں!
تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہونگے صاحب اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خواب جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلّی! داغ کو روتا ہوں میں
اے جہاں آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن !
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن
وہ گُلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بُو ہوا
یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اُردو ہوا
تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں
اُٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دلّی ایک حالی رہ گیا
آرزو کو خون رُلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی ہے صیّاد اجل
کھُل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گُل کا باغ سے گلچیں کا دُنیا سے سفر

حقیقتِ حُسن

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیّر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سُنی
فلک پہ عام ہوئی، اخترِ سحر نے سُنی
سحر نے تارے سے سُن کر سُنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھّا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

ایک شام

دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

ستاروں کا خموش کارواں ہے یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا آغوش میں غم کو لے کے سو جا

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو ہے کیا ہراسِ فنا صورتِ شرر تجھ کو
زمیں سے دُور دیا آسماں نے گھر تجھ کو مثالِ ماہ اُڑھائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے پھر تری ننھی سی جان ڈرتی ہے
تمام رات تری کانپتے گزرتی ہے
چمکنے والے مسافر! عجب یہ بستی ہے جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل عدم، عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

قلعۂ اکبر آباد

یارب! یہ کسی مشعل کشتہ کا دھواں ہے — یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمیٔ بزم کی فریاد و فغاں ہے — یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں! دورِ گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — بانیٔ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اڑتا تھا یہاں پرچم جم جاہی اکبر
بجتا تھا یہاں کوس شہنشاہی اکبر

باہر سے نظر ڈالئے اس قلعہ پہ یک چند — برپا ہے لب آب جن صورت الوند
گویا کہ ہے اک سورما مضبوط تنومند — یا ہند کا رجپوت ہے یا ترکِ سمرقند
کیا بارۂ سنگین کا پہنا ہے قزاگند! — ریتی کا قزاگند پہ باندھا ہے کمربند

مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
ارباب تمرّد کے لئے برج ہیں سرکوب

تعمیر در قلعہ بھی البتہ ہے موزوں — پُرشوکت و ذی شان ہے اس کا رخِ بیروں
کی ہے شعرا نے صفت طاق فریدوں — معلوم نہیں اس سے وہ کمتر تھا کہ افزوں
گو ہمسر کیواں ہے نہ ہم پلۂ گردوں! — محراب کی ہیئت سے ٹپکتا ہے یہ مضموں

پیلان گراں سلسلہ با ہودجِ زرّیں!
اس در سے گزرتے تھے بصد رونق و تزئیں

اکبر سا کبھی مخزن تدبیر یہاں تھا — یا طنطنۂ دورِ جہانگیر یہاں تھا
یا شاہجہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا — یا مجمع ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا
القصہ کبھی عالم تصویر یہاں تھا — دنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا

بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشن ملوکانہ اسی قصر کے اندر

وہ قصرِ معلّٰے کہ جہاں عام تھا دربار — آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
وہ سقفِ زر اندود ہے مانند چمن زار — وہ فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار

اب بانگ نقیب اس میں نہ چاؤس کی للکار   سرہنگ کمربستہ، نہ وہ مجمع حضّار!

کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیّت کو مرا وقر تھا منظور   نافذ تھا زمانے میں مرے جاہ کا منشور
شاہانِ معاصر کا معیّن تھا یہ دستور   کرتے تھے سفیرانِ ذوی القدر کو مامور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پُر نور   آوازہ مری شان کا پہنچا تھا بہت دور

اکنافِ جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر، وہ دیہیم، وہ سامان کہاں ہیں   وہ شاہ، وہ نوئین، وہ خاقان کہاں ہیں؟
وہ بخشی و دستور، وہ دیوان کہاں ہیں   خدّام ادب اور وہ دربان کہاں ہیں!
وہ دولتِ مغلیّہ کے ارکان کہاں ہیں   فیضی و ابو الفضل سے اعیان کہاں ہیں؟

سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بارگہ خاص کی پاکیزہ عمارت!   تاباں تھے جہاں نیرِ شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت   آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت   سیّاح کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت

کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
"تھا مخزنِ اسرار یہی تاجوروں کا"

اورنگ سیہ رنگ جو قائم ہے لبِ بام   بوسہ جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظّام
اشعار میں ثبت اس پہ جہانگیر کا ہے نام   شاعر کا قلم اس کی بقا لکھتا ہے مادام
پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام   سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردشِ ایّام

فرسودگئ دہر نے شق اب تو کیا ہے
آئندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں کس لئے خاموش ہے او تختِ جگر ریش   کس غم میں سیہ پوش ہے کیا سوگ ہے درپیش
کملی ہے ترے دوش پہ کیوں صورتِ درویش   جوگی ہے ترا پنتھ، کہ صوفی ہے ترا کیش؟
بولا کہ زمانہ نے دیا نوش، کبھی نیش!   صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش

صدقے کبھی مجھ پہ گہر و لعل ہوئے تھے

شاہان معظمؐ کے قدم ہیں نے چھوئے تھے

رنگین محل اور برجِ مثمن کا وہ انداز — صنعت میں ہے بےمثل تو رفعت میں سرافراز
یاں مطرب خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز — گہ ہند کی دُھرپت تھی کبھی نغمۂ شیراز
اب کون ہے؟ بتلائے جو کیفیتِ آغاز — زنہار! کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز
جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ برج منوّر
اب ان کا مقابر میں تہِ خاک ہے بستر

اس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب — فوّارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جامِ بلوریں ہیں، نہ وہ گوہرِ نایاب! — وہ چلمنِ زرتار، نہ وہ بسترِ کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب — یہ معرضِ خدّام تھا، وہ موقفِ حُجّاب
وہ بزم، نہ وہ دَور، نہ وہ جام، نہ ساقی
ہاں! طاق و رواق اور در و بام ہیں باقی

مستور سرا پردۂ عصمت میں تھے جو گل — سو دودۂ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے کل
کچھ خیریٔ فرغانہ تھے، کچھ لالۂ کابل! — پھر مولسری ہند کی ان میں گئی بل جل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامل! — تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمل
سیّاح جہاندیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالات مرکّب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد — ہوتی تھی تلادان میں کیا کیا دہش و داد
زنجیرِ عدالت بھی ہوئی تھی یہیں ایجاد — جو سمعِ شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد
وہ نورجہاں اور جہانگیر کی اُفتاد — اس کاخِ ہمایوں کو بتفصیل ہے سب یاد
ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اس کی مورخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھئے وہ مسجد و حمامِ زنانہ — وہ نہر وہ حوض اور وہ پانی کا خزانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ — ہے طرزِ عمارت سے عیاں شانِ شہانہ
کیا ہو گئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ — ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ
چغتائیہ گلزار کی یہ فصلِ خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نورجہاں ہے

وہ قصر جہاں جودھ پوری رہتی تھی بائی — تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی

دیکھا اسے جا کر تو بُری گت نظر آئی — صحنوں میں جمی گھاس تو دیواروں پہ کائی
گویا در و دیوار پہ دیتے ہیں دہائی — ممکن نہیں طوفان حوادث سے رہائی
جس گھر میں تھے نسرین و سمن یا گل و لالہ
اب نسل ابابیل میں ہے اس کا قبالہ

وہ مسجدِ زیبا کہ ہے اس بزم کی دلہن — خوبی میں یگانہ ہے ولے سادہ و پُر فن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن — موتی سے ہیں دالان، تو ہے دودھ سا آنگن
کافور کا تودہ ہے کہ الماس کا معدن — یا فجر کا مطلع ہے کہ خود روز ہے روشن
بلّور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس؟
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس

ہاتھوں نے ہنر مند کے اک سحر کیا ہے — سانچے میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے — مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
نہ شمع، نہ فانوس، نہ بتی، نہ دیا ہے — ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے
چلیئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارے کی دو مجھ کو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی — اس قلعے میں ہوں شاہجہاں کی ہیں نشانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی — کچھ حالتِ موجودہ بایں سحر بیانی
اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی — فواروں کے دل میں بھی ہے اک درد نہانی
تسبیح، نہ تہلیل، نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفل گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزراء و امرا کا — مجمع تھا کبھی یاں صلحاء و علما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا — ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عزّو علا کا — جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکین

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایّام و لیالی — جو واقعہ حسّی تھا سو ہے آج خیالی
ہر کوشک و ایوان، ہر اک منزل عالی — عبرت سے ہے پُر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا نہ خداوند، اہالی نہ موالی — جُز ذات خدا کوئی نہ وارث ہے نہ والی

یہ جملہ محلّات ، جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کئے حیران کھڑے ہیں

جب کُند ہوئی دولتِ مغلیہ کی تلوار اور لوٹ لیا جاٹ نے ایوانِ طلاکار
تب ایک جو تھا لشکرِ انگلش کا سپہدار افواجِ مخالف سے ہُوا برسرِ پیکار
یہ بارہ و برج اور یہ ایوان ، یہ دیوار کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی بہ ناچار
ہے گردشِ ایام کے حملوں کی کسے تاب
پھر قلعۂ اکبر ہی میں کیا تھا پر سُرخاب

آخر کو مخالف کی شکستہ ہوئی قوّت اُونچا ہُوا سرکار کے اقبال کا رایت
لہرانے لگا پھر علمِ امن و حفاظت آثارِ قدیمہ کی لگی ہونے مرمت
یہ بات نہ ہوتی تو پہنچتی وہی نوبت دیوار گری آج تو کل بیٹھ گئی چھت
حکامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی
رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلوں کی نشانی

اربابِ خرد چشمِ بصیرت سے کریں غور کبر کی بنا اس سے بھی پائندہ ہے اک اور
سرزی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جور ہر چند گزر جائیں بہت قرن، بہت دور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برج حمل و ثور اس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور
انجنیئروں کی بھی مرمت سے بری ہے
وہ حصنِ حصیں کیا ہے؛ فقط ناموری ہے

او اکبر ذی جاہ! تری عزت و تمکیں محتاجِ مرمت ہے نہ مستلزمِ تزئیں!
کندہ ہیں دلوں میں تری الفت کے فرامیں ہے تیری محبت کی بنا اک دُرِ رنگیں
گو حملۂ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں
پشتوں سے رعایا میں بہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے ترے نام کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تری صحبت نے بھلایا اور بھوج کا دودھ تری شہرت نے بھلایا
ارجن کو تری جرأت و ہمت نے بھلایا کسریٰ کو ترے دورِ عدالت نے بھلایا
سکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا پچھلوں کو غرض، تیری عنایت نے بھلایا
آتے ہیں زیارت کو تو اب تک ہے یہ معمول
زائر تری تربت پہ چڑھا جاتے ہیں دو پھول

ہو کہنہ و فرسودہ ترا قلعہ تو کیا غم! شہرت ہے ترے نام کی سو قلعوں سے محکم
تا ہے ہر اک فرقہ محبت کا تری دم لکھتے ہیں مورّخ بھی تجھے اکبر اعظم
رتبہ ہے ترا ہند کے شاہوں میں مسلّم یہ فخر ترے واسطے زنہار نہیں کم
گو خاک میں مل جائے ترے عہد کی تعمیر
ہے کتبۂ عزّت ترا ہر سینے میں تحریر

پنڈت برج نارائن چکبست

رامائن کا ایک سین

(راجہ رامچندر جی کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام راہ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدّت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رُخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالم چرخ کہن کھلا وا تھا دہان زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دل غریب جو صرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثالِ بید
لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستے نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں اُن سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخلِ تمنّا جو بے ثمر یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدّر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغِ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالقِ عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سُن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے

ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دُور
شاید خزاں سے شکل ہو عیاں بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جبل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکرِ کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار ماتم کدے میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دُنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
بسوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب پیری مٹی کسی کی، کسی کا مٹا شباب!
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے!
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے نہ تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال اِن بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال خود دل سے درد ہجر کا مٹنا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوُا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

پڑتا ہے جب غریب پہ رنج و محن کا بار کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انسان گناہگار یا جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرتے میں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دُنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دستِ یاس وہ برگِ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بیشمار
موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرتِ چمن آرائے روزگار!
وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو ربِّ کریم کا
موجِ سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر
ہنس کر وفورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرے پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر
جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گزر
پنہاں جو بیکسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سُنی سب یہ داستان
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحاں
بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گماں
اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ ماممتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر، ہے یہ مرا وقت واپسیں   کیا اعتبار آج ہوں دُنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئیگا اس دل کو ہے یقیں   سوچوگے جبکہ روئی تھی کیوں مادر حزیں
اولاد جب کبھی تمہیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

ان آنسوؤں کی قدر تمہیں کچھ ابھی نہیں   باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمہیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں   جاؤ سدھارو، خوش رہو، میں روکتی نہیں
دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہونگی میں.
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہونگی میں

نشتر تھے رام کے لئے یہ حرف آرزو   دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان وآبرو   سُننی پڑی اسے یہ خجالت کی گفتگو
کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر وغور سے
قدموں پہ ماں کے گر پڑے آنسو کے طور سے

طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا نہ بند   رُک رُک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہنچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند   مرنا مجھے قبول ہے جینا نہیں پسند
جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لئے!
دوزخ یہ زندگی ہے اس اولاد کے لئے

ہے [illegible] اس غلام سے خودرائی کا خیال   ایسا گمان بھی ہو یہ میری نہیں مجال
گر [illegible] بھی عمر کو میری نہ ہو زوال   جو دین آپ کا ہے ادا ہو یہ ہے محال
جاتا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدے نے باپ کے

آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ   لیکن بہار عیش کا مجھ کو نہیں دماغ
کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دُنیا کا ہے چراغ   ہٹ جاؤں اس روش سے تو کُل میں لگیگا داغ
بے آبرو یہ بنس نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہونگا میں   کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہونگا میں
کیونکر زبان غیر کے طعنے سہونگا میں   دُنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کہونگا میں
لڑکے نے بے حیائی کو نقش جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب ! خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکیٔ عتاب چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب
سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اُٹھا لیا
سینے سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہؤا اور ہی سماں گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں
ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دسترت کے تاج میں

جوش ملیح آبادی

چاندنی رات

رات چھٹکاتی ہے تارے صبح برساتی ہے نور موسم باراں بچھا دیتا ہے سبزہ دُور دُور
چاندنی شب بھر دکھاتی ہے ضیائے روئے حُور ذرّہ ذرّہ صبح کو کہتا ہے میں ہوں برقِ طور
رات، زلفیں کھول دیتی ہے سلانے کے لئے
تاج پہنے صبح آتی ہے جگانے کے لئے

لہریں ہنس ہنس کے عجب نغمے سناتی ہیں مجھے ڈالیاں پھولوں کی جُھک جُھک کر بلاتی ہیں مجھے
شاخیں اپنے سائے میں پہروں بٹھاتی ہیں مجھے ندیاں اپنے کناروں پر سلاتی ہیں مجھے
کوئی مجھ کو رنج ان احباب میں دیتا نہیں
اور اس خدمت کی قیمت بھی کوئی لیتا نہیں

دیکھتے ہیں مجھ کو پہروں خندہ پیشانی سے پھول کس قدر مانوس ہیں آئینِ مہمانی سے پھول
ٹوٹ کر دامن میں آجاتے ہیں آسانی سے پھول کہتے ہیں مسرور مجھ کو اپنی قربانی سے پھول
پھول کے مانند انسانو ! تمہارا دل نہیں
میری خاطر جان بھی دینا انہیں مشکل نہیں

گونجتی ہے کوہ و صحرا میں پپیہے کی صدا اُودی اُودی آسمانوں پر جب آتی ہے گھٹا
رُوح کو بیدار کرتی ہے بیاباں کی ہوا دُور ہوتی ہے خودی، سینے میں آتا ہے خدا
کام رہتا ہے نہ دولت سے نہ فانی جاہ سے

لو لگا کر بیٹھ جاتا ہوں فقط اللہ سے

صاف دل ہو جا، مجھے تعلیم یہ دیتی ہے نہر ندیوں کے پیچ و خم سے خون میں آتی ہے لہر
دشت ہنستے ہیں کہ آبادی پہ کیوں نازاں ہیں شہر آب حیواں جس کو سمجھے ہیں وہ ہے اک موج زہر
سوز دیتا ہے بھری برسات کا دریا مجھے
عقل دیتا ہے گھنے جنگل کا سناٹا مجھے

نقرئی چادر بچھاتا ہے مہ سیمیں بدن چومتی ہے آ کے پیشانی مری زریں کرن
دیکھ کر شاداب ہوتا ہے مجھے صحنِ چمن کس قدر خوش ہوں کہ جنگل ہے مرا پیارا وطن
روز صحرا کی طرف جانا مرا دستور ہے
بستیوں میں ہوں، مگر میری قرابت دُور ہے

محروم

ملکۂ نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدّت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشق دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالم بے چارگی اے تاجوری ہے دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر یہ دورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر یہ اندھیر اے گردشِ ایّام! یہ اندھیر یہ اندھیر

ماہ فلک حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ! تری ہیچ نوازی کا گلا ہے
حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دل افگار سے کیا کیا اُٹھتے ہیں شرر آہ شرر بار سے کیا کیا
یہ عالم تنہائی یہ دریا کا کنارہ
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہُو کا نظارہ
چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر آرام لیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکّر
معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی
آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے جو نازکی میں داغ دِہ برگ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے شاداب گُل تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے
رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے جو پیکرِ ہستی کے لئے رُوح رواں تھے
محبوب دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے تھے یوسف ثانی کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں
دُنیا کا یہ انجام ہے دیکھ اے دلِ ناداں ہاں بھُول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں
ٹوٹا ہوا اِک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

اختر شیرانی

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے

اے وادیٔ گنگا! ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول، یہ نکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

یہ چاندنی رات اور یہ پُرخواب ہوائیں
اک موجِ طرب کی طرح بیتاب ہوائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظارے ہیں بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نور کے میخانے ہیں آباد
معصوم پریزادوں سے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں آباد
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
گلزار ہیں گل ریز، گہر بار ہوائیں
ہیں نور میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بال فشاں مستی و نکہت کے نظارے

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لیے چاندستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُرکیف بہاروں کے شبستاں
اختؔر کی تمنّا ہے، یہیں عمر گزارے

تنہائی

(چند لمحے غالب کی پروازِ خیال کے ساتھ)

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
اہلِ عالم ہوں نہ ربطِ دوستی و دشمنی
مہرباں کوئی نہ ہو نامہرباں کوئی نہ ہو
دامنِ صحرا میں چل کر یوں گزارا چاہیئے
سر میں ہو بے تاب سودا، آستاں کوئی نہ ہو
ابنِ آدم کے اثر تک سے ہو بیگانہ فضا
مرد و زن کوئی نہ ہو، پیر و جواں کوئی نہ ہو
زخمہ زن ہو بربطِ دل پر نہ سوزِ عاشقی
کوئی دلدادہ نہ ہو اور دلستاں کوئی نہ ہو
اپنی فریادوں کی لے میں رات دن کھوئے رہیں
ہم نوا کوئی نہ ہو، ہم داستاں کوئی نہ ہو
دل میں پیدا ہی نہ ہو اوّل تو دردِ آرزو
ہو تو اس کی بیکسی کا راز داں کوئی نہ ہو
روئیے تو ہو نہ اپنے حال کا پُرساں کوئی
اور اگر فریاد کیجے ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو"
"اختر! اس تنہائی کی وادی میں اپنے واسطے
جب بنے تربت تو تربت کا نشاں کوئی نہ ہو

روس سے نپولین کی مراجعت

(ناکام فاتح کا خطاب)

رخصت اے روس! آہ اے دیرانۂ خونین بہار
اے شکوہِ قہرمانانِ جہاں کی یادگار
کہہ چکی ہیں میری تلواریں ترے ہونٹوں کو پیار

ماسکو! اے خود سر و آزاد زادوں کی زمیں
قیصروں کی مرز بوم، اے تاجداروں کی زمیں
آہ اے گہوارۂ شاہنشہانِ ذی وقار
تیرے ویرانوں سے رخصت ہو کے اب جاتا ہوں میں
برف اور بارش کے طوفانوں سے گھبراتا ہوں میں
یہ ہوائے تند و سرد اور یہ فضائے برف بار
ماسکو! میں تجھ کو یوں بے حال کر سکتا نہ تھا
فتح کر کے اس طرح پامال کر سکتا نہ تھا
کر گئے جس طرح غارت تیرے وحشی نابکار
تیرے بچوں نے تجھے برباد و ویراں کر دیا
تیرے اک اک ذرّے کو آتش بداماں کر دیا
تیرے عالی شان ایوان بن چکے ہیں شعلہ زار
میری فوجیں چھا گئی تھیں تجھ پہ طوفاں کی طرح
ابرِ باراں کی طرح سیلِ بیاباں کی طرح
خاک میں ملنے ہی کو تھا تیرا صدیوں کا وقار
پر خدائی قہر نے لاچار مجھ کو کر دیا
فتح کی تکمیل سے بیزار مجھ کو کر دیا
آ رہے ہیں فتح کو ٹھکرا کے میرے شہسوار
آہ اس طوفانِ برف و باد سے مجبور ہوں
تیری ساری وسعتوں کی فتح سے معذور ہوں
بازوئے فطرت سے لڑ سکتے نہیں میرے سوار
اے زمیں! ہیں دفن تجھ میں نوجوانانِ فرانس
تیرا ہر ذرّہ ہے گورِ جنگ جویانِ فرانس
برق آسا کوندتی تھی جن کی تیغ آبدار
تیرے دامن میں مرے وہ سورما ہیں محوِ خواب
ساری دنیا میں نہ تھا جن کی شجاعت کا جواب
جن کے ڈر سے کانپ اٹھتے تھے خود سر تاجدار
تیری مٹی کے حوالے ان کو کر جاتا ہوں میں

چھوڑ کر جانا نہیں منظور، پر جاتا ہوں میں
بادل اندوہگین ، با دیدۂ خونابہ بار
دیکھنا میرے دلبروں کا کفن میلا نہ ہو
اُن کی قبروں کی ہو ذلّت، اے زمیں ایسا نہ ہو
مُردہ دُشمن کی اہانت ہے کمینوں کا شعار
جانتا ہوں برف کے طوفاں ہیں میرے منتظر
اک بھیانک موت کے ساماں ہیں میرے منتظر
وحشی کاسک راہ میں حائل قطار اندر قطار
ان موانع سے بھی میں لیکن گزر ہی جاؤنگا
بحرِ آفات و بلا سے پار اُتر ہی جاؤنگا
راستہ کر لے گی پیدا میری تیغ آبدار
الوداع اے روس کی خونیں بہارو الوداع!
الوداع او جنگ کے قاہر نظارو الوداع!
گر ملی فرصت تو پھر آئیں گے ہم اگلی بہار

نُورجہاں

خدائی نیند میں سرشار ہے برکھا کا موسم ہے
زمین شہدرہ پر چار سُو کھویا سا عالم ہے
افق پر منتشر مہتاب کی سرشار لہریں ہیں
فضا کے دامنوں میں موجزن چاندی کی نہریں ہیں
نقابِ آسماں میں ننھے تارے جھلملاتے ہیں
کہ بحرِ نیل میں گلہائے زریں کھلکھلاتے ہیں
غبارِ مرمریں سا اُڑ رہا ہے صحنِ ہستی سے
ہوا کی وسعتیں لبریز ہیں پھولوں کی مستی سے
چراغاں ہو رہا ہے چاند کے نیلے شبستاں میں
پریزادوں نے موتی سے بکھیرے ہیں پرستاں میں

چمن کی ہر کلی سے نور کی مستی چھلکتی ہے
در و دیوار سے مہتاب کی شوخی جھلکتی ہے
مئے نکہت کی موجیں اُڑ رہی ہیں سرو و سوسن پہ
نشے کا سا سماں چھایا ہوا ہے سارے گلشن پر
پرندے سو چکے ہیں جا کے اپنے آشیانوں میں
بھیانک سنسنی سی چھا رہی ہے گلستانوں میں
خموشی کا سماں اک ہوُ کا عالم ہے زمانے پر
سکوں طاری ہے قدرت کے انوکھے کارخانے پر
نہا کر آئی ہیں اندر کی پریاں عطر کے جل میں
نشے کی اُڑتی پھرتی ہیں سنسان جنگل میں
سکونِ شب سے ہیں ٹھہری ہوئی پانی کی نہریں بھی
کہیں گہرائیوں میں سو چکی ہیں جا کے لہریں بھی
روپہلی رات پر طاری ہے اندوہ حسیں کوئی
کہ گہری فکر میں لیٹی ہوئی ہے مہ جبیں کوئی
زمین و چرخ نے چپ سادھ لی ہے ہر صدا چپ ہے
اِدھر اُجلی فضا چپ ہے، اُدھر ٹھنڈی ہوا چپ ہے
یہ بھیگی رات، یہ مستانہ رت، یہ نور کا عالم
زمرّد رنگ نخلستان پر برقِ طور کا عالم
ہوا سے ننھی کرنیں کھیلتی ہیں شاخساروں پر
کہ کچھ چینی کی گڑیاں جھولتی ہیں سبزہ زاروں پر
اسی سنسان نخلستان میں اک اُجڑی عمارت ہے
جہاں دفن اک شہنشاہِ گرامی کی محبّت ہے
یہاں وہ بانوئے عفّت نشاں سوتی ہے تربت میں
کٹی تھی جس کی ساری عمر آغوشِ حکومت میں
ادب ! اے دل ادب کر ! روضۂ نورجہاں ہے یہ
مقدّس خواب گاہِ ملکۂ ہندوستاں ہے یہ

خواجہ دل محمد ایم۔ اے

خطاب بہ یونیورسٹی

(پنجاب یونیورسٹی کی جوبلی کے موقعہ پر)

علومِ نو سکھائے جا، رہِ یقین بتلائے جا حجاب سب اٹھائے جا، حقیقتیں دکھائے جا
ہوں دُور جس سے ظلمتیں وہ مشعلیں جلائے جا
طبیعتوں کی تشنگی بجھائے جا بجھائے جا

شباب مستِ خواب ہے اسے دوائے ہوش دے ہو جس میں لذّتِ عمل وہ جوش بے خروش دے
وہ جوش جو سروش کو ہلائے ناؤ نوش دے نگاہِ حق پسند دے جو گوشِ حق نیوش دے
رہِ ترقیوں کی راہ پر چلائے جا چلائے جا

یہ سرزمین زرفشاں جہاں میں انتخاب ہے ہمیشہ جس کو بھیجتا ہمالہ آبِ ناب ہے
یہیں وہ راویِ رواں سے ہوتی فیضیاب ہے کہیں یہ ستلج و بیاس و جہلم و چناب ہے
یہیں پہ نہرِ علم تو بہائے جا بہائے جا

فضائے ہند ہو رہی ہے تنگ و تار چارسُو کیا ہے پھُوٹ نے ہمیں ذلیل و خوار چارسُو
تباہیوں کی بجلیاں ہیں شعلہ بار چارسُو لپٹ کے پھر گلے ملیں یہ دلفگار چارسُو
کچھ اس ادا سے بنسری بجائے جا بجائے جا

فضا کو پا کے بیکراں، سمٹ گیا ہے آسماں تو ذرّہ ذرّہ وسعتوں سے ہو چلا ہے اک جہاں
تجسّس خیال ہے بہ فکرِ حدِ لامکاں تو علم و فن کے معجزوں سے ہر نہاں کو کر عیاں
نئی فضائیں رُوح کو دکھائے جا دکھائے جا

یہ ہے جو کائنات میں چھپا ہؤا حسیں کوئی ہے چاند جس کا آئینہ ہے وہ بھی مہ جبیں کوئی
ادائیں کیوں ہیں دلنشیں اگر حسیں نہیں کوئی ستارے کی نگہ سے پوچھ دیکھ ہے یہیں کوئی
سُراغ اُس حسیں کا تو لگائے جا لگائے جا

نگاہ میں سمائے جا، دل و جگر پہ چھائے جا کدُورتیں مٹائے جا، غلامیاں ہٹائے جا
پیام حق سنائے جا، اسی سے لَو لگائے جا یہ مجلسیں منائے جا، خوشی کے راگ گائے جا
ہوائے شوق و لُطف سے لبھائے جا لبھائے جا

علمائے یورپ کے عزائم

کاش سیکھیں اہلِ مشرق غربیوں کے رنگ ڈھنگ
ان کی ہمت، ان کی جودت، ان کا جوش، ان کی اُمنگ
دل میں جراُت ہاتھ میں تہذیب کی تلوار ہے
مشرقی سوتا ہے لیکن مغربی بیدار ہے
کرتے ہیں ان کے مدبر فتح اقوام زمیں
عالم ان کے کر رہے ہیں قصدِ چرخِ چار میں
عرش گیری ان کی رفعت کوشیوں سے سہل ہے
پائے گا مقصد وہ دُنیا میں جو اس کا اہل ہے
فکرِ ایجادات میں وہ منہمک ہیں صبح و شام
ہیں عناصر ان کے تابع برق ہے ان کی غلام
وہ طبیعی جو تمہاری رائے میں زندیق ہے
اب رگِ فطرت پہ اس کا نشترِ تحقیق ہے
ایک کہتا ہے اُڑے اس طرح طیارہ مرا
جس سے ہو زیرِ نگین ہر ایک سیارہ مرا
لطف ہے جب وادیوں میں چاند کی پہنچوں کہیں
یہ زمیں ہو چاند میرا، چاند ہو میری زمیں
مجھ کو حاصل ہو ثریّا و مہ و پروین کی سیر
عالمِ نظارہ کے ہر خطّۂ زریں کی سیر
زہرہ و مرّیخ کے ہوٹل مرے آرام کو
صبح کو پہنچوں عطارد، مشتری پہ شام کو
میں فضائے جوِّ عالم میں سدا اُڑتا پھروں
بے تکلّف، بے تکان اُڑتا پھروں، مُڑتا پھروں
ایک کہتا ہے مسخّر موت کو کرتا ہوں میں
موت کا جھگڑا مٹے اس بات پر مرتا ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا رہا جس کو خضر ظلمات میں
بس اسی کا ہے تجسّس مجھ کو کالی رات میں
ایک کہتا ہے مجھے ہے فکر اس ایجاد کی
جس سے روشن ظلمتیں سب ہوں عدم آباد کی
ایسا آئینہ بنا ڈالوں گا میں روشن گہر
جس میں ساری کل کی بیتی آج آ جائے نظر
ایک کہتا ہے کہ میں توڑوں گا ذرّے کا طلسم
آخر اک دن کھول کر چھوڑوں گا ذرّے کا طلسم
ذرّے ذرّے میں بھری ہے طاقت برق تپاں
اور ہی دنیا ہے اس کی اور ہی اس کا جہاں
چند ذرّوں کی بھی طاقت مجھ کو گر حاصل ہوئی
بس اسی سے سارے یورپ کی کلیں چل جائینگی
ایک کہتا ہے کہ ایسی گیس لا کر چھوڑ دوں
گوشے گوشے میں نسیم روح پرور چھوڑ دوں!
کامیابی ہو مجھے اعدا کی گر تقلیل سے
ان کو زہریلی ہوا میں بھیج دو سو میل سے
زور ہے جو ریڈیم میں منجمد کر لوں اسے
ہیلیم کی لے کے طاقت ٹیوب میں بھر لوں اسے
عرش کے جلوے ہوں آئینے میں میرے ضو فگن
چاہوں جب سونا بنا لوں لے کے سورج کی کرن
ابر کو جب چاہوں برسا دوں میں زورِ برق سے
برق و باراں سوئے مغرب کھینچ لاؤں شرق سے
کنز مخفی سب اُگل دے سامنے میرے زمیں
واقفیت طبقہائے خاک سے مشکل نہیں
جو شعاعیں صورتِ مژگاں بہت ہیں مختصر
غیب کی لائیں خبر پتھر کا سینہ چیر کر
غمگسار اپنا جو میلوں پر بھی ہو جاتا کہیں

ڈال کر پر تو بنا دوں راز دل اس کو وہیں
آئینے پر عکس لوں جذبات پنہانی کا میں
کھینچ لوں فوٹو خیال و نکتہ روحانی کا میں
بات میں تاروں سے بھی کر لونگا بے تار وسنوں
زہرہ و پروین کے میں سُنتا رہوں گا ارغنوں
پرتو پنہاں سے راز ماہ و انجم ہو عیاں
مشتری سے بات ہو مرّیخ میرا راز داں
قصر ابعاد ثلاثہ کی ہے بربادی قریب
دعوے اقلیدس کے باطل اُن سے آزادی قریب
ہندسے کو آئن اشٹائن نے برہم کر دیا
جُھک کے ابعاد ثلاثہ نے بھی سر خم کر دیا
رازِ برقِ تیز پا معلوم ہو جانے کو ہے
کلفت بُعد مکان معدوم ہو جانے کو ہے
عالمِ علمِ طبیعی کی فضا ہی اُور ہے
اہلِ یورپ کے دماغوں کی ہوا ہی اور ہے

خانصاحب حفیظ جالندھری

شام رنگین

مغرب کے گھر میں سورج بستر جما رہا ہے
رنگین بادلے میں چہرہ چھپا رہا ہے
کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو
عکسِ شفق نے کی ہے اس طرح زر فشانی
گُھل مل کے بہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی
اوڑھے سیہ دوپٹے سرسبز وادیوں نے

چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیڑوں تلے اندھیرا
چڑیوں نے کھیت چھوڑا لینے لگیں بسیرا
کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں
پریوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں
لیٹی ہوئی ہیں نیندیں کیف آفریں ہوا میں
خاموشیوں کی لہریں اٹھنے لگیں فضا میں
گم ہو چلی ہے دنیا بکھرے ہوئے سکوں میں
دن غرق ہو رہا ہے چپ چاپ کے فسوں میں
کھیتوں میں کام کر کے لوٹے ہیں کام والے
چادر سروں پہ ڈالے، کندھوں پہ ہل سنبھالے
اب شام آگئی ہے جاگے ہیں بھاگ ان کے
ہر سمت گونجتے ہیں رستوں پہ راگ ان کے
لے لے کے ڈھور ڈنگر چرواہے آ رہے ہیں
سیٹی بجا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں
کمسن سہیلیوں کا پنگھٹ پہ جمگھٹا ہے
جانے اکیلیوں کا دن کس طرح کٹا ہے
یہ بار بار باتیں، یہ بار بار ہنسنا!
یہ بے شمار باتیں، یہ بے شمار ہنسنا
وہ گدگدا رہی ہے، یہ کھل کھلا رہی ہے
یہ بھر چکی ہے پانی، گاگر اٹھا رہی ہے
شرما کے اس نے کھینچے منہ پر ہنسی کے مارے
رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے
شرم و حیا کی سُرخی چہرے پہ چھا رہی ہے
شام اس کو دیکھتی ہے اور مسکرا رہی ہے

صبح و شام کوہسار

کس قدر ہنگامہ پرور ہے سکوت کوہسار

کار پردازانِ قدرت ہیں یہاں مصروف کار
رفعتوں پر رفعتیں ہیں پستیوں پر پستیاں
کس قدر آباد ہیں برفانیوں کی بستیاں
اک بڑے قانون کی تعمیل ہوتی ہے یہاں
قسمتِ آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے یہاں
گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے
بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے
وقت بیچارہ یہاں پابند ہے مجبور ہے
اس مشقت گاہ کا ادنیٰ سا اک مزدور ہے
آسماں گردش میں ہے۔ وہ کام کرنے کے لئے
صبح کرنے کے لئے یا شام کرنے کے لئے

صبح

صبح کا یہ فرض ہے معمول پر آیا کرے
جس قدر سونا فراہم کر سکے لایا کرے
لے کے آتی ہے زرِ خالص کی کانیں ہر سحر
لا کے رکھ دیتی ہے سونے کی چٹانیں شرق پر
کیمیا سازانِ چرخ اُٹھتے ہیں اپنے کام کو
آگ کی بھٹی میں رکھتے ہیں طلائے خام کو
دفعتاً شعلے نظر آتے ہیں یا رنگیں دُھواں
چوٹیاں مشرق کی ہو جاتی ہیں سب آتش فشاں
دیکھتے ہی دیکھتے ہوتا ہے سونے کا یہ حال
کوئی شے پگھلی ہوئی کچھ قرمزی کچھ لال لال
حکم یہ ہے اس میں جو ناقص ہے چھن جایا کرے
اور باقی اک طلسمی گیند بن جایا کرے
بعض چابکدست شاگردانِ اُستادِ ازل!
کرتے ہیں اس گیند میں نیرنگ بھرنے کا عمل

جب پہاڑوں سے اُبھرتا ہے یہ بُقعہ نُور کا
حسن خود کرتا ہے نظارہ قریب و دور کا
کارگر کا جائزہ لیتے ہیں اُٹھ کر نور باف
ذرّے ذرّے پر چڑھا دیتے ہیں نورانی غلاف
یہ طلسمی گیند برساتی ہے نار آمیز نُور
زندگی کی گرم بازاری کا ہوتا ہے ظہور

شام

رفتہ رفتہ سرخیوں پر چھا گیا کالا غبار
مٹ گیا رنگِ شفق مُرجھا گیا یہ لالہ زار
نور کے زرّین ایوانوں میں تالے پڑ گئے
ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے
شام آئی ہے سکوں کا جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے
بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں
کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پر پھیلا دیئے
ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دیئے
ایک پُر اسرار خاموشی فضا میں بس گئی
اِک سُبک رفتار مدہوشی ہوا میں بس گئی
جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں
اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں
منتظر کہسار پر اس دم یہ ہوتا ہے گماں
اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے، اُترا ہوُا ہے کارواں
یا گھٹائیں ہیں کہ اُٹھیں سرد ہو کر جم گئیں
اور یا پھر آندھیاں ہیں چلتے چلتے تھم گئیں

یا کنارِ چرخ ظاہر ہیں اثر برسات کے
خیمۂ بوسیدہ میں پیوند ہیں بانات کے

درۂ خیبر

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں
کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دھلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے، ہوا تھرا کے چلتی ہے
یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار ہیں گویا پرانی داستانوں کے
یہی پگڈنڈیاں نیرنگ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونیں لکیریں ہیں
یہ ذرّے رہرووں کی ہمّتوں پر مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں
یہ پتّھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں
لئے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں ان سنسانیوں میں دفن دُنیا بھر کے ہنگامے
یہ بے آباد دہشت ناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ
انھی دشواریوں سے آریوں کا کارواں گزرا
زمینِ ہند پر جاتا ہؤا اک آسماں گزرا
اسی رستے سے ہو کر ہُنز اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے، کئی آباد کار آئے
یہ مٹی شانِ اسکندریہ کی ہے آئینہ دار اب تک
اُسی آندھی کا باقی ہے یہاں گرد و غبار اب تک
اسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں

انہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں
فلک نے اس زمیں پر بارہا محمود کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالع مسعود کو دیکھا
اُڑی یہ خاک برسوں تک غبار کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دُھواں ہو کر
اسے تیمور نے روندا، اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا
یہاں سے بارہا گزرے اٹالے بارگاہوں کے
قدم چُومے ہیں اس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے
کہاں اب وہ شکوہ نادری، اقبال ابدالی
بیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درسِ پامالی
یہ ہے وہ خارزار، اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے
ہوائے درّہ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی
کہ آ جائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

تذکرۂ مُصنّفین

(۱) نثر نگار

میر امّن دہلوی

بعض مصنفین کا بیان ہے کہ ان کا اصلی نام میر امان تھا اور لطف تخلص کرتے تھے۔ مگر وہ نام اور تخلّص کے مقابلے میں اپنے عرف یعنی میر امّن کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے بزرگ ہمایوں کے عہد سے شاہان مغلیّہ کے منصبدار اور جاگیردار رہے ہیں۔ اصلی وطن دہلی ہے۔ جہاں انہوں نے اپنی عمر کے چالیس سال گزارے۔ دہلی کے اُجڑنے پر

تلاش معاش میں عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے۔ چند سال یہاں گزار کر کلکتے چلے گئے۔ اور نواب دلاور جنگ کے بھائی محمد کاظم کے اتالیق مقرر ہوئے۔ دو سال کے بعد اپنے دوست منشی میر بہادر علی کے وسیلے سے فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) میں ملازم ہو گئے ؛

ان کی تالیفات میں "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" مشہور ہیں۔ جن میں باغ و بہار ایک غیر فانی شہرت کی مالک ہے ؛

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

آزاد دلّی میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مولوی باقر علی تھا۔ جو اُستاد ذوق کے دوست تھے۔ اسی وجہ سے آزاد نے ابتدائی تعلیم ذوق سے حاصل کی۔ شعر گوئی اور فن عروض انہی سے سیکھا۔ بعد ازاں دلّی کالج میں داخل ہوئے۔ غدر ۵۷ء کی مصیبتوں کے بعد وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ لکھنؤ آئے۔ پھرتے پھراتے ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور سررشتہ تعلیم کے محکمے میں پندرہ روپیہ ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کی۔ اس دوران میں وہ اُردو فارسی کی درسی کتابیں لکھتے تھے۔ جب کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم مقرر ہوئے تو آزاد نے ان کو آمادہ کر کے انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ایک ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں نیچرل نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ ۱۸۶۵ء میں وہ سرکاری کام سے کابل۔ بخارا اور ایران گئے۔ پھر ۱۸۸۳ء میں دوبارہ ایران کا سفر کیا۔ مدّت تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکۂ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر شمس العلما کا خطاب ملا۔ اپنی چہیتی بیٹی کی بے وقت موت کا اتنا صدمہ ہوا کہ ان کے قوائے دماغی خراب ہو گئے۔ ۱۸۸۹ء میں جنون کے آثار پیدا ہوئے۔ جس نے کسی ادبی کام کے لائق نہ رکھا۔ اسی عالم میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو انتقال کیا ؛

ان کی تصنیفات میں "آب حیات۔ دربار اکبری اور سخندان پارس سب سے زیادہ مقبول ہیں ؛

آزاد اُردو کے بہترین انشا پرداز ہیں۔ ان کی نثر کی سب سے

بڑی خصوصیت سادگی اور سلامت ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہو۔

شمس العلما مولینا الطاف حسین حالی

حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ننہال سادات کے اچھے گھرانے میں تھی۔ جدّی سلسلہ خواجہ ملک علی تک پہنچتا ہے۔ جو ایک مشہور عالم تھے اور غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ مولینا حالی کے والد خواجہ ایزد بخش عسرت کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت مولینا کی عمر نو برس کی تھی۔ مولینا کے بڑے بھائی اور بہن نے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ سترہ سال کی عمر میں مولینا کے خلاف مرضی ان کی شادی کر دی گئی۔ تحصیلِ علم کے شوق میں اس خیال سے کہ بیوی کے اعزہ خوشحال ہیں مولینا چپکے سے گھر چھوڑ کر ۱۸۵۴ء میں دلّی چلے آئے۔ یہاں مولوی نوازش علی سے جو اس زمانے کے مشہور معلّم اور واعظ تھے۔ سال ڈیڑھ سال تک عربی پڑھتے رہے۔ اس وقت وہ صرف و نحو۔ منطق اور عروض وغیرہ میں کافی دستگاہ حاصل کر چکے تھے۔ ۱۸۵۵ء میں اپنے اعزّہ کے اصرار پر پانی پت واپس آئے۔ یہاں اپنے طور پر کتب بینی کا مشغلہ جاری رکھا۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کر لی۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی وجہ سے وطن واپس چلے آئے۔ تین چار برس کے بعد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد سے ملاقات ہو گئی۔ اور مولانا ان کے مصاحب اور ان کے بچّوں کے اتالیق کی حیثیت سے ان کے پاس رہنے لگے۔ نواب صاحب مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ اس لئے مولانا بھی اپنی غزلیں اصلاح کی غرض سے مرزا صاحب کو بھیجنے لگے۔ آٹھ برس بعد وہ قسمت آزمائی کے لئے لاہور آئے۔ یہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک جگہ مل گئی اور سررشتۂ تعلیم کے لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی درسی کتابوں کی درستی کا کام کرنے لگے۔ اس دوران میں انگریزی ادب سے واقفیت ہوئی اور مولانا انگریزی خیالات کی سادگی اور واقعیت سے

متأثر ہوئے اور مشرقی شاعری کی خیال آرائیوں سے نفرت کرنے لگے۔اس سلسلہ میں انھوں نے اُردو شاعری کی اصلاح کرنے کی غرض سے متعدد نظمیں لکھیں۔لاہور میں چار برس تک قیام کرنے کے بعد وہ دلی واپس آئے اور اینگلو عربک اسکول میں ٹیچری کی جگہ مل گئی۔یہاں سرسید مرحوم سے ان کی ملاقات ہوئی۔۱۸۷۹ء میں انھوں نے اپنی مشہور نظم مسدس حالی لکھی۔۱۸۸۷ء میں سرسیّد نے سرآسمان جاہ (حیدر آباد) سے ان کا تعارف کرایا۔اور انھوں نے از راہ قدردانی مولینا کے لئے ۷۵ روپے ماہوار کا ایک ادبی وظیفہ حیدر آباد سے مقرر کرا دیا۔بعد کو یہ وظیفہ سو روپے ماہوار کر دیا گیا۔ملازمت سے دست کشی کے بعد مولانا پانی پت چلے آئے۔اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ شروع کر دیا۔۱۹۰۴ء میں اُن کی قابلیت کے اعتراف کے طور پر حکومت کی طرف سے شمس العلما کا خطاب ملا۔۱۹۱۴ء میں سترّ برس کی عمر میں وفات پائی ؎

مولانا اُردو میں نیچرل شاعری کے سرگرم حامی تھے۔ان کی نثر بھی ان کے شعروں کی طرح بہت سادہ اور حقیقت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ان کی مسدّس نظم میں اور ان کے دیوان کا خود نوشتہ مقدمہ نثر میں ان کی مشہور کتابیں ہیں۔وہ بہت اچھے سوانح نگار بھی تھے۔ ان کی لکھی ہوئی سر سیّد کی سوانح عمری موسوم بہ "حیاتِ جاوید" اور غالب کی سوانح عمری "یادگار غالب" اور "حیاتِ سعدی" فن سوانح نگاری کی اچھی مثالیں ہیں ؎

سیّد سجاد حیدر

نہٹور (ضلع بجنور) کے رہنے والے اور علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔علوم مشرقی (فارسی و عربی) کی تکمیل کے بعد علوم مغربی کی تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔اور ۱۹۰۱ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی ؎

گورنمنٹ کی ملازمت کے سلسلہ میں تین سال تک بغداد میں رہے جہاں ترکی زبان سے واقفیت حاصل کی۔چنانچہ آپ کے بیشتر مضامین ترکی

ادبیات ہی سے ماخوذ ہیں۔ بغداد سے واپس آنے پر ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔مسلم یونیورسٹی کی مشکلات اور پیچیدگیوں سے متاثر ہو کر رخصت حاصل کی اور کئی سال تک مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کے طور پر کام کرتے رہے ؛

سیّد صاحب نے ممالک اسلامیہ ٹرکی وغیرہ کی کئی مرتبہ سیاحت کی ہے۔ اُردو ادب کا جو رنگ آج مقبول ہے۔ سیّد صاحب اس کے بانیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اُردو زبان کو ترکی انشا کے آب و رنگ سے آشنا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی شہرت کا ابتدائی سبب وہ ترجمے ہیں جو ترکی اور انگریزی زبانوں سے انہوں نے کئے اور مخزن کے ابتدائی دور میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔لیکن سیّد صاحب کے طبعزاد مضامین بھی خاصی ادبی وقعت رکھتے ہیں۔ جن میں دو تین مضمون ان کی ذہانت، خوش طبعی اور طبیعت کی اپج کا بہترین نمونہ ہیں ؛

اظہار خیال کے لئے نئے نئے ترکیبی فقرے استعمال کرنا جو جدید ادب کا نمایاں پہلو ہے۔ سیّد صاحب اس کے مخترعین میں سے ہیں ؛

سیّد صاحب کئی کتابوں کے مؤلف و مترجم ہیں جن میں "خیالستان" سب سے زیادہ مقبول و مشہور کتاب ہے۔ اس میں ان کے طبع زاد اور مترجمہ مضامین شامل ہیں ؛

شمس العلما مولینا نذیر احمد دہلوی

مولانا نذیر احمد موضع راہر ضلع بجنور میں ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے والد کا نام مولوی سعادت علی تھا۔ ۱۸۴۵ء میں دہلی آکر مولوی عبدالخالق کے شاگرد ہوئے۔ انہی کی پوتی سے بعد کو مولانا کا عقد ہوا ؛

دہلی کالج میں داخل ہو کر عربی ادب فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی تکمیل کی ؛

اس زمانے کے بڑے آدمیوں کی طرح مولینا نذیر احمد نے بھی زندگی کی ابتدا پنجاب میں ایک چھوٹی سی ملازمت یعنی بیس پچیس روپے ماہوار کی معلمی سے شروع کی۔ غدر میں کسی میم کی جان بچانے کے صلے میں انسپکٹر مدارس بنا دئے گئے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ الہ آباد میں

ہو گیا۔ جہاں انہوں نے اپنی ذہانت اور طباعی سے چھ ماہ کے اندر انگریزی میں کافی مہارت پیدا کر لی۔ ۱۸۶۱ء میں بعض دوسرے انگریزی دان لوگوں کے ساتھ انڈین پینل کوڈ (تعزیرات ہند) کے ترجمے کی خدمت پر مقرر کیے گئے۔ان کا ترجمہ اتنا پسند آیا کہ حکومت نے انہیں پہلے تحصیلدار اور بعد ازاں افسر بندوبست بنا دیا۔

مولانا کی لیاقت کا شہرہ سن کر حیدر آباد کے سر سالار جنگ نے حکومتِ ہند سے اُن کی خدمات اپنے یہاں منتقل کرا لیں۔اور آٹھ سو روپے ماہوار پر افسر بندوبست مقرر کیا۔سر سالار جنگ کے ایما پر آپ نے انگریزی ملازمت سے استعفا دے دیا۔اور مستقل طور پر حکومتِ نظام کی ملازمت اختیار کر لی۔جہاں وہ ترقی کرتے کرتے سترہ سو روپے کے مشاہرے پر مالیات کے اعلیٰ رُکن بنائے گئے۔

مولینا علی گڑھ کالج کے پرانے سرپرست اور سر سیّد کی قومی و تعلیمی تحریک کے زبردست حامی تھے۔ حکومت کی طرف سے آپ کی علمی و دفتری خدمات کی وجہ سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۸۹۷ء میں شمس العلما بنائے گئے۔علمی شہرت کی بنا پر اڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی سند بھجوائی۔

مولینا اپنے عہد کے بہترین مقرر تھے۔وہ زیادہ تر اپنے ناولوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔جن میں توبۃ النصوح۔ابن الوقت۔مرآۃ العروس بنات النعش اور فسانۂ مبتلا وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

میرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

میرزا فرحت اللہ بیگ کا وطن دہلی ہے۔ان کے پردادا بدخشان سے آئے تھے۔اور گورنر جنرل کے دربار میں اکبر شاہ ثانی کی طرف سے "مختار کل" مقرر تھے۔

میرزا صاحب ۱۸۸۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔گورنمنٹ اسکول میں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۵ء میں مشن کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ دو سال بعد ۱۹۰۷ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے۔ابتدا میں سررشتہ تعلیم

میں ملازم ہوئے۔ ایک سال بعد آپ کی خدمات سررشتۂ عدالت میں منتقل ہو گئیں۔ آج کل آپ گلبرگے میں سشن جج ہیں ؞

ایک انشا پرداز کی حیثیت سے ان کی شہرت کی ابتدا ۱۹۲۸ء سے ہوتی ہے۔ آپ کا پہلا مضمون جو آپ کی ادبی شہرت کا سنگِ بنیاد ثابت ہوا "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" ہے۔ یہ مضمون انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالے "اُردو" میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ اسی طرح ان کے دو اور مضمون "غدر سے پہلے کا مشاعرہ" اور "مولوی وحید الدین سلیمؔ کے حالات" بھی پبلک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں ؞

میرزا صاحب اپنی تحریر میں دو چیزوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ اوّل خوش مذاقی۔ دوسرے دہلی کے بھولے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے حالات اور شاہی زمانے کی صحبتوں کے نقشے۔ سوانح و حالات کے خشک عنوانوں کو دلچسپ بنانے میں انھوں نے جو کوشش کی ہے وہ اُردو میں اپنی قسم کی پہلی مثال ہے۔ مرزا صاحب کا طرزِ تحریر سادہ اور مطالب پُر لطف ہوتے ہیں۔ آپ کے مضامین کا مجموعہ "مضامین فرحت اللہ بیگ" کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہو کر قبولیتِ عالم کا خلعت حاصل کر چکا ہے ؞

سر عبد القادر مدّظلہ

شیخ صاحب در اصل قصور کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے اسلاف قانون گو چلے آتے تھے۔ آپ کے والد شیخ فتح الدین لدھیانے کے دفتر (محکمہ) مال میں ملازم تھے۔ ان کے انتقال کے وقت شیخ صاحب کی عمر صرف ۱۵ سال کی تھی۔ آپ نے طالب علمی کا زمانہ بہت کامیابی سے گزارا۔ اور ۱۸۹۴ء میں فورمین کرسچین کالج لاہور سے اوّل درجے میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" کے ایڈیٹوریل سٹاف میں داخل ہوئے۔

۱۸۹۸ء میں چیف ایڈیٹر بنائے گئے۔ ۱۹۰۱ء میں اُردو کا مشہور رسالہ "مخزن" نکالا۔ ۱۹۰۴ء میں "پنجاب آبزرور" سے ترکِ تعلّق کرکے بیرسٹری کی غرض سے انگلستان گئے۔ کامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ نے اکثر مغربی ممالک اور ٹرکی کی سیاحت کی۔ اور واپسی پر اپنا سفرنامہ "مقام خلافت" لکھا۔

۱۹۱۱ء میں آپ لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۲۰ء میں لاہور چلے آئے اور پریکٹس شروع کر دی۔ ۱۹۲۱ء میں ہائیکورٹ کے عارضی جج بنائے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے۔ پھر علی الترتیب ڈپٹی پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ بنائے گئے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ کو عارضی طور پر پنجاب کی وزارت تعلیم کا قلمدان پیش کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ مجلس اقوام کے ساتویں اجلاس (جنیوا) میں ہندوستان کی طرف سے نمائندہ بنا کر بھیجے گئے۔ واپسی کے بعد ہائیکورٹ لاہور کے مستقل جج بنائے گئے۔ اس منصب سے سبکدوش ہونے پر انڈیا کونسل کی رُکنیت پر فائز ہوئے۔

شیخ صاحب اُردو کے بہت بڑے محسن ہیں۔ اپنے شہرۂ آفاق رسالے "مخزن" کے ذریعے سے آپ نے اُردو کی زندہ جاوید خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے نہ صرف اعلیٰ اور مفید مضامین سے اپنی زبان کو مالا مال کیا بلکہ اُردو کو بیسیوں ایسے اہل قلم بخشے جن پر اُردو ادب ہمیشہ ناز کریگا۔

شیخ صاحب کا طرز تحریر مولانا حالی کی طرح بہت سادہ اور عام فہم ہے اور اس پر شروع سے آخر تک تنقیدی متانت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں اُردو مصنفین کے حالات میں آپ نے ایک رسالہ بزبان انگریزی موسوم بہ "اُردو ادب کا جدید دبستان" تصنیف کیا تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ایک معزز کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر میں

باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ سرشار عربی فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ انگریزی انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھی تھی۔ مگر اس میں کوئی ڈگری نہیں لی۔ ابتدا میں وہ ضلع اسکول کھیری میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ یہیں سے وہ "مراسلہ کشمیری" میں جو کشمیری پنڈتوں کا ماہوار رسالہ تھا اور "اودھ پنچ" میں اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے۔ گو یہ مضامین کوئی خصوصیّت نہیں رکھتے تھے۔ مگر ان کی آئندہ تصنیفات کا سنگ بنیاد ضرور تھے۔ سرشار کو ترجمے میں بڑی مہارت تھی۔ وہ اپنا اس قسم کا کام سررشتۂ تعلیم کے کسی رسالے میں بھیجا کرتے تھے۔ جہاں وہ بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ڈائرکٹر تعلیمات ان کے مضامین کو بہت پسند کرتے اور ان کی قابلیت کی داد دیتے تھے۔ "مرآۃ الہند" اور "ریاض الاخبار" میں بھی ان کے مضامین شائع ہوئے کرتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں انہوں نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام "شمس الضحیٰ" رکھا۔ اس میں انہوں نے سائنس کی اکثر اصطلاحات کا نہایت عمدہ اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ اسی سال ڈاکٹر گریفتھ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے منشی نولکشور صاحب مالک "اودھ اخبار" سے ان کا تعارف کرایا اور وہ "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ سرشار نے اپنے مشہور ناول "فسانۂ آزاد" کا سلسلہ اسی اخبار میں شروع کیا تھا۔ جو دسمبر ۱۸۷۹ء تک قائم رہا اور ۱۸۸۰ء میں مکمل کتاب کی شکل میں شائع ہوا۔ وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم بھی ہو گئے تھے۔ مگر قواعدِ دفتر کی سختی کے متحمل نہ ہو سکے اور استعفا دے دیا۔ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد چلے گئے۔ جہاں مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے کلام نظم و نثر کی اصلاح کے لئے ان کا دو سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا تھا۔ کچھ عرصے تک وہ "دبدبۂ آصفیہ" کی ادارت بھی کرتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد میں ہی انتقال ہوا ؎

سرشار بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ مگر زیادہ تر اپنی نثر کی کتابوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ "فسانۂ آزاد" ان کا بہترین اور مشہور و مقبول ناول ہے۔ ان کی نثر بے حد رواں اور دلچسپ ہے۔ جس پر ہلکی ہلکی ظرافت کا رنگ غالب ہے۔ ان کی کتابوں میں بے ربطی اور عدم تسلسل کا نقص

عام طور پر پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ برجستہ لکھتے تھے اور نظرثانی نہیں کرتے تھے ؛

پروفیسر محمد سجّاد مرزا بیگ دہلوی

۱۸۷۶ ـــــــ ۱۹۲۷

مرزا صاحب کے بزرگ غدر ۵۷ء سے پہلے قلعہ دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض اہل سیف اور بعض اہل قلم کے زمرے میں ملازم تھے۔ غدر کے بعد مرزا صاحب کے والد محمد مرزا بیگ صاحب نے سرکارِ انگریزی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور بزرگوں کے نام اور خاندانی حرمت کو صبروقناعت کے گوشے میں بیٹھ کر عزّت و آبرو کے ساتھ سنبھالے رکھا۔ جب ۱۸۹۶ء میں ان کا انتقال ہؤا تو مرزا صاحب تلاش روزگار میں حیدرآباد چلے گئے۔ اور وہاں نظام کالج میں پروفیسری کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ان کے گھرانے کی زبان اُردوئے معلّٰی تھی ؛

مرزا صاحب کی سب سے پہلی تصنیف "دلفگار" اور "تمنائے دید" ہیں۔ یہ دونوں ناول طالب علمی کے زمانے میں دوستوں کی مجلس کو گرمانے کے لئے لکھے تھے۔ لیکن نظر کی وسعت کے ساتھ طبیعت کا رنگ بدلا اور علمی و ادبی مضامین لکھنے میں مشغول ہو گئے ان کی تیسری تصنیف حکمت عملی ہے۔ جس کا ایک اقتباس تعلیم نسواں، اسی نصاب میں داخل ہے۔ اس کتاب کا پایہ اُردو میں بہت بلند ہے۔ حکمت عملی کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف الانسان، الاستدلال، تسہیل البلاغت اور الفہرست ہیں؛

مرزا صاحب کی زبان نہایت صاف، شگفتہ اور رواں ہے۔ اور علمی و دقیق مضامین کو ایسی خوبی و سلاست سے بیان کرتے ہیں کہ سمجھنے میں ذرا دقّت نہیں ہوتی۔ ان کے مزاج میں بیحد سادگی تھی۔ شہرت و نام سے گھبراتے اور بچتے تھے۔ اس دنیا کی ہا و ہُو کو خالی برتنوں کی جھنکار سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو خاموشی کے ساتھ علمی مشاغل میں بسر کر دیا

اور کبھی عزت و جاہ کے طلبگار نہیں ہوئے۔

۱۹۱۵ء میں اعلیٰ حضرت حضور نظام نے اُن کی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں دو سو روپے ماہوار کا خاص وظیفہ تصنیف و تالیف کے کاموں کو فراغت کے ساتھ انجام دینے کے لئے مرحمت فرمایا۔

۲۔فروری ۱۹۲۷ء کو آپ نے بعارضۂ فالج چار دن بیمار رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔اور چادر گھاٹ حیدر آباد میں موسیٰ ندی کے قریب دفن ہوئے۔

مولینا وحید الدین سلیمؔ

مولانا سلیمؔ پانی پت کے رہنے والے تھے۔ان کے پدر بزرگوار حاجی فرید الدین صاحب کو شاہ بوعلی قلندر کے مزار کی تولیت کا شرف حاصل تھا۔ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر لاہور آئے۔جہاں آپ نے مولوی فیض الحسن سہارنپوری سے عربی ادب کی اور مفتی عبد اللہ ٹونکی سے معقول و منقول کی تکمیل کی اور انگریزی میں انٹرنس کا اور فارسی میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد بہاولپور کے صیغۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے۔کچھ عرصے کے بعد رامپور ہائی سکول کے ہیڈ مولوی مقرر ہوکر رامپور چلے گئے۔مگر اپنے مربّی اور قدردان جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کے حادثے پر ترک تعلق کر کے پانی پت آ گئے۔کچھ عرصے بعد مولینا حالی کی وساطت سے سر سیّد مرحوم کی خدمت میں پہنچے۔اور ان کے پرائیویٹ سکرٹری بن گئے۔سر سیّد کے انتقال کے بعد آپ نے "معارف" کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔جو کچھ عرصے تک کامیابی سے چلتا رہا۔اس کے بعد نواب محسن الملک کے اصرار سے علی گڑھ گزٹ کی ادارت قبول کی۔مگر بعد کو علالت کی وجہ سے ترک کرنا پڑی۔بعد ازاں مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔بعض تیز سیاسی مضامین لکھنے کی بنا پر یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی۔پھر اخبار "زمیندار" لاہور کے چیف ایڈیٹر بنے۔لیکن اخبار کی ضمانت ضبط ہونے کی بنا پر آپ کو قطع تعلق کرنا پڑا۔

آپ کی ادبی اور علمی شہرت آپ کو حیدر آباد کے دارالترجمے میں کھینچ لے گئی۔ جہاں آپ نے اپنی مشہور کتاب "وضع اصطلاحات" تالیف فرمائی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام پر آپ پہلے اسسٹنٹ، اُردو پروفیسر اور چار سال بعد پروفیسر مقرر ہوئے اور مرتے دم تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

آپ کی نثر کی خصوصیت یہ ہے کہ مولینا حالی کی نثر کی طرح سادہ عام فہم اور شیریں ہوتی ہے۔ مشکل اور ادق الفاظ سے گراں بار نہیں ہوتی۔

مولینا عبدالحلیم شرر

مولینا شرر جمعے کے روز ۲۰۔ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ کو غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم تفضل حسین تھا۔ جو عربی و فارسی میں اعلیٰ دستگاہ رکھنے کے ساتھ بہت اچھے طبیب بھی تھے۔ ابتدا میں آپ نے اپنے والد سے اور بعد ازاں دوسرے اساتذہ سے معقول ادب اور منطق کی کتابیں پڑھیں۔ طبی تعلیم بھی شروع کی تھی۔ کچھ انگریزی بھی بڑھی۔ مگر پرائیویٹ طور پر اور بالکل ناقص۔ اخبارات کا ذوق اسی زمانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ اور مولانا اودھ اخبار (لکھنؤ) کے نامہ نگار کی حیثیت سے خبریں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔

۱۹ سال کی عمر میں کلکتے سے لکھنؤ آئے۔ اور مولوی محمد عبدالحی مرحوم سے عربی کی درسی کتابیں ختم کیں۔ بیس سال کی عمر میں دہلی آ کر مولوی نذیر حسین محدث دہلوی سے حدیث کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد از سر نو انگریزی کا شوق ہوا۔ اور خانگی طور پر بے انتہا محنت سے بقدر ضرورت دستگاہ پیدا کر لی۔ اب مولینا نے اخبارات میں باقاعدہ مضامین لکھنے شروع کئے۔ جن میں سیاست کی بجائے انشا پردازی کا مذاق بڑھا ہوا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے ان کو "اودھ اخبار" کے اڈیٹوریل سٹاف میں لے لیا۔ نئی عمر اور نیا ادبی شوق، چند ہی روز میں اُن کے خاص رنگ نئے مضامین کی شہرت ہو گئی۔ ۱۸۸۲ء میں اودھ اخبار سے قطع تعلق کر کے مولینا نے

ناول نگاری شروع کی۔ ان کا سب سے پہلا ناول "دلچسپ" تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اپنا مشہور ماہانہ رسالہ "دلگداز" جاری کیا۔ جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۸۸۸ء میں مولینا نے "دلگداز" میں مسلسل ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ جو بعد کو کتابی صورت میں شائع ہو کر بہت مشہور ہوا۔ ۱۸۹۱ء میں مولینا نے حیدر آباد کا سفر کیا اور دو سو روپے ماہوار کے ملازم ہو گئے۔ ۱۸۹۵ء میں نواب وقار الامرا کے صاحبزادے کے اتالیق بنا کر انگلستان بھیجے گئے۔ جہاں ۱۴، ۱۵ مہینے قیام رہا۔ اس زمانے میں انہوں نے کسی قدر فرنچ سیکھی۔ واپسی پر ۱۹۰۰ء میں حیدر آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں پھر طلب کئے گئے۔ آخرکار ۱۹۰۴ء میں مستقل طور پر لکھنؤ چلے آئے اور "دلگداز" اور "مہذب" کو از سر نو جاری کرنے کے ساتھ ناول و تاریخ نگاری کے مشغلے کو بھی زندہ کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۶ء یعنی اپنے انتقال کے سال تک انہی مصروفیتوں میں منہمک رہے۔ مولانا کے ناول سب کے سب تاریخ اسلام کے واقعات سے لبریز ہیں۔ اسی لئے وہ تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ گو انہوں نے تاریخ و سوانح کی بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک دو عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہیں۔ مولانا اردو میں اس نئے رنگ کے بانیوں میں سے ہیں۔ جو آج عام طور پر اخباری زبان کا رنگ ہے۔ مولانا کی نثر کی خصوصیت خیال آفرینی، دلچسپی اور منظر کشی ہے۔

راشد الخیری

۱۸۶۸ء — ۱۹۳۶ء

ان کے جدّ اعلیٰ مولینا ابوالخیر خیر اللہ تھے۔ جو شاہجہان بادشاہ کے زمانے میں عرب سے دہلی آئے تھے۔ اس نسبت سے یہ خیری، کہلاتے ہیں۔ ان کے پردادا مولوی عبدالخالق تھے۔ جن کا ذکر سرسیّد نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف آثار الصنادید، میں کیا ہے اور والد نظام گورنمنٹ میں محکمۂ بندوبست کے افسر اعلیٰ تھے۔ آپ کو دہلی کے ایک اور مایۂ ناز اہلِ قلم مولانا ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ بھی قرابت قریبہ کا شرف حاصل کرنے کے بعد آپ

عربک اسکول دہلی میں داخل ہوئے اور میٹرک کا امتحان اسی اسکول سے پاس کیا اگرچہ ابتدا میں اُنھوں نے مولینا نذیر احمد اور مولانا آزاد کا تتبع کیا مگر بعد میں اپنے رنگ کے آپ ہی مُوجد بنے لنسائیات ان کا موضوع ہے۔ عورتوں کی حمایت میں ان کے قلم نے ایسی ایسی الم انگیز داستانیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ جن کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ اسی لئے ملک نے مصوّرِ غم کا انہیں خطاب دیا ہے۔ اُردو میں ان سے بہتر اور نہ اس کثرت سے ٹریجڈی کسی نے لکھی ہے۔ ان کی ساٹھ پینسٹھ کے قریب تصنیفات ہیں۔ مگر باستثنائے بعض سب کی سب رونے رُلانے والی اور دُکھڑا سنانے والی ہیں۔ مگر "سات روحوں کے اعمالنامے" اور "نانی عشو" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیڈی لکھنے میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ایک مدرسۂ بنات جاری ہے۔ ان کی تصانیف میں صبح زندگی۔ شام زندگی اور شبِ زندگی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ رسالہ "عصمت" و رسالہ "جوہر نسواں" و رسالہ بنات، بھی آپ کی زیر ادارت نکلتے رہے ہیں +

مولوی عبدالحق

مولوی صاحب کا وطن مالوف ہاپوڑ ضلع میرٹھ ہے۔ قانون گوئیوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم پنجاب (گوجرانوالہ) اور یو۔پی میں پائی پھر مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں داخل ہو گئے۔ اس وقت سرسیّد نے مدرسۃ العلوم نیا نیا جاری کیا تھا۔ اس لحاظ سے آپ علی گڑھ کالج کے سب سے پہلے طلبہ میں سے ہیں۔ اپنے فلسفیانہ خیالات کی بنا پر آپ کالج میں "عبدالحق فلسفی" کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۸۷۹ء میں آپ نے سر سید کے شہرہ آفاق رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں پہلے پہل اُردو زبان کے مستقبل پر مضمون لکھا۔ گویا قدرتی طور پر اس سے آپ کی آئندہ زندگی کا نصب العین واضح ہو گیا۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ کچھ مدّت تک ملازمت کے سلسلے میں ضلع گجرات

(پنجاب) میں مقیم رہے۔ اس زمانے میں آپ نے مشہور فارسی شاعر مولینا غنیمت کے مزار کی درستی کرائی۔ بعد ازاں آب و دانے کی کشش حیدرآباد (دکن) لے گئی۔ جہاں آپ شروع میں مدرسۂ آصفیہ کے ہیڈماسٹر بنے۔ اس سے ترقی کر کے اورنگ آباد میں انسپکٹر تعلیمات بنائے گئے۔ اس زمانے میں آپ کی تجویز سے لکھنؤ میں پہلے پہل انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی جو بعد ازاں آپ کی نگرانی میں اورنگ آباد منتقل ہو گئی۔

مدّت تک انسپکٹر تعلیمات رہنے کے بعد آپ اورنگ آباد کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ آپ ان چند افراد میں سے ہیں۔ جن کی تجاویز کے ماتحت عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اور اعلیٰ پیمانے پر ایک دارالترجمے کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس دارالترجمے کا پہلا ناظم آپ کو ہی مقرر کیا گیا تھا۔ اورنگ آباد کالج سے پرنسپل کی حیثیت سے اپنی مدّتِ ملازمت ختم کرنے اور پنشن لینے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر بنائے گئے جہاں آپ تادمِ تحریر متعیّن ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو کی ایک جدید لغت لکھنے کی خدمت بھی آپ کے سپرد ہے۔

مدّتِ دراز سے آپ انجمن ترقی اُردو کے آنریری سیکرٹری ہیں۔ انجمن کی طرف سے ہر سال متعدّد مفید علمی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ اور ایک بلند پایہ سہ ماہی رسالہ "اردو" کے نام سے نکلتا ہے۔ جس کے آپ ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی سعی و اہتمام سے اُردو کی بیسیوں نادر اور نامعلوم کتابیں شائع ہو کر حیاتِ تازہ حاصل کر چکی ہیں۔

مولانا مقدمہ نگار کی حیثیت سے بھی ایک امتیازی شہرت کے مالک ہیں اور متعدد کتابوں پر اصل کتابوں سے زیادہ قیمتی اور قابلِ قدر مقدمے تحریر فرما چکے ہیں۔ آپ کا کتب خانہ اس وقت دُنیا بھر میں اُردو کا بہترین کتب خانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ مولینا اُردو زبان و ادب کے محسنِ اعظم ہیں۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ صاحب سنہ ۱۲۹۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ خواجہ نظام الدین

اولیا کے ہمشیر زادے مشہور ہیں۔ اسی نسبت کی وجہ سے درگاہ نظام الدین اولیا میں رہتے ہیں۔ صوفی اخبار نویس اور مصنف سبھی کچھ ہیں مضمون نگاری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ "مخزن" اور دوسرے رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ طبیعت میں خاص اپج ہے۔ جو ہر معمولی سے معمولی چیز کو مضمون کا موضوع بنا لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین کے عنوان بہت عجیب اور انوکھے ہوتے ہیں۔ مثلاً "فرام قبلہ ٹو شملہ"۔ "سگنل کی لال آنکھ"۔ "ہم ہیں بلک ایک پٹنا کے"۔ "اینٹ چونے کا وصال"۔ "مچھر کا اعلان جنگ"۔ "مکھی کا میدان جنگ" وغیرہ ؛

۱۹۱۰ء میں انہوں نے "رعیت" کے نام سے ایک روزنامہ نکالا تھا۔ اس کے شذرات کے عنوانات بھی اسی قسم کے ہوتے تھے۔ متعدد رسالوں کے ایڈیٹر، مالک اور نگراں و سرپرست ہیں۔ ساٹھ ستر کے قریب کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اُن کی نثر سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔ جس میں صوفیانہ چاشنی اور تیکھاپن پایا جاتا ہے۔ دس سے زیادہ کتابیں غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات اور شاہی خاندان کی مظلومیت کے حالات پر مشتمل ہیں۔ ایک مشہور صوفی ہونے کی حیثیت سے غیر ادبی حلقوں میں بھی رسوخ و اثر رکھتے ہیں۔ ان کے بے شمار مُرید ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک کامیاب پیر بھی مانے جاتے ہیں ؛

متعدد رسائل کے مالک و مدیر ہونے کے علاوہ چند سال سے انہوں نے دہلی میں ایک دارالاشاعت بھی قائم کر رکھا ہے۔ جس کا نام "حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی" ہے ؛

خواجہ صاحب کا طرز تحریر زیادہ تر اخباری ہے۔ جسے ان کی غرابت پسندی اور جدت طرازی نے بہت دلچسپ بنا دیا ہے ؛

سیّد عمر حسنی

اس خاندان کے ایک بزرگ امیر قطب الدین ۶۶۶ھ میں بعہد غیاث الدین بلبن ہندوستان آئے اور کڑے میں مقیم ہوئے۔ ان کی اولاد سادات قطبیہ کہلاتی ہے۔ اس خاندان کے ایک نامور بزرگ سیّد احمد

بریلوی رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ سیّد صاحب کی چوتھی پشت میں مولوی محمد علی صاحب مصنّفِ "سرورِ المحزون" و "سیرۃ نبوی" وغیرہ بڑے عالم و شاعر گزرے ہیں۔ جو نواب محمد علی خاں مرحوم والیٔ ٹونک کے استاد تھے۔ سیّد صاحب کے والد معتمد الملک حافظ سیّد محمد خاں بہادر ظفر جنگ المتوفی ۱۳۲۵ھ ریاست ٹونک کے مختلف پرگنوں میں ناظم رہے ÷

سید صاحب — علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی۔ بعد ازاں جاپان چلے گئے۔ اور ٹوکیو سے بیچلر آف انجنیئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں کے مختلف کارخانوں میں کام سیکھ کر ہندوستان آئے۔ اور حیدر آباد (دکن) کے محکمۂ برقی میں الکٹریکل انجنیئر رہے۔ وہاں سے ریاست بھوپال نے آپ کی خدمات مستعار مانگ لیں۔ اور آپ بھوپال میں بحیثیت چیف الکٹریکل انجنیئر پانچ سال تک کام کرتے رہے۔ اس دوران میں نواب جنرل عبید اللہ خاں نے آپ کو مزید تعلیم کے لئے جرمنی بھیج دیا۔ جہاں آپ نے ٹیکنیکل یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ جنرل مرحوم کے انتقال پر آپ نے برگمینی کے کارخانے میں بحیثیت پروجیکٹنگ انجنیئر ملازمت کر لی۔ ان دنوں آپ ریاست جوناگڑھ میں انجنیئر ہیں ÷

اٹاوہ ہائی سکول میں آپ کچھ عرصے تک معلّم بھی رہ چکے ہیں۔ علی گڑھ سے نکلنے کے بعد مولینا ابو الکلام کے مشہور رسالہ "الہلال" میں بھی کام کرتے رہے ہیں۔ اُردو کے اکثر رسائل میں "کلامی" کے نام سے آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ÷

---

۲ - شعرا

مرزا محمد رفیع سوداؔ

سوداؔ تخلّص۔ مرزا محمد رفیع نام۔ باپ مرزا محمد شفیع مرزایان کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ سوداؔ ۱۱۲۵ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش اور تربیت پائی۔ سوداؔ بموجب رسم زمانے کے اوّل سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ اوّل فارسی شعر کہا کرتے

تھے۔ لیکن ایک روز خان آرزو نے کہا کہ "مرزا! فارسی اب تمہاری زبان نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہلِ زبان کے مقابلے میں قابلِ تعریف ہو۔ چونکہ تمہاری طبع موزوں ہے۔ تم اُردو کہا کرو تو یکتا ئے زمانہ ہو گے۔" مرزا بھی سمجھ گئے اور اُستاد دیرینہ سال کی نصیحت پر عمل کیا۔ غرض طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلّی جیسے شہر میں ان کی اُستادی نے خاص و عام سے اقرار لیا۔ جب ان کے کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا۔ تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے۔

ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضا کیا۔ انہوں نے عذر بیان کیا اور باتوں ہی باتوں میں اُن سے ان بن ہو گئی۔ اور اُٹھ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بُلا بھیجا۔ اور یہ بھی کہا کہ ہم تم کو ملک الشعرا کر دیں گے۔ یہ نہ گئے اور بے اعتنائی سے کہا کہ حضور کی ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کرے گا تو میرا کلام کریگا۔ غرض مرزا دل شکستہ ہو کر گھر میں بیٹھ رہے۔ قدر دان موجود تھے۔ کچھ پرواہ نہ ہوئی۔ اور اُن لوگوں کی بدولت ایسی فارغ البالی سے گزرتی تھی کہ اُن کے کلام کا شہرہ جب نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سُنا تو کمال اشتیاق سے طلب کیا۔ انہیں دلّی کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط ایک رباعی پر حُسنِ معذرت کو ختم کیا ؂

سودا پئے دُنیا تو بہر سُو کب تک آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نا کہ دُنیا ہووے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

کئی برس کے بعد وہ قدر دان مر گئے تو سودا بہت گھبرائے۔ اس عہد میں ایسے تباہی زدوں کے لئے دو ٹھکانے تھے۔ لکھنؤ یا حیدرآباد۔ اس لئے جو دلّی سے نکلتا تھا۔ اِدھر ہی رُخ کرتا تھا ؂

غرض ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دلّی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ اور ان کے آنے پر انہوں نے کمال خورسندی ظاہر کی۔ لیکن یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے کہا کہ مرزا وہ رباعی تمہاری اب تک میرے دل پر نقش ہے اور اسی کو مکرّر پڑھا۔ انہیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا۔ اور بپاسِ وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ مر گئے۔ اور آصف الدولہ مسند نشین ہوئے ؂

جب تک مرزا زندہ رہے۔ نواب مغفرت مآب اور اہلِ لکھنؤ کی قدردانی سے ہر طرح فارغ البال رہے۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ ہجری میں وہیں دُنیا سے انتقال کیا ۞

قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا اُن کا پہلا فخر ہے گرمیٔ کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخیٔ طفلانہ اُن کے مزاج میں اُمنگ دکھلاتی تھی۔ مگر ہجوؤں کا مجموعہ جو کلیات میں ہے اس کا ورق ورق ہنسنے والوں کے لئے زعفران زارِ کشمیر کی کیاریاں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دلی کسی طرح سے فکر و تردّد کو پاس نہ آنے دیتی تھی۔ گرمی اور مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی۔ اور اس شدّت کے ساتھ کہ نہ کوئی انعام اسے بجھا سکتا تھا۔ اور نہ کوئی خطرہ اسے دبا سکتا تھا۔ نیتجہ اس کا یہ تھا کہ ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا۔ جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر دیتے تھے ۞

غنچہ نام ان کا غلام تھا۔ ہر وقت خدمت میں رہتا تھا۔ اور ساتھ قلمدان لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتی تو فوراً پکارتے "ارے غنچے! لا تو قلمدان۔ ذرا میں اس کی خبر لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے"! پھر شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا مُنہ کھول کر وہ بے نقط سناتے کہ شیطان بھی امان مانگے ۞

مرزا ایسی طبیعت لے کر آئے تھے۔ جو شعر و فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی۔ میر صاحب نے بھی انہیں پورا شاعر مانا ہے۔ ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر نوع میں طبع آزمائی کی ہے وہ کہیں رُکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں۔ جن سے ان کا کلام جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی

درستی سے لفظوں کو اس در و بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولائتی طپنچے کی چانپیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص انہیں کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعروں میں سے کچھ بھول جائیں۔ تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ شعر مزا ہی نہیں دیتا۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ مگر اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینے کا کام دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے ان کے ہاں ہیں۔ مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ۔ رنگینی کے پردے میں مطلب اصلی گم نہیں ہونے دیتے۔

میر تقی میر

میر محمد تقی نام اور میر تخلص۔ ان کے بزرگ عرب کے رہنے والے تھے جو دکن میں وارد ہوئے اور وہاں سے احمد آباد گجرات پہنچے۔ بعض وہیں رہ پڑے۔ بعض نے تلاش معاش میں ہمت کا قدم آگے بڑھایا۔ میر صاحب کے پردادا نے اکبر آباد (آگرہ) کو وطن بنایا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ ان کے فرزند یعنے میر صاحب کے دادا آگرے کے فوجدار تھے۔ پچاس سال کی عمر میں علیل ہو کر گوالیار گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کو خلل دماغ کا عارضہ تھا۔ وہ جوان مر گیا۔ چھوٹے کا نام علی متقی مشہور ہے۔ میر صاحب انہی کے فرزند ارجمند تھے۔

تلاش معاش میں دلّی آئے اور نواب صمصام الدولہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ نواب صاحب نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب کی ملازمت جاتی رہی۔ پھر آگرے چلے آئے۔ مگر جب گزارے کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی تو ناچار پھر دلّی کا رخ کیا اپنے بڑے بھائی کے خالو خان آرزو کے ہاں ٹھہرے۔ ایک بزرگ میر جعفر نامی سے کچھ تعلیم حاصل کی رشید سعادت علی خاں نے ریختے (اردو) میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ شوق بڑھتا گیا اور میر صاحب نے بڑا نام پیدا کیا۔ مختلف ملازمتوں سے گزر اوقات کی۔ دلّی کی ویرانی

کے بعد پریشانی کی حالت میں جگہ جگہ پھرے اور شاد و ناشاد زندگی
بسر کرتے رہے۔ بادشاہ عالمگیر ثانی نے کئی مرتبہ بلایا۔ مگر وہ کبھی نہ گئے۔
بادشاہ کبھی کبھی گھر بیٹھے کچھ نہ کچھ بھیج دیتے تھے۔ آصف الدولہ کی طلبی
پر لکھنؤ پہنچے۔ یہاں البتہ قدر ہوئی۔ اور خوشحالی سے گزر کرنے لگے ؂
میر صاحب اردو غزل گوئی میں سب سے بلند مرتبے پر فائز ہیں۔
ناسخ اور غالب جیسے شاعروں نے اُن کی اُستادی کا اعتراف کیا ہے ؂
ان کی غزلیں بہت سادہ، جذباتی اور سوز و درد سے لبریز ہیں
اور اسی لئے دل پر خاص اثر کرتی ہیں ؂

انشا

سید انشاء اللہ خاں نام اور انشا تخلص تھا۔ والد کا نام میر ماشاء
اللہ خاں ہے۔ ان کے بزرگ نجف سے آکر دلّی میں بس گئے تھے۔
رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہو گئے۔ والد شاہی طبیب تھے۔ مصدر
تخلص کرتے تھے۔ زوال سلطنت کے زمانے میں مرشد آباد گئے۔ جو
نوابانِ بنگال کا دارالحکومت تھا۔ انشا یہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائے عمر
میں علوم رسمیہ اپنے والد ہی سے حاصل کئے۔ شعر گوئی کا مذاق بچپن
سے تھا۔ کبھی والد سے اصلاح لیا کرتے۔ شاہ عالم کے زمانے میں دِلّی آئے۔
بادشاہ نے بڑی قدر کی۔ انشا شاعر ہونے کے علاوہ بڑے ظریف اور بذلہ
سنج تھے۔ ان کے اس کمال نے وہ رنگ جمایا کہ بادشاہ گھڑی بھر کے
لئے بھی جدا نہ ہونے دیتے۔ آخر کار دلّی کی تباہی سے بد دل ہو کر
دوسرے شعرا کی طرح لکھنؤ پہنچے۔ ابتدا میں شاہزادہ میرزا سلیمان شکوہ
کی ملازمت اختیار کی۔ بعد کو نواب سعادت علی خاں (نواب اودھ) کے
درباریوں میں داخل ہو گئے۔ نواب بھی انشا کی خوش مزاجی سے اتنے متاثر
ہوئے کہ تھوڑی دیر کی جدائی بھی ناگوار تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ان کی
خوش طبعی کا یہ نہال تلخ کامی کا پھل لایا اور انجام اچھا نہیں ہوا۔ انشا
بعض اوقات حد سے گزر جاتے اور جو منہ میں آتا کہ جاتے تھے۔ اس
جسارت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں نواب صاحب کی طبیعت ان سے

مکدر ہو گئی اور انشا کا آخری وقت بُری حالت میں گزرا۔ ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی ؎

انشا کے کلام کا اکثر حصہ ظریفانہ انداز کا حامل ہے۔ چنانچہ غزلوں پر بھی یہی رنگ چڑھا ہوا ہے زبان پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ اور وہ ہر قسم کے مضمون کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔ اردو شاعروں میں ایسا طباع اور ذہین شخص شاید ہی پیدا ہوا ہو ؎

میرزا عظیم بیگ

تذکرہ نگاروں نے کابلی الاصل لکھا ہے۔ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ دو غزلہ درکنار اکثر سہ غزلہ اور چہار غزلہ کہا کرتے تھے۔ قصیدے بھی لکھتے تھے۔ صنائع اور بدائع کے استعمال کا بہت شوق تھا۔ معنی بندی ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ بقول صاحب تذکرۂ مجموعہ نغز اپنے آپ کو اردو زبان کا صائب سمجھتے تھے۔ اور دوسرے شاعروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ابتدا میں شیخ ظہور الدین حاتم کے شاگرد تھے۔ آخر میں مرزا رفیع سودا سے مشورہ کرنے لگے۔ کچھ عرصے تک خواجہ میر درد دہلوی سے بھی فیض سخن حاصل کیا ہے۔ میر انشا سے ان کا معرکہ مشہور ہے۔ بے خیالی میں ایک غزل کے چند شعر جو بحر رجز میں تھی بحر رمل میں کہہ ڈالے۔ انشا کو ایسا موقعہ خدا دے۔ ایک نظم میں خوب خبر لی۔ مرزا نے جواب میں جو نظم لکھی ہے وہ اردو میں بے حد مشہور ہے ؎

نظیر اکبر آبادی

ولی محمد نام اور نظیر تخلص ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مگر اکبر آبادی مشہور ہیں۔ کیونکہ عمر کا زیادہ حصہ آگرے میں گزارا تھا۔ والد کا نام محمد فاروق تھا۔ بارہ بھائیوں میں صرف یہی زندہ رہے تھے۔ اس لئے ماں باپ کو ان سے بہت محبت تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملۂ ہند کے وقت اپنی ماں اور نانی کو ساتھ لے کر آگرے چلے گئے۔

روضۂ تاج محل کے قریب رہنے لگے ؛

نظیر کی تعلیم کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ہندی فارسی کے علاوہ کسی قدر عربی بھی جانتے تھے۔ اور اس زمانے کے قاعدے کے مطابق خوشنویسی سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ چونکہ طبیعت میں قناعت اور آزاد روی تھی۔ اس لئے انہوں نے کبھی دولت اور جاہ کے حصول کی کوشش نہ کی۔ اور جس حال میں تھے اُسی میں عُمر گزار دی۔ نواب سعادت علی خاں نے لکھنؤ بلایا۔ مگر نہ گئے۔ اسی طرح بھرت پور کی دعوت کو بھی رد کر دیا ؛

ابتدائی عمر میں متھرا کا سفر کیا اور کسی مکتب میں معلّم ہو گئے تھے۔ مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر آگرے چلے گئے۔ اور لالہ بلاس رام کے لڑکے کے اتالیق مقرر ہوئے جہاں سے سترہ روپے ماہوار ملتے تھے ؛

نظیر نے بہت طویل عمر پائی تھی۔ انہوں نے میرؔ اور سوداؔ کا زمانہ بھی دیکھا اور ناسخؔ و انشاؔ اور جراءتؔ کا عہد بھی۔ آخر عمر میں فالج کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی عارضے میں بہت کبرسنی کی حالت میں ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو وفات پائی۔ جیسا کہ اُن کے ایک شاگرد کے اس مصرع تاریخی سے معلوم ہوتا ہے ۔۔ ع مخمس بے سروپا، بیت بے دل، فرد بے سرشد ؏

غالب

نجم الدّولہ دبیرالملک مرزا اسد اللہ خاں غالب ۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباد و اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور سپاہگری ان کا پیشہ تھا۔ جیسا کہ مرزا نے خود بھی کہا ہے ۔۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپاہگری ۔۔۔ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مرزا کے والد عبداللہ بیگ خاں رئیس الور کی فوج میں ملازم تھے۔ وہ کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کی عمر ۵ برس کی تھی۔ والد کی وفات کے بعد مرزا اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں کے پاس آگرے میں پرورش پاتے رہے۔ ابتدائے عمر میں انہوں نے فارسی زبان کو نہایت

محنت اور شوق سے سیکھا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ چنانچہ وہ فارسی شاعروں میں اُستاد مانے گئے ہیں اور اُردو کی نسبت اُن کا فارسی دیوان بہت ضخیم ہے۔ لیکن زیادہ مقبولیت اُن کے اُردو دیوان کو حاصل ہوئی جو متعدد بار چھپ چکا ہے۔ اور حال ہی میں اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں

ذوق کی وفات کے بعد مرزا کو بہادر شاہ ظفر کی اُستادی کا فخر حاصل ہوُا۔ لیکن دو سال کے بعد دہلی پر غدر کی مصیبت آئی اور وہ سب کھیل بگڑ گیا۔ اختتام غدر کے بعد مرزا رام پور کی سرکار میں چلے گئے۔ وہاں سو روپیہ مہینہ ان کی تنخواہ مقرر ہو گئی۔ لیکن وہاں وہ زیادہ عرصہ نہ ٹھہرے اور واپس دہلی چلے آئے۔ جہاں چند سال تنگی و عسرت میں گزار کر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ۷۳ برس کی عمر میں دنیا سے رحلت کی ؛

مرزا غالب اُردو شاعری میں نئی طرز کے موجد خیال کئے جاتے ہیں ان کا تخیل بلند اور مضامین عالی ہیں۔ فلسفہ ان کے کلام کا بڑا جزو ہے اور جدّت ادا اس کا خاص جوہر ہے ؛

اُردو میں دیوان کے علاوہ، نثر میں ان کے رقعات اور خطوط کے دو مجموعے ہیں۔ ایک اُردوئے معلّےٰ اور دوسرا عود ہندی۔ ان خطوط کی عبارت اپنی سادگی اور روانی میں بے مثل ہے۔ اور ظرافت و شوخی کی چاشنی نے اس کی لطافت و شیرینی کو دو بالا کر دیا ہے ؛

مرزا کی زندگی کے حالات کو مولٰنا حالی نے جو ان کے شاگردوں میں سب سے زیادہ نام آور ہوئے ہیں۔ ایک کتاب کے اندر جمع کر کے شائع کیا ہے۔ جس کا نام "یادگار غالب" ہے

انیس

میر ببر علی انیس۔ پیدائش فیض آباد ۱۸۰۱ء۔ وفات لکھنؤ ۱۸۷۴ء اقلیم مرثیہ گوئی کے شہنشاہ تھے۔ اور یہ فن اُن کے آباؤ اجداد کا خاص حصہ تھا۔ وہ فخریہ کہتے ہیں ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پُشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

میر صاحب بہت پُرگو تھے ۔ ہزاروں مرثیے انھوں نے لکھ ڈالے اور کوئی مرثیہ ڈیڑھ سو دو سو بند سے کم کا نہ ہوگا ۔ لیکن باوجود پُرگوئی کے اُن کے کلام میں کہیں ابتذال یا عامیانہ پن نہیں آنے پایا ۔ قادر الکلامی اُن کی ذات پر ختم تھی ؛

ان کے مرثیوں کی چار جلدیں چھپ چکی ہیں اور عام طور سے ملتی ہیں ؛

مولوی محمد محسنؔ (۱۸۲۷ء ۔ ۱۹۰۵ء)

محمد محسن نام ۔ محسنؔ تخلّص ۔ مولوی حسن بخش خلف مولوی حسین بخش کاکوروی کے فرزند ہیں ۔ ۱۲۴۲ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے ۔ سات برس کے سن سے سولہ برس تک اپنے جد امجد کے دامن تربیت میں پرورش پائی ؛

مین پوری میں چند روز عہدہ نظارت پر کام کیا اور وہیں سے وکالت ہائی کورٹ کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی ۔ اس زمانے میں صدر دیوانی آگرے میں تھی ۔ اس لئے آگرے میں بود و باش اختیار کی اور ۵۷ء تک یہیں رہے ۔ بعد میں مین پوری چلے آئے اور اپنی وکالت کو خوب ترقی دی ؛

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا ۔ ابتدا میں کچھ غزلیں بھی لکھیں اور کبھی کبھی کسی کی فرمائش سے قصیدہ یا مثنوی یا دوستوں کی تحریک سے تاریخہائے ولادت و وفات لکھیں ، ورنہ ان کا اکثر کلام نعتیہ ہے ان کا کلیات ان کے فرزند اکبر مولوی نور الحسن بی ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی ۔ نے جمع کر کے چھپوا دیا ہے ؛

ان کے کلام کا عام جوہر تخیل کی بلند پروازی ۔ الفاظ کی شان و شکوہ بندش کی چستی ، استعارات کی رنگینی اور قصّہ طلب تلمیحات ہیں ۔ امیر مینائی کی رائے ہے کہ " ان کا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے ۔ اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے " ۱۸ ۔ صفر ۱۳۲۳ھ کو اس عالم فانی سے رحلت کی ؛

مرزا اصغر علی خاں نسیمؔ

نسیمؔ دہلوی ۱۷۹۴ء مطابق ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام نواب آقا علی خاں ہے۔ نسیم دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی اور ضرورت کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ باپ کے انتقال کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہوگئی۔ اور نسیم اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خاں کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں بود و باش اختیار کر لی۔ بعد کو بھائیوں نے عفو تقصیر کرا کے ملنا چاہا مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ اور پھر کبھی دہلی نہیں گئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقے کی حالت میں گزار دی۔ مگر کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ دینداری میں پکّے اور احکام قرآنی پر سختی سے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نولکشور کے پریس میں الف لیلہ کے منظوم ترجمے کی خدمت پر مقرر ہوئے۔ ایک جلد ختم کی تھی کہ پریس کی طرف سے تکمیل کتاب کی جلدی ہوئی۔ جو ان کو ناگوار گزری اور قطع تعلق کر لیا۔

نسیم، مومن دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور لکھنؤ میں رہنے کے باوجود کلام کا رنگ دہلی والوں ہی کا قائم رکھا۔ اور اس پر سختی سے پابند رہے بڑے زود گو تھے۔ مگر مزاج میں وارستگی اس قدر تھی کہ جو کچھ کہتے اس کی نقل اپنے پاس نہ رکھتے۔ اس عادت کی وجہ سے ان کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ جو کچھ باقی بچا۔ ان کے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی نے دیوان کی صورت میں چھپوا دیا تھا۔

نسیمؔ کے کلام میں مومن کا رنگ پایا جاتا ہے۔ طرزِ بیان لطیف اور نازک خیالی کا حامل ہے۔ زبان میں پاکیزگی اور صفائی ہے۔ ان کو تازگی کلام اور صحتِ محاورات کا بہت خیال تھا۔

اکبر

خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی پیدائش ۱۸۴۶ء وفات ۱۹۲۱ء آپ الہ آباد میں جج کے اعلےٰ عہدے پر ممتاز رہے۔ آپ کے کلام کی خاص

خوبی حسنِ ادا اور جدّتِ بیان ہے۔ ظرافت کے پردے میں اخلاقی اور فلسفیانہ رموز کو کامیابی کے ساتھ بیان کرنا آپ ہی کا حصّہ ہے۔ اسی وجہ سے آپ کے کلام کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام تین دیوانوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اور بھی غالباً ایک حصہ اور چھپنا باقی ہے ؛

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

اقبال سیالکوٹ میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے وطن ہی میں حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کیا یہاں انہیں شمس العلما مولوی سیّد میر حسن جیسے جیّد عالم کے فیضِ تربیت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا۔ وہ عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے اور اقبال میں انہوں نے ان زبانوں کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ اسی دوران میں ان کی شاعری کا قدم مقبولیت کی طرف بڑھا۔ وہ بی۔ اے کی تعلیم کے لئے لاہور آ گئے تھے۔ یہاں وہ دہلی اور لکھنؤ کے بعض شعرا سے بھی تعلق میں آئے۔ دوسری طرف انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر آرنلڈ جیسا استاد مل گیا۔ آرنلڈ کی صحبت کا ان پر نمایاں اثر ہوا ہے۔ اُردو نظموں میں نئے فلسفیانہ مضامین کی روشناسی اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اورینٹل کالج لاہور اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر رہے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ یورپ روانہ ہوئے اور ۱۹۰۸ء تک وہیں قیام کیا۔ اسی عرصے میں انہوں نے انگلینڈ اور جرمنی سے علمی اور قانونی ڈگریاں حاصل کیں۔ یورپ کے قیام نے ان کے نقطۂ نگاہ اور خیالات میں جو تبدیلی پیدا کی۔ وہ ان کے کلام میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے ؛

اقبال ایک زبردست شاعر اور مفکّر ہیں۔ ان کی شہرت ہندوستان کی حدود سے نکل کر افغانستان و ایران بلکہ یورپ تک پہنچ گئی ہے، کیمبرج میں پروفیسر نکلسن نے آپ کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اُردو میں "بانگِ درا" کے بعد ان کی جدید تصنیف "بالِ جبریل" ہے۔ اور اس سے بھی تازہ تر "ضربِ کلیم" ہے ؛

انگریزی اور فارسی میں بھی ڈاکٹر صاحب متعدّد تصنیفات کے مالک ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے آپ کی ادبی و علمی خدمات کے صلے میں "نائٹ" کا خطاب ملا ہے۔ ریاست بھوپال پانسو روپے ماہوار کا وظیفہ چند سال دیتی رہی۔

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء - ۱۹۱۷ء)

مولانا اسمٰعیل نے سولہ سال کی عمر میں سررشتۂ تعلیم کی ملازمت شروع کی اور ترقی کرکے فارسی کے ہیڈ مولوی بنا دیئے گئے۔ سہارنپور اور میرٹھ میں اسی عہدے پر ایک مدّت بسر کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں اسکول آگرہ میں تبدیل کر دیئے گئے۔ جہاں باقی مدّت ملازمت بارہ سال ختم کرکے ۱۸۹۹ء میں پنشن لی۔ اور واپس اپنے وطن میرٹھ میں جاکر سکونت اختیار کر لی۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں سرکار نے انہیں "خان صاحب" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

مولوی صاحب عمدہ نثر نگار ہونے کے علاوہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں ان کی اُردو ریڈریں اور نیچرل نظمیں بہت مشہور ہیں جو نہایت سادہ اور بے تکلّف مگر دلکش طرز میں لکھی گئی ہیں۔ مولینا شبلی کا قول ہے کہ "حالی کے بعد اگر کسی نے سُننے کے قابل کچھ لکھا ہے تو وہ مولوی اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔" ان کا کلیات ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک بڑا حصّہ ان کی تصنیفات کا ابھی تک شائع ہونے کا منتظر ہے۔ جس میں ایک جدید طرز کی قواعدِ اُردو۔ لغت اردو اور تاریخ ادب اُردو قابلِ ذکر ہیں۔

پنڈت برج نرائن چکبست

۱۸۸۲ء میں فیض آباد (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم پائی اور ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں قانونی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور تکمیل کرکے وکالت شروع کر دی۔

چکبست کو سولہ سترہ سال کی عمر سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ جو عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا۔ غزل گوئی سے کم اور قومی و منظری نظموں سے زیادہ

شغف تھا۔ ان کی اکثر ملکی و قومی نظمیں قبول عام حاصل کر چکی ہیں ؛

۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو جب کہ ایک مقدمے کی پیروی کے لئے رائے بریلی گئے ہوئے تھے یکایک فالج کا ان پر حملہ ہؤا اور زبان بند ہو گئی۔ ۷ بجے شام کو بریلی کے اسٹیشن پر ہی انتقال کیا۔ لاش لکھنؤ لائی گئی اور وہیں اُن کے اعزہ و اقربا نے آخری رسوم ادا کیں ؛

چکبست کی نظموں کا مجموعہ "صبح وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ چند سال پہلے ایک ماہانہ رسالہ بھی "صبح امید" کے نام سے نکالا جاتا تھا۔ ایک ڈرامہ "کملا" بھی اُن کی یادگار ہے ؛

جوش ملیح آبادی

شبیر حسین خاں نام اور جوش تخلص ہے۔ ان . خاندان کئی پشتوں سے ع چلا آتا ہے۔ ان کے پردادا حسام الدولہ تہوّر جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا کا ۓ اودھ کی صف اوّل میں شمار ہوتا ہے۔ دادا نواب محمد احمد خاں بہادر علقدار کسمنڈی تھے جن کے دیوان کا نام 'مخزن آلام' ہے۔ والد نواب محمد بشیر حمد خاں بہادر رئیس اعظم بھی ایک نہایت خوش گو شاعر تھے جوش صاحب ۱۸۹۶ء یں ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ سیتاپور۔ لکھنؤ۔ علی گڑھ اور آگرے میں تعلیم پائی۔ لیکن والد کی ناوقت وفات کے باعث تعلیم ترک کر کے اپنی آبائی جائداد کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ان کی ناتجربہ کاری اور ابنائے روزگار کی چالاکیوں سے جائداد کا ایک بڑا حصّہ تلف ہو گیا۔ جوش صاحب والد کے انتقال کے چند سال بعد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے دارالترجمے میں بحیثیت ناظر ادبی کام کرنے لگے۔ اب وہاں سے پنشن لے کر دہلی آ گئے ہیں اور ایک بلند پایہ ادبی رسالہ کلیم' کے نام سے نکالنا شروع کیا ہے ؛

جوش صاحب کی شاعری ان کے اپنے تأثرات کا مرقع ہے۔ وہ حسن اور شباب کے نغمے الاپنے میں جو جوش اور سرمستی سے معمور ہیں کمال رکھتے ہیں۔ چند سال پہلے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ 'روح ادب' کے نام سے شائع ہؤا تھا۔ بعد کا کلام پانچ جلدوں میں شعلہ و شبنم۔ نقش و نگار۔ فکر و نشاط

فکر و نشاط۔ جنون و حکمت اور شاعر کی راتیں کے نام سے اب طبع ہوا۔

محروم

منشی تلوک چند صاحب۔ آپ کا وطن مألوف عیسیٰ خیل ضلع میانوالی ہے۔ آپ کی طبیعت میں شاعری کا ملکہ فطری ہے۔ فصاحت اور روانی سوز و گداز آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ پیدائش ۱۸۸۵ء آج کل آپ میانوالی میں ہیڈ ماسٹری کے عہدے پر مامور ہیں ؛

خانصاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری

حفیظ صاحب شاعر مشہور حضرت غلام قادر گرامی کے ارشد تلانده میں سے ہیں۔ انہی کی زیر تربیت انہوں نے غزل سرائی سیکھی۔ ان کی شاعری کا ایک رُخ شباب کی مستانہ ترنگوں کی تصویر کشی اور جوانی کی حسین امنگوں کی چہرہ کشائی ہے۔ جس کو تخیل کی رنگینی الفاظ کی موسیقیت اور حسن بیان کے اوصاف نے اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔ منظر نگاری ایک اور پہلو ہے۔ جس کو شاعر نے اچھوتی اور نادر تشبیہوں سے دلکشی اور دلربائی کا جامہ پہنا دیا ہے ؛

'نغمۂ زار' حفیظ کا اوّلین مجموعۂ کلام ہے۔ جس میں ۱۹۲۵ء تک کی جملہ نظمیں شامل ہیں۔ بعد کے کلام کا مجموعہ سوز و ساز کے نام سے مشہور ہے ؛

مسلمانوں کے قومی زوال و انتشار نے حالی اور اقبال کی طرح حفیظ کے قلم کو مرقع نگاری کے لئے ایک نیا موضوع سپرد کر دیا ہے جسے وہ "شاہنامۂ اسلام" کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ جس کی دو جلدیں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کر چکی ہیں

'ہفت پیکر' حفیظ کا ایک نثری کارنامہ سات طبع زاد افسانوں پر شامل ہے

سرکار عالیہ نے ان کی قدردانی کرتے ہوئے خانصاحب کا خطاب مرحمت فرما دیا ہے ؛

مطبوعہ: انڈین پرنٹنگ ورکس ایم ایم روڈ نئی دہلی

۳۴۲

محمد اشرف فاضل

محمد اشرف فاضلی

محمد اشرف فاضلی

محمد اشرف